بے خبر! تُو جوہرِ آئینہ ایّام ہے
تُو زمانے میں خُدا کا آخری پیغام ہے

حالاتِ حاضرہ کا عکس ایک صاحبِ نظر کے زاویہ سے

آئینہ ایّام

1

پروفیسر مُفتی مُنیب الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور کراچی پاکستان

نام کتاب	آئینۂ ایام (۱)
مصنف	پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
کمپوزنگ	مولانا عبدالمجید چانڈیو، مولانا یاسر رحمان
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
سال اشاعت	باراول 2014ء
	باردوم 2016ء
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	KM16

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350-۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-32212011-32630411۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

ziaulquranpublications@gmail.com

Website:- www.ziaulquran.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

اکتوبر 2013ء میں ''روزنامہ دنیا'' کے گروپ ایڈیٹر جناب نذیر ناجی صاحب کا فون آیا کہ آپ ہمارے اخبار کے لیے ہفتہ میں کم از کم تین دن کالم لکھیں۔ میرے لیے یہ پیشکش انتہائی غیر متوقع تھی، کیونکہ میں کبھی بھی اخباری دنیا کا آدمی نہیں رہا اور نہ ہی مجھے کالم نگاری کا تجربہ تھا۔ میں نے کسی کالم میں لکھا بھی ہے کہ امام احمد رضا قادری قدس سرّہ العزیز سے فرمائش کی گئی کہ آپ ایسی نعت لکھیں، جس میں اردو، ہندی، فارسی اور عربی الغرض، زیادہ سے زیادہ زبانوں کے الفاظ پر مشتمل اَشعار کو موزوں کیا گیا ہو، انہوں نے یہ عدیم النظیر کارنامہ کر دکھایا اور ایک معرکۃ الآراء نعت لکھی جسے قبولِ عام نصیب ہوا۔ اُس نعت کا مقطع یہ ہے:

بس خامۂ خامِ نوائے رضا، نہ یہ طرز میری نہ یہ رنگ میرا

ارشادِ اَحبّاء ناطق تھا، ناچار اس راہ پڑا جانا

سو میں نے جناب ناجی صاحب سے حامی بھر لی اور عرض کی کہ دو کالم ہفتہ وار لکھوں گا، پھر اللہ پر توکل کرتے ہوئے لکھنا شروع کیا اور میں نے اس کے لیے ''زاویۂ نظر'' کا عنوان قائم کیا اور میرا پہلا کالم 10 اکتوبر 2013ء کو شائع ہوا۔

''زاویۂ نظر'' کا عنوان ہی اس اَمر کا غماز ہے کہ کسی بھی مسئلے کے بارے میں آپ کو اپنی رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہے، لیکن اس مسئلے کے بارے میں ایک اندازِ فکر یہ بھی ہے۔ لہٰذا حتمی رائے قائم کرنے سے پہلے اس پر بھی غور فرمالیں، ہوسکتا ہے آپ اپنی رائے پر نظرِ ثانی کے لیے آمادہ ہوجائیں۔ بس اتنی سی بات ہے کہ معرفتِ حق کے لیے اپنی

عصبیتوں اور ذاتی پسند و ناپسند کا اسیر نہیں ہونا چاہیے۔

میری توقع سے بڑھ کر اہلِ نظر اور قارئینِ کرام نے پذیرائی کی۔ مجھے کبھی بھی یہ خوش فہمی نہیں رہی کہ میں اس شعبے کا ماہر ہوں، بس اللہ کی مدد شاملِ حال رہی اور میں اس شاہراہ پر چل پڑا۔ سینئر اور صاحبِ طرز کالم نگار جناب اظہار الحق صاحب نے ای میل کے ذریعے حوصلہ افزائی فرمائی، میں ان کا شکر گزار ہوں۔ جن قارئینِ کرام نے ای میل اور خطوط کے ذریعے اپنے تاثرات سے آگاہ کیا، ان میں زیادہ تر تحسین اور حوصلہ افزائی کرنے والے تھے، لیکن ایک محدود تعداد ناقدین کی بھی ہے۔ میں اُن تمام حضرات کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، انہوں نے مجھے حوصلہ بھی دیا اور ایک طرح سے اَخلاقی مدد بھی کی۔

میرا عملی سیاست سے کبھی بھی تعلق نہیں رہا، نہ ہی میں کسی سیاسی جماعت کا رکن یا عہدے دار رہا ہوں۔ البتہ سیاستِ دوراں کا طالبِ علم ضرور ہوں اور اس کا مشاہدہ بھی کرتا رہتا ہوں۔ لہٰذا کسی کے سیاسی موقف یا انداز سے اتفاق یا اختلاف دلائل اور ترجیحات کی بنیاد پر ہوسکتا ہے اور اسے اِسی حد تک رہنا چاہیے، کسی کی تنقیص یا اہانت ہمارا شعار نہیں ہے۔ دینی و اَخلاقی اَقدار اور سماجی روایات کے اندر رہتے ہوئے اختلافِ رائے ایک مُثبت اور تعمیری قدر ہے اور اس کے لیے ہمیں تحمّل اور بردباری کا رویہ اپنانا چاہیے، دلیل واستدلال سے اتفاق یا اختلاف کا کلچر فروغ پانے سے ''خیرِ کل'' یا ''خیرِ غالب'' کو سمجھنے اور قبول کرنے میں مدد ملتی ہے۔

مخلص احباب کے مشورے پر ان کالموں کا پہلا مجموعہ ''آئینۂ ایام'' کے نام سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، نام ہی سے قاری کو اندازہ ہوجائے گا کہ ان کالموں میں ہمارے دینی، ملی، قومی اور ملکی حالات کا اپنے ''زاویہ نظر'' سے ہم نے عکس پیش کیا ہے اور یہ آئینہ آپ کے سامنے ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی اور زاویے سے مشاہدہ کرنے والے کو اس سے مختلف مَنظر نظر آئے اور وہ اپنے زاویے سے حالات کا عکس پیش کرے اور یہ ہر ایک کا استحقاق ہے، بس اتنی سی بات ہے کہ نیت میں فتور نہیں آنا چاہیے۔ حالات کا جائزہ موضوعی نہیں بلکہ معروضی انداز میں ہو اور آنکھوں پر مفادات کا پردہ نہیں پڑنا چاہیے۔ ہم سب کی

پہچان اسلام اور پاکستان ہے، ہمارے نزدیک اسلام اور پاکستان لازم وملزوم ہیں، ہم میں سے ہر ایک اپنی عمرِ طبعی گزارنے کے بعد آخرت کی منزل کی جانب عازمِ سفر ہو جائے گا۔ پاکستان کو باقی رہنا ہے اور ہماری دعا ہے کہ یہ تا قیامت قائم ودائم رہے اور اب تک جو حسرتیں، نامرادیاں اور ناکامیاں ہمارے حصے میں آئی ہیں، یہ ورثہ آئندہ نسلوں کو منتقل نہ ہو۔ اللہ کرے ہمیں ایسی بالغ نظر اور اُولو العزم قیادت نصیب ہو کہ ہمارا وطن اس پستی سے نکل کر اقوامِ عالَم کے درمیان مقامِ افتخار پر فائز ہو جائے۔

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

آپ سب کی نگاہِ التفات کا متمنی

منیب الرحمٰن

10اپریل2015ء

فہرس

اکتوبر2013ء

قربانی

اصل عربی لفظ ''قُربان'' ہے جس کے معنی ہیں: اللہ تعالیٰ کے تقرب کے لیے عبادت کی نیت سے اس کی بارگاہ میں کوئی جانی یا مالی نذر اور صدقہ پیش کرنا۔ اس لفظ کو ہم نے اردو میں بدل کر ''قربانی'' بنادیا، جیسے عربی کے لفظ ''حَاج'' کو ہم نے اردو میں ''حاجی'' بنادیا۔ بطورِ خاص دس تا بارہ ذوالحجہ (یعنی عیدالاضحیٰ کے دنوں میں) مسلمان حضرات ابراہیم واسماعیل وسیدنا محمد رسول اللہ علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنت کے طور پر جانور کی جو قربانی پیش کرتے ہیں، اسے قرآن وحدیث کی اصطلاح میں ''نُسک، اُضحیہ اور ضَحِیّہ'' کہا جاتا ہے۔

ہر دور میں اہلِ دانش یہ کہتے رہے ہیں کہ تین دنوں میں اتنی بڑی تعداد میں قربانی کے جانوروں کا ذبح کیا جانا ایک غیر دانش مندانہ اور غیر اقتصادی عمل ہے اور وسائل کا ضیاع ہے۔ ایک مشورہ یہ بھی دیا جاتا ہے کہ قربانی پر خرچ ہونے والے پیسے کو انسانی فلاح کے کاموں پر خرچ کردیا جائے۔ یہ سوچ عقلیت (Intellectuality) پر مبنی ہے، جو ہر چیز کو مادّی نفع ونقصان کے معیار پر جانچتی ہے اور اسی پر کسی چیز کے رَدّ وقبول کا فیصلہ صادر کرتی ہے، جبکہ قربانی ایک اَمرِ تعبُّدی ہے اور اس کا مدار معبودِ مطلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی ہوئی اُس ہدایت پر ہے، جو اس کے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہم تک پہنچی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قربانی کے دنوں میں بنی آدم کا کوئی بھی نیک عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں (عبادت کی نیت سے حلال جانور کا) خون بہانے سے زیادہ محبوب نہیں ہے اور قیامت کے دن قربانی کا

یہ جانور اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں سمیت (یعنی پورے وجود کے ساتھ) حاضر ہوگا اور (قربانی کے جانور کا) خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حضور قبولیت کے درجے کو پالیتا ہے، (سو، اے اہلِ ایمان!) خوش دلی سے قربانی کیا کرو۔ (سنن ترمذی: 1493)"۔

تاہم اگر محض مادّی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ قربانی کے جانور کا گوشت اور کھال رُل رہی ہو اور کوئی اس کا طلب گار نہ ہو، بعض مقامات پر تو قربانی کی کھال بھی طاقت کے بل پر حاصل کرنے کا رواج ہے، یہاں تک کہ قربانی کے جانوروں کی چربی، اوجھڑیاں، آنتیں، سری اور مختلف اجزاء مختلف لوگوں کے روزگار کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ جو لوگ قربانی نہیں کرتے انہوں نے قربانی کے مساوی رقم نکال کر کسی فلاحی ادارے کو دے دی ہو۔ قرآن مجید میں بھی اسی روحِ قربانی کو بیان کیا گیا ہے:

(۱) "اُن (قربانی کے جانوروں) کے خون اور ان کے گوشت اللہ کے پاس ہرگز نہیں پہنچتے، لیکن تمہارا تقویٰ اس کے پاس پہنچتا ہے (جو اِس فعلِ قربانی کے پیچھے کارفرما ہوتا ہے)۔ (الحج: 37)

(۲) "(اے رسول!) کہہ دیجیے کہ بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور موت سب اللہ ہی کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا ربّ ہے"۔ (الانعام: 162)

(۳) (اے رسول!) کہہ دیجیے، بے شک میری نماز، میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور مجھے اسی (پیغامِ توحید کو پہنچانے) کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔ (انعام: 62-161)

قربانی کا مقصد گوشت پوست کا حصول نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کی اُمتیں جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی نذر یا صدقہ یا قربانی پیش کرتیں، تو اسے کھلے میدان میں رکھ دیا جاتا اور آسمان سے آگ آتی اور اسے جلا ڈالتی اور یہ اُس کی قبولیت کی دلیل ہوتی۔ چنانچہ قرآن مجید میں یہود کے رسول اللہ ﷺ سے مطالبہ کا ذکر ان کلمات میں ارشاد ہوا:

"جن لوگوں نے یہ کہا کہ اللہ نے ہمیں حکم فرمایا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں

تاوقتیکہ وہ ہمارے سامنے (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) ایسی قربانی پیش کرے، جسے (آسمانی) آگ کھا جائے، (اے رسول!) کہہ دیجیے کہ مجھ سے پہلے تمہارے پاس کئی رسول روشن نشانیاں لے کر آئے اور (خاص طور پر) یہ نشانی بھی جس کا تم نے (مجھ سے) مطالبہ کیا ہے، تو اگر تم (اس مطالبے میں) سچے ہو تو تم نے (یعنی تمہارے آباء واجداد) ان رسولوں کو کیوں شہید کیا؟''۔ (آل عمران:183)

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس مطالبے کو محض ہٹ دھرمی اور حجت بازی سے تعبیر فرمایا اور ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی بیان کیا کہ ماضی میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جو نذر، صدقہ یا قربانی پیش کی جاتی تھی، آسمان سے آگ آتی اور اسے جلا ڈالتی اور یہ اُس کی قبولیت کی دلیل ہوتی تھی۔

قربانی کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود انسان کی تاریخ، چنانچہ سورۂ مائدہ آیت نمبر:27 میں آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کی جانب سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قربانی پیش کرنے اور ایک کی قربانی کے قبول ہونے اور دوسرے کی قربانی کے رَدّ ہونے کا ذکر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ قبولیت کی علامت یہی تھی کہ آسمان سے آگ آتی اور اسے جلا ڈالتی، اس طرح نتیجہ فوری نکل آتا اور جس کی قربانی رَدّ ہوتی وہ سرِ عام رسوا ہو جاتا۔ حدیث پاک میں ہے کہ ماضی کی اُمتوں کے لیے مالِ غنیمت سے فائدہ اٹھانا بھی حلال نہیں تھا اور غنیمت کے مال کو بھی کھلے میدان میں رکھ دیا جاتا اور آسمان سے آگ نازل ہوتی اور اسے جلا دیتی، یہ اس امر کی نشاندہی ہوتی کہ وہ مال اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہو گیا۔ (صحیح مسلم:4050)

امام مسلم نے اس حدیث کے باب کا عنوان یہ قائم کیا ہے: ''اس اُمت کے لیے مالِ غنیمت کا خاص طور پر حلال ہونا''۔ اللہ تعالیٰ کا اس امت پر خصوصی کرم ہے کہ غنیمت اور قربانی کے اموال سے فائدہ اٹھانا اس کے لیے حلال کر دیا اور پردہ پوشی فرما کر سرعام رسوا ہونے سے بھی بچا لیا، ورنہ کون جانتا ہے کہ کسی کی پانچ ہزار روپے کی قربانی قبول ہو جاتی ہو اور پچیس لاکھ روپے والے کی رَدّ ہو جاتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیگر

انبیائے کرام (علیہم السلام) پر اپنی فضیلت کی جو چھ وجوہ بیان فرمائیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ: ”میرے لیے مالِ غنیمت کو حلال کردیا گیا، جو کسی بھی نبی (کی امت) کے لیے مجھ سے پہلے حلال نہیں تھا۔ (صحیح مسلم:1166)

اگرچہ فقہی اعتبار سے قربانی کا جانور جتنا قیمتی ہوگا، اُسی کے مطابق اجر بھی عطا ہوگا۔ لیکن آج کل قربانی میں نام ونمود کا عنصر سرایت کر گیا ہے۔ اور قربانی کے انتہائی قیمتی جانوروں کی الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا پر تشہیر ہوتی ہے اور اس سے بعض لوگ اپنی شان وشوکت کا اظہار کرتے ہیں، یہ شِعار روحِ قربانی اور جذبہ عبادت کے منافی ہے۔ لہٰذا اعتدال سے کام لینا چاہیے، کیونکہ آج کل غربت اور امارت کا تفاوت بڑھتا جارہا ہے اور اس کے نتیجے میں معاشی اعتبار سے ہمارے معاشرے کے نچلے طبقات میں مایوسی کے جذبات فروغ پا رہے ہیں۔ اور اگر ہمارے ریاستی اور حکومتی نظام نے اس پر توجہ نہ دی تو کوئی بھی مُہم جو عوام میں اشتعال پیدا کر کے نفرت کے جذبات کو ابھار سکتا ہے، جبکہ ہم پہلے ہی داخلی اعتبار سے عدمِ استحکام، فساد وتخریب، قتل وغارت اور دہشت گردی کا شکار ہیں، علامہ اقبال نے کہا تھا:

الحذر! اے چیرہ دستاں الحذر!
سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

ہمارا قومی مزاج یہ ہے کہ صورتِ عبادت کو تو اختیار کر لیتے ہیں، لیکن روحِ عبادت اور حقیقتِ عبادت سے کوسوں دُور رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری عبادات کے روحانی، سیاسی اور سماجی اثرات معاشرے میں رونما نہیں ہوتے۔ ہم نماز کے فضائل بیان کرتے ہوئے، دعویٰ کرتے ہیں کہ نماز نظم وضبط سکھاتی ہے، لیکن آج ہم ایک منظم قوم کے بجائے منتشر ہجوم میں تبدیل ہوچکے ہیں۔ افراد کے مابین، افراد اور حکومت کے مابین حقوق وفرائض کا جو متوازن اور ذمے دارانہ نظام ہونا چاہیے، وہ ہم میں مفقود ہے، حتیٰ کہ تخریب وفساد کے ماحول سے نکلنے کے لیے بھی ہم یک سُو نہیں ہیں۔ ہماری حکومتی پالیسیاں

حکمت وبصیرت اور تدبیر سے عاری نظر آتی ہیں، ہم داخلی اور خارجی خطرات کا جرأت واستقامت کے ساتھ مقابلہ کرنے کے بجائے خوف کے عالم میں ہنگامی پالیسیاں ترتیب دیتے ہیں اور کوئی بھی خوفزدہ قوم کسی بھی داخلی یا خارجی محاذ پر فتح یاب اور سرخ رُو نہیں ہو سکتی۔

حالات ہم سے مختلف سطحوں پر قربانیوں اور ایثار کا تقاضا کرتے ہیں، لیکن ہم نوشتۂ دیوار پڑھنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکے ہیں۔ ہم اقتدار سے باہر ہوں تو ہماری سوچ کا انداز کچھ اور ہوتا ہے اور اقتدار کے ''بیت الحجن'' میں داخل ہو جائیں تو سوچ کے انداز بدل جاتے ہیں۔ پھر ہم حقائق وواقعات کو اقتدار کی عینک پہن کر دیکھتے اور سمجھتے ہیں اور حالت یہ ہو جاتی ہے کہ:

پہلے جو نا خوب تھا، وہی خوب ہُوا، خوب ہُوا

10 اکتوبر 2013ء

ضمیر کی موت

اللہ تعالیٰ نے حق و باطل، صواب و خطا اور خیر و شر میں تمیز کی ایک نفسانی صلاحیت اور مَلکہ (Natural Endowment) انسان کو عطا کیا ہے، جسے قرآن نے ''نفسِ لوّامہ'' سے تعبیر کیا ہے، اردو میں ہم اسے ''ضمیر'' اور انگریزی میں اسے ''Conscience'' کہتے ہیں۔ انسان کا یہ مَلکہ یا نفسانی جوہر یا باطنی استعداد یعنی ضمیر اللہ تعالیٰ کو اتنا محبوب ہے کہ سورۂ ''الشمس'' میں ذاتِ باری تعالیٰ نے تمہید کے طور پر نو قسمیں ذکر فرمانے کے بعد فرمایا: ''اور نفس کی قسم اور اُس (ذات) کی قسم جس نے اس کو درست بنایا اور اُسے اس کی بدکاری اور پرہیزگاری کا شعور ودیعت کر دیا''۔

اسی طرح سورۂ ''القیامہ'' میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے حق اور سچ ہونے کی قسم ذکر فرمانے کے بعد فرمایا: ''اور میں اُس نفسِ انسانی کی قسم فرماتا ہوں جو (اپنی غلطی پر) اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے''۔

حدیثِ مبارک میں ہے: رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ ایمان کیا ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تمہاری برائی تمہیں بری لگے اور تمہاری نیکی تمہیں اچھی لگے، تو (سمجھو کہ) تم مومن ہو۔ (مسند امام احمد:22159)

یعنی انسان کا ضمیر اس کے وجود میں ایمان کی کسوٹی ہے۔ اگر نفسِ انسانی کسی ایمانی، عملی، اخلاقی اور روحانی مرض میں مبتلا نہیں ہے تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ضمیر زندہ ہے۔ اور اس کی نشانی یہ ہے کہ وہ برائی پر ٹوکے گا، روکے گا اور بدی کے راستے پر چلنے والے کے لیے

پاؤں کی زنجیر بن جائے گا، نیکی سے اسے قلبی سُرور ملے گا اور بدی اسے کھٹکتی رہے گی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید فرمایا:

''نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تجھے اس کے بارے میں تردُّد ہو اور تو اس بات کو ناپسند کرے کہ لوگوں کو اس کا پتا چل جائے''۔

الغرض ضمیر انسان کے باطن میں ایک ایسا چوکیدار ہے جو برا خیال آنے پر یا برائی کی طرف قدم بڑھانے پر انسان کو روکتا ٹوکتا ہے، متنبہ کرتا ہے اور وارننگ دیتا ہے، لیکن اگر نفسِ انسانی مریض ہو جائے تو وہ اس صلاحیت سے نہ صرف محروم ہو جاتا ہے بلکہ بعض اوقات وہ برائی پر اتراتا ہے اور اسے اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتا ہے، جیسا کہ قومِ لوط سے پوچھا گیا:

''کیا تم مردوں سے (غیر فطری طریقے سے) اپنی خواہشِ نفس کو پورا کرتے ہو اور ڈاکے ڈالتے ہو اور اپنی عام مجلسوں میں بے حیائی کا کام کرتے ہو، تو ان کی قوم کا جواب سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ اگر آپ سچے (نبی) ہیں تو ہم پر اللہ کا عذاب لے آئیں''۔

(العنکبوت:29)

یعنی انسان کی سرکشی اور خالق سے بغاوت کا یہ آخری درجہ ہے کہ برائی کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھے، یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان کا ضمیر مر جائے۔ ضمیر کے مریض ہونے کو قرآن پاک نے اِن الفاظ میں بیان فرمایا: ''اُن (منافقین) کے دلوں میں بیماری ہے، (اس کے وبال کے طور پر) اللہ تعالیٰ نے اُن کے مرض میں اضافہ کر دیا ہے''۔ (البقرہ:10)

اور ضمیر کی موت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا: ''تو وہ (حق کو نہ قبول کرنے میں) پتھروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت، کیونکہ بعض پتھر ضرور ایسے ہیں جن سے دریا پھوٹ پڑتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں''۔ (البقرہ:74)

یعنی سنگ دل انسانوں کے دلوں کے سوتے بند ہو جاتے ہیں، حق ان کے اندر داخل نہیں ہوتا، جیسے پتھریلی چٹان پر سے بارش کا پانی بہہ کر چلا جاتا ہے اور اس کے اندر جذب

نہیں ہوتا۔ اسی طرح قرآن وسنت کی تجلّیات نور اور ہدایت کی بارش ان سنگ دل انسانوں کے دلوں میں جذب نہیں ہوتی۔ آج کل ہم آئے دن ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعے ایسی خبریں سنتے رہتے ہیں کہ دہشت گردی، تخریب کاری قتل وغارت اور فساد کے واقعات کی ذمے داری قبول کی جاتی ہے اور اس پر اُن کا نفس مطمئن ہوتا ہے، کوئی رنج وملال یا ندامت نہیں ہوتی۔ جس طرح ایک فرد کا ضمیر ہوتا ہے، اسی طرح معاشرے کا اجتماعی ضمیر (Collective Conscience) بھی ہوتا ہے اور معاشرہ کے اجتماعی ضمیر کے ترجمان اُس معاشرے کے اہلِ علم ودانش اور اہلِ فکر ونظر ہوتے ہیں۔

آج ایسا لگتا ہے کہ ہمارا اجتماعی ضمیر بھی مر چکا ہے یا مختلف طرح کے جبر تلے دبا ہوا ہے اور کراہ رہا ہے۔ تخریب وفساد کے بعض ایسے واقعات جن کی اسلامی تعلیمات، آئین وقانون اور اخلاقی اقدار کی رُو سے ادنیٰ درجے میں بھی کوئی قابلِ قبول توجیہ پیش نہیں کی جاسکتی، ہم میں سے کچھ حضرات بعض اوقات ان کارروائیوں کی مذمت تو کر دیتے ہیں، لیکن جو لوگ ان کارروائیوں کے مرتکب ہوتے ہیں، ان کا حوالہ دینے سے اجتناب کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے معاشرے میں بے لاگ اور پورا حق اور سچ بولنا مشکل ہے، یا تو مختلف طرح کی حکمتیں اور مصلحتیں رکاوٹ بن جاتی ہیں اور یا ہم ایک نادیدہ خوف کا شکار ہیں۔ سیاست دان تو ہمیشہ اپنے ذاتی اور گروہی مفادات کے اسیر ہوتے ہیں اور منصبِ اقتدار تک پہنچنا اور پھر ہر قیمت پر اقتدار کو قائم رکھنا ان کی ترجیحِ اوّل ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے کے اہلِ فکر ونظر بھی نظریاتی طور پر منقسم ہیں اور دو انتہاؤں پر ہیں اور ہماری حکومتی پالیسیاں بھی ابہام کا شکار ہیں۔ ہم دفع الوقتی اور سر پر آئی بلا کو ٹالنے کو ترجیح دیتے ہیں، خطرات ومشکلات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُن کا سامنا کرنے کا حوصلہ ہم میں نہیں رہا۔ دہشت گردی کا سنگین ترین مسئلہ جو ایک عشرے سے زیادہ پر محیط ہے، اور اس نے ہماری چولیں ہلا ڈالی ہیں، اس مسئلے کی سنگینی کا عالم یہ ہے کہ ہماری مسلح افواج نے قومی سلامتی کا جو تازہ ترین اساسی اصول (Doctrine) بیان کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ہماری

قومی سلامتی کو اب اصل خطرہ ازلی دشمن ہندوستان سے بھی بڑھ کر داخلی تخریب وفساد اور بے امنی سے ہے۔ ہم روایتی دینی لوگ تو اجتہاد کے لیے قرآن وسنت اور ان کی فہم کے لیے ضروری اور معاون علوم کو لازمی قرار دیتے ہیں، لیکن ہمارے عہد کے متجدّدین کہتے کہ اجتہاد اب پارلیمنٹ کے ذریعے ہوگا، کیونکہ پارلیمنٹ ہی عہدِ جدید میں کسی ملک وقوم کی اجتماعی دانش (Colletive Wisdom) کا مرکز ومحور اور حقیقی مُقتدِرہ ہے۔ حال ہی میں ہمارے نظامِ اقتدار (یعنی حزبِ اقتدار واختلاف) کے تمام Stakeholder جمع ہوئے اور چند گھنٹوں میں ایک مُبْہَم یا مُجمَل سی قرارداد کی صورت میں مسئلے کو حل کر دیا۔ Stakeholder کا ترجمہ عربی لغت میں ''اصحابُ المصلحت'' یعنی وہ لوگ جن کی مصلحت یا مفاد کسی چیز سے وابستہ ہے، یا یوں کہہ لیجیے کہ وہ لوگ کہ موجودہ صورتِ حال میں قومی وملکی مفادات کا تحفظ جن کی آئینی وقانونی ذمے داری ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ تمام ذمے داران کم از کم ایک ہفتہ تک میڈیا کی نظروں سے اوجھل ہو کر بیٹھتے، مسئلے کے تمام پہلوؤں کا پوری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ جائزہ لیتے، ہر فیصلے اور اِقدام کے ''مالہٗ وماعلیہ'' یعنی ممکنہ طور پر مرتب ہونے والے مُثبت اور مَنفی نتائج پر تدبُّر وتفکر کرتے اور خطرات کا سدِّ باب کرتے، مذاکرات کا ایجنڈا طے ہوتا، ہم کہاں تک جاسکتے ہیں، ہمارے لیے اِقدام یا اِدبار (یعنی اپنے موقف میں آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے) کی کتنی گنجائش ہے، اسے آج کل مذاکرات میں کچھ لینے اور کچھ دینے کی گنجائش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مذاکرات کا فریقِ ثانی کون ہے اور ان کے جو گروہ مذاکرات اور ان کے نتائج کو قبول نہیں کریں گے، ان سے کیسے نمٹا جائے گا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جس بے نتیجہ اور تباہ کُن جنگ سے بچنے کے لیے ہم مذاکرات کی راہ کو اپنا رہے ہیں، بالآخر وہی ہمارا مقدر بن جائے، یعنی اس میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ یہ بہت مشکل مرحلہ ہے۔ اس وقت تو جو کچھ ہو رہا ہے، عالَمِ غیب میں ہو رہا ہے، عالَمِ شُہود (یعنی حاضر وموجود صورتِ حال) میں کسی کو کچھ پتا نہیں ہے۔ امن کبھی کسی کو خیرات اور سوغات میں نہیں ملتا، امن ان کو نصیب ہوتا ہے جو عزیمت واستقامت

کے حامل ہوں، خلق کا خوف دل سے نکالیں اور خالق کے خوف کو دل میں جگہ دیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''پس تم لوگوں سے مت ڈر، (صرف) مجھ سے ڈرو''۔ (المائدہ:۴۴)

اسی طرح حکومت کا عزم بھی غیر متزلزل نظر نہیں آتا۔ جب تک عوام کو حکمرانوں کے رویّے، اِقدامات اور حکمتِ عملی سے یقین اور اعتماد پوری قوت کے ساتھ جھلکتا ہوا بلکہ چھلکتا ہوا نظر نہیں آئے گا، قوم بے یقینی اور تذبذب کا شکار رہے گی۔ رسول اللہ ﷺ کی سنتِ جلیلہ بھی یہی ہے کہ جب آپ انتقام پر قادر ہوئے اور مخالفین آپ کے رحم و کرم پر تھے، تو آپ نے تاریخِ انسانی میں عفوِ عام کا بے مثال نمونہ پیش کیا اور امن کی سوغات تقسیم کی۔ بلاشبہ آج ہماری دینی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کو رواں دواں رکھنے کے لیے امن کی اشد ضرورت ہے، اس نقطہ پر کسی کو اختلاف نہیں ہے، لیکن یہ منزلِ مراد اور گوہرِ مقصود کیسے حاصل ہو؟ اس کے بارے میں اہلِ نظر منقسم ہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ تمام طبقات کو اعتماد میں لیا جائے، قوم میں ایک اجماعی سوچ پیدا کی جائے، کیونکہ یہ ملک ہم سب کا ہے، اسی سے ہماری پہچان ہے اور اس کی بقا اور استحکام پر ہم سب اور ہماری آنے والی نسلوں کی فلاح کا مدار ہے۔

13 اکتوبر 2013ء

1424ھ سال پہلے

یوں تو حج، قریشِ مکہ میں سنتِ ابراہیمی کے طور پر شروع سے چلا آرہا تھا، لیکن اس کی رُوح مسخ کردی گئی تھی، اس میں شرک و بدعت اور خرافات شامل کردی گئی تھیں۔ منیٰ اور عرفات کے اجتماع کو میلے ٹھیلے میں تبدیل کردیا گیا تھا، ان مقامات پر سالانہ میلے لگتے تھے اور بازار سجتے تھے، ''ذُوالمجنّہ'' اور ''عُکاظ'' کے میلے مشہور ہیں۔ آج کل تشہیر کے لیے میڈیا کا استعمال ہوتا ہے، اس دور میں میلوں کے مقاصد میں سے ایک یہ بھی تھا۔ ان میلوں میں قریش کے مختلف قبائل کے شعراء اپنے اپنے قبیلے کے تفاخر اور شان کے اظہار کے لیے اپنا اپنا کلام پیش کرتے تھے۔ صفا اور مروہ پر ''اُساف'' اور ''نائلہ'' نامی بت رکھے ہوئے تھے۔ قربانی کے جانوروں کا گوشت اور خون ان کی نذر کیا جاتا تھا اور ان بتوں پر مَل دیا جاتا یا ان بتوں کے تقرب کے لیے نصب کیے ہوئے پتھروں پر۔ اس مقام کو قرآنِ مجید میں ''نُصُب'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بَحِیرَہ، سائبہ، وَصیلہ اور حام مختلف قسم کے جانور تھے، جنہیں بتوں کی نذر کردیا جاتا اور آزاد چھوڑ دیا جاتا۔ بیت اللہ جسے اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کے لیے ایک عالمی مرکز کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا، اس کے اندر 360 بت سجا دیے گئے تھے۔ ننگے بدن بیت اللہ کا طواف کیا جاتا اور دلیل یہ پیش کی جاتی کہ جس لباس کے ساتھ ہم گناہ کرتے ہیں، اسے پہن کر طواف کرنا بیت اللہ کی عظمت اور ادب کے منافی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نو ہجری کو اعلان کرایا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور بیت اللہ کا ننگے بدن طواف نہیں ہوگا''۔ (بخاری:1622)

طواف کرتے ہوئے سیٹیاں اور تالیاں بجائی جاتیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اور بیت اللہ کے نزدیک ان کی نماز اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے''۔ (انفال:35)

ختم المرسلین، رحمۃ للعلمین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے اعلانِ نبوت کے بعد نو ہجری کو ''حجۃ الاسلام'' کی فرضیت کا اعلان ہوا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا:

''اے لوگو! تم پر حج فرض کر دیا گیا ہے۔ پس حج کیا کرو، ایک شخص (اقرع بن حابس) نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! کیا حج ہر سال فرض ہے؟، آپ ﷺ خاموش رہے، سائل نے تین بار اپنا سوال دہرایا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر میں (تمہارے سوال کے جواب میں) ہاں کہہ دیتا، تو حج ہر سال فرض ہو جاتا اور تم ادا نہ کر پاتے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: جس بات کو میں چھوڑ دوں تم بھی چھوڑ دیا کرو، تم سے پہلی امتیں کثرتِ سوال کی بنا پر ہلاک ہوئیں، پس جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق اسے ادا کرو اور جس سے روکوں اس سے رک جاؤ''۔ (مسلم:3255)

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''بے شک سب سے پہلا گھر جو (اللہ کی عبادت کی خاطر) لوگوں کے لیے بنایا گیا، وہی ہے جو بکہ میں ہے، برکت والا اور تمام جہانوں کے لیے ہدایت کا سبب ہے، اس میں واضح نشانیاں، مقامِ ابراہیم ہے اور جو اس میں داخل ہوا، وہ بے خوف ہو گیا اور اُن لوگوں کے لیے جو اس کے راستے (یعنی مصارفِ سفر) کی استطاعت رکھتے ہیں، ان پر اللہ کی طرف سے بیت اللہ کا حج فرض ہے۔ (آل عمران:97)

آج سے 1424 سال پہلے 10ھ کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ مبارکہ کا پہلا اور آخری ''حجۃ الاسلام'' ادا فرمایا۔ اس موقع پر آپ اپنی ناقہ مبارکہ ''قصواء'' پر سوار ہوئے اور تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا، جو ''خطبۂ حجۃ الوداع'' کے نام سے تاریخ و سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ یہ خطبۂ مبارکہ حدیث کی کتابوں میں باقاعدہ ترتیب کے ساتھ کسی

ایک جگہ مذکور نہیں ہے، بلکہ اس کے مختلف حصے حدیث کی مختلف کتابوں میں روایت کیے گئے ہیں۔ اس حج کو ''حجۃ الوداع'' اسی لیے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبے میں ایسے اشارات دیے تھے کہ گویا یہ آپ کی آخری اور حتمی ہدایات اور وصایا ہیں تاکہ لوگ انہیں محفوظ کرلیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

اے لوگو! میری بات کو غور سے سنو اور سمجھو، شاید اس سال کے بعد اس مقام پر میری تم سے ملاقات نہ ہو، شاید تم مجھے دوبارہ اس مقام پر نہ دیکھو، مجھ سے ارکانِ حج سیکھ لو، شاید اس کے بعد میں حج نہ کر پاؤں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص کو ہمیشہ تر و تازہ رکھے جو میری بات کو سنے اور دوسروں تک پہنچا دے کیوں کہ جس تک بات پہنچائی جاتی ہے، بعض اوقات وہ براہِ راست سننے والے سے بھی زیادہ اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس سے زیادہ فقیہ ہوتا ہے، یعنی دین اور اَحکامِ الٰہی کی حکمتوں کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھتا ہے، پھر آپ ﷺ نے صراحت کے ساتھ فرمایا: جو لوگ حاضر ہیں، میرا پیغام اُن تک پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ یہ دراصل اِس بات کا اعلان تھا کہ اب کوئی اور نبی نہیں آئے گا، اس لیے دعوتِ دین، ابلاغِ دین اور دینی امانتوں کی حفاظت کرنا اور سلسلہ بسلسلہ آخر تک پہنچانا، اس امت کے علمائے حق کی ذمے داری ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے تین بار یہ کلمات فرمائے: اے لوگو! کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا آخری پیغامِ ہدایت تم لوگوں کو بلاکم وکاست پہنچا دیا ہے؟ سب نے یک زبان ہوکر اقرار کیا: ''جی ہاں''، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: تم سے (آخرت میں) میرے بارے میں پوچھا جائے گا۔ تو تم کیا جواب دو گے؟، سب نے عرض کی: ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے دین کی امانت اور حق کے پیغام کو ہم تک پہنچا دیا ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی انگشتِ شہادت بلند کرکے نیچے لاتے ہوئے تین بار فرمایا: اے اللہ! تو گواہ رہنا (کہ تیرے یہ بندے اقرار کررہے ہیں کہ میں نے دعوتِ حق کا فرض ٹھیک ادا کردیا ہے)۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ خطبہ ایک ریاست کے سربراہ کا پالیسی بیان تھا، فرق یہ ہے کہ

حکمران اپنے بیانات میں اپنے عہد کے تقاضوں، اپنے شخصی، جماعتی، گروہی اور ریاستی مفادات کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، ان کے پیشِ نظر عارضی اور وقتی مفادات کا حصول ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے رسولِ مکرم ﷺ کی ذہنی ساخت (Mind Set)، نیت، نُطق اور کردار (الغرض ظاہر و باطن) ہر چیز معصوم تھی اور آپ ﷺ کے فکر و عمل کا سرچشمہ وحیِ ربانی تھی، اس لیے اس میں کسی خطا یا لغزش کا کوئی امکان نہیں تھا۔ آپ ﷺ کا پیغام دائمی تھا، ابدی تھا، قیامت تک کے لیے تھا، زمان و مکان اور ذاتی اور جماعتی مفادات سے بالاتر تھا، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے تھا اور انسانیت کے دائمی مفاد کے لیے تھا۔

آپ ﷺ نے سب سے پہلے انسانی مساوات کی بات کی کہ پوری نوعِ انسانی ایک باپ آدم علیہ السلام کی اولاد ہے، کسی کو رنگ و نسل کی بنیاد پر دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک فضیلت کا مدار تقویٰ اور کردار پر ہے۔ آپ ﷺ نے عہدِ جاہلیت کے سودی نظام اور خونی انتقام کے نسل در نسل جاری رہنے والے سلسلے کے خاتمے کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا: سنو! زمانہ جاہلیت کی ہر باطل روایت اور رسم کے خاتمے کا اعلان کرتا ہوں، میں حجاج کی میزبانی اور بیت اللہ کی تولیت کے سوا جاہلیت کے تمام خونی انتقام، مالی مطالبات (جو باطل پر مبنی ہوں) اور نسلی و قبائلی تفاخر کو قیامت تک کے لیے اپنے قدموں تلے پامال کر رہا ہوں، اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے ایک فرد ابنِ ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کے خون کو معاف کرتا ہوں اور میں عہدِ جاہلیت کے واجب الاداہر سودی مطالبے کو آج سے ختم کرتا ہوں اور سب سے اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کے سود کے خاتمے کا اعلان کرتا ہوں۔ آپ نے سب سے پہلے اپنی ذات کو اُسوہ، قدوہ اور رول ماڈل بنادیا۔ یعنی آج کے دور کی طرح نہیں کہ ریاست و حکومت کے سربراہان کو استثناء (Immunity) مل جائے اور عام آدمی پر قانون لاگو ہو جائے۔ آپ ﷺ نے کسی کی جان، مال اور آبرو کی حرمت کی پامالی کو حرام قرار دیا اور ان کی حرمت کو یومِ عرفہ، ماہِ ذوالحجہ اور شہرِ مکہ کی حرمت سے تشبیہ دی۔ یہی وہ حُرمتیں ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی

ضمانتیں اور تحفظات ہیں جو آج شب و روز ہمارے وطنِ عزیز میں پامال ہو رہی ہیں۔
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کے ایک دوسرے پر عمومی حقوق کی پاس داری، امانت اور قرض کی ادائیگی اور زیر دست طبقات اور خواتین کے حقوق کی پاس داری کا نہایت تاکید کے ساتھ حکم فرمایا۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نسب کی حفاظت کا حکم فرمایا۔ اسلام کے بنیادی عقائد، ارکان اور عبادات کی ادائیگی کی تاکید فرمائی، یہ بھی فرمایا کہ تہائی مال تک وصیت جائز ہے، لیکن کسی وارث کے حق میں وصیت کر کے اسلام کے قانونِ وراثت کو متاثر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

حج ہم آج بھی ادا کر رہے ہیں، وقوفِ عرفہ بھی ہے، وقوفِ مزدلفہ بھی ہے، وقوفِ منیٰ بھی ہے، قربانی، رمیِ جمرات، طواف بیت اللہ اور صفا و مروہ کے درمیان سعی بھی ہے، صورتِ عبادت تو ہے، لیکن روحِ عبادت خال خال ہی ملے گی۔ کیا آج حج کا خطبہ پوری امت کے لیے پالیسی اسٹیٹمنٹ ہے؟۔ کیا اس میں امت کے تمام مسائل کا بے لاگ تجزیہ اور درست سمت کا تعین ہے؟۔ کیا مسلم حکمرانوں کی بے اعتدالیوں پر کوئی گرفت ہے؟۔ مصر، شام، عراق، افغانستان، فلسطین، کشمیر اور دنیا کے دیگر خطوں میں امت کو جو مسائل و مصائب درپیش ہیں، ان کا کوئی حل پیش کیا جاتا ہے اور مسلم حکمران اس ایجنڈے کے پابند (Committed) ہوتے ہیں؟...... ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔ ہمارے ہاں حج، فضائلِ حج اور برکات و ثمراتِ حج پر مقابلۂ تقاریر یا مقابلۂ مضمون نویسی ہو تو ایک سے ایک حیران کن اور روحانی سرور عطا کرنے والا شاہکار ملے گا، لیکن ہماری بدنصیبی کہ انفرادی و اجتماعی زندگی میں ہمارا اسلام تطبیقی (Applied) اور عملی نہیں رہا۔ اسی لیے کسی بزرگ نے اپنے ایک عقیدت مند سے پوچھا کہ جب تم نے قربانی دی تو اپنے نفس کی باطل خواہشات پر بھی چھری چلائی؟ جب تم نے شیطان کو کنکریاں ماریں، تو تمہارے باطن میں "نفسِ اَمّارہ" کی صورت میں جو شیطان اپنا مورچہ بنائے بیٹھا ہے، کیا تم نے اسے بھی سنگسار کیا؟۔ اس نے جواب دیا: نہیں۔ بزرگ نے فرمایا کہ تمہاری قربانی اور تمہارا حج ادا نہ ہوا۔

کم و بیش یہی صورتِ حال ہم سب کی ہے کہ اسلام کے فضائل و برکات تو ہماری زبانوں پر ازبر ہیں، لیکن ہم ان کو قلب و روح میں جذب کر کے کردار کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اسی لیے آج پاکستان میں دینِ رحمت کے ماننے والے اور نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر نچھاور ہونے والے مسلمانوں کے ملک میں کسی کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہیں ہے، کسی کے لیے امن و سلامتی کی ضمانت نہیں ہے، نظمِ اجتماعی میں عدل و مساوات (Social Justice) نہیں ہے اور مسلمان دنیا میں بے توقیر ہیں۔ کاش ہم اس زوال سے نکلنے کے لیے کوئی حکمتِ عملی اور تدبیر اختیار کر سکیں۔

14 اکتوبر 2013ء

مصلحتِ نظام

ہمارے پڑوسی ملک ''جمہوریِ اسلامیِ ایران'' کا دستور، اختیار اور اقتدار کی مختلف سطحوں (Layers) پر مشتمل ہے۔عوام کے براہِ راست ووٹوں سے منتخب اسمبلی کو ''شورائے اسلامی'' کا نام دیا گیا ہے اور قانون سازی کا اختیار'' شورائے اسلامی'' کو حاصل ہے۔لیکن اُس کے اوپر ایک ''شورائے نگہبان'' (Guardian Council) ہے۔یہ بارہ ارکان پر مشتمل ہے،اُن میں سے چھ علمائے مُجتہدین ہیں اور چھ ماہرینِ آئین وقانون۔اِس کونسل کا کام اِس اَمر کی نگرانی کرنا ہے کہ کوئی قانون مذہب اور دستور کے خلاف نہ ہو،لہٰذا جو قانون اِس ادارے کی نظر میں مذہب یا دستور کے خلاف ہے، وہ اُسے نظرِ ثانی کے لیے واپس شورائے اسلامی کے پاس بھیجے گی۔اختلاف حل نہ ہونے کی صورت میں آئین وقانون کی تعبیر اور تشریح کے حوالے سے شورائے نگہبان کی رائے حرفِ آخر ہوگی۔یہی شورائے نگہبان صدر سے لے کر ہر سطح کے انتخابی اُمیدواروں کے چناؤ کے لیے چھلنی اور فلٹر کا کام کرتی ہے۔اِس ادارے کی Clearance کے بغیر کوئی اُمیدوار انتخاب میں حصہ نہیں لے سکتا۔ہمارے دستور کے آرٹیکل 62اور 63 کی طرح اندھا، گونگا اور بہرا تطہیری نظام نہیں ہے۔یہ ایک دانا وبینا اور ناطق تطہیری نظام ہے،جس کی آنکھیں، کان، زبان اور دماغ ٹھیک کام کررہے ہیں۔

ملک کا چیف ایگزیکیٹو یعنی مُنتظمِ اعلیٰ صدر ہوتا ہے،لیکن امریکی صدر کی طرح ایرانی صدر پر بھی تحدید وتوازن (Check & Balance) کا نظام موجود ہے۔ملک کا سپریم لیڈر

''رَہبرِ مُعَظَّم'' ہوتا ہے۔ جو ریاست وحکومت کے روزمرہ معاملات میں دخل انداز نہیں ہوتا، لیکن یہ سب سے طاقتور منصب ہے۔ فقہِ جعفریہ میں بارہویں امام، امامِ مہدی یا امام مُنتظَر یا امامِ غائب نے اپنے ظُہور (Appearance) کے بعد اسلام کو غالب کرنا تھا۔ لیکن امام کے غِیاب اور ظُہور کے درمیان جو زمانۂ فَترت (Meantime) ہے، اُس میں اسلام کیسے نافذ ہو؟۔ انقلابِ ایران کے قائد امام خُمینی نے اس کے لیے ''ولایتِ فقیہ'' کا تصور پیش کیا کہ اِس مدت میں اپنے عہد کا سب سے بڑا مذہبی روحانی لیڈر یعنی ''ولی فقیہ'' قوم کی رہنمائی کرے گا اور اُس کے بارے میں یہ سمجھا جائے گا کہ وہ ''مُلہَم مِنَ الاِمَام'' (Inspired by Imam) ہوگا، یعنی وہ امامِ مُنتظَر کے رُوحانی تصرُّف اور فیض سے قوم کی رہنمائی کرے گا۔ امام خُمینی کے بعد آج کل ''آیت اللہ خامنہ ای'' اِس مَنصب پر فائز ہیں۔

جب ایرانی دستور پر عمل درآمد شروع ہوا تو مختلف مواقع پر اختیار واقتدار کے مراکز میں تَعطُّل (Deadlock) پیدا ہو گیا۔ اِس تَعطُّل کو دور کرنے کے لیے ایک نیا آئینی ادارہ ''مَجمَعِ تَشخیصِ مَصلحتِ نظام'' تشکیل دیا گیا کہ کسی بھی تَعطُّل کی صورت میں اِس ادارے کی رائے حرفِ آخر ہوگی۔ روس یا بعض دیگر ممالک میں اِس مقصد کے لیے معمول کے عدالتی نظام سے الگ ایک آئینی عدالت ہوتی ہے، جو کسی بھی دستوری تعطُّل اور اداروں کے تصادم کو حل کرنے کے لیے حرفِ آخر ہوتی ہے، اِبہام دُور کرتی ہے اور ایسی تعبیر وتشریح کرتی ہے کہ دستور پر عمل درآمد جاری رہے اور ادارے اپنی حدود میں رہیں۔

ہماری پارلیمنٹ نے قومی انتخابات کے لیے قومی وصوبائی اسمبلیوں میں قائدِ ایوان اور قائدِ حزبِ اختلاف کے اِتفاقِ رائے سے ایک عبوری غیر جانبدار نگران وزیرِ اعظم اور وزیرِ اعلیٰ کا تصور پیش کیا تا کہ قومی انتخابات کی شفافیت اور غیر جانبداری شک وشُبہ سے بالاتر ہو اور اس کا اعتبار اور ساکھ قائم رہے۔ لیکن نگراں سیٹ اَپ بنانے کے موقع پر ڈیڈ لاک پیدا ہو گیا اور یہی ڈیڈ لاک ''نیب'' کا چیرمین مقرر کرنے پر ہوا اور پھر لیپا پوتی سے کام لیا

گیا۔ غلام اسحاق خان جب نگراں صدر بنے، تو اُن سے کہا گیا کہ آئینی تقاضا پورا کرنے کے لیے آپ نے نگراں وزیرِ اعظم مقرر کیوں نہیں کیا؟۔ اُنہوں نے جواب میں پشتو کی ایک کہاوت سنائی کہ:

''کیا (معاذ اللہ!) اللہ تعالیٰ ایسا پتھر پیدا کر سکتا ہے، جسے وہ خود نہ اُٹھا سکے''

یعنی جسے میں وزیرِ اعظم مقرر کروں گا، وہ میرا ہی کٹھ پُتلی (Puppet) اور ''Yes Man'' ہوگا تو اُس کے ہونے یا نہ ہونے سے فیصلوں اور اُن کے نفاذ میں جوہری تبدیلی نہیں آئے گی اور فوجی حکمرانوں کے ساتھ کام کرنے والے اعلیٰ بیوروکریٹس کے لیے دستوری تقاضوں کی پاسداری کی چنداں اہمیت نہیں ہوگی۔

یہ لمبی تمہید میں نے اِس لیے باندھی کہ ہمارے یہاں بھی ''مَصلحتِ نظام'' کا کوئی قابلِ عمل دستوری نظام (Mechanism) ہونا چاہیے، جو کہ نہیں ہے، اِسی لیے ہم بحرانوں سے نکل نہیں پار ہے۔ ہمارے یہاں آج کل انتہائی سنگین مسائل یہ ہیں:

(۱) دہشت گردی اور بے امنی

(۲) توانائی کا بحران

(۳) معاشی بدحالی

(۴) قانون کی حکمرانی کا فقدان

توانائی کے بحران یعنی Load Shedding کا اِزالہ کرنے کے لیے بظاہر حکومت سرتوڑ کوشش کر رہی ہے، لیکن یہ کوششیں حکمرانوں کی توقعات کے برعکس نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو رہیں، اشیائے صرف میں کسی چیز کا بُحران اُس وقت پیدا ہوتا ہے، جب اُس کی طلب (Demand)، رَسد (Supply) سے بڑھ جائے۔ ہمارے یہاں طلب اور رَسد میں تفاوت یقیناً ہے، لیکن حکومت دس ہزار میگاواٹ بجلی بھی پیدا (Generate) کر کے نیشنل گرڈ میں ڈال دے، تب بھی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ کیونکہ جس جیب میں کئی سوراخ ہوں، اُس میں آپ جتنے بھی پیسے ڈالتے چلے جائیں، وہ کبھی بھی بھر نہیں پائے گی۔

ہمارے توانائی کے بُحران کی جڑ بڑے پیمانے پر بجلی کے غیر قانونی کنکشن ہیں، کنڈا سسٹم ہے، کئی علاقے ایسے ہیں، جہاں قانونی کنکشن اور بلنگ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ بعض علاقوں میں لوگوں نے ہمیں بتایا کہ بجلی کی ترسیل کے ادارے کے بجائے پرائیویٹ لوگ ماہانہ بل وصول کررہے ہیں، جب کہ کُنڈا سسٹم ہے، میٹر کا نام ونشان نہیں ہے۔ حکومتیں مَصلحت کا شکار ہیں، سیاسی عزم اور قوتِ فیصلہ سے محروم ہیں اور اپنے اپنے دائرۂ اَثر میں جرائم پیشہ اَفراد کی یا تو سرپرستی کررہی ہیں یا اُن پر ہاتھ ڈالنے کا حوصلہ نہیں رکھتیں۔ جس نے بل ادا نہیں کرنا، وہ بجلی کے استعمال میں کفایت اور ضرورت کا نہ تو قائل ہے اور نہ ہی اِس کا عادی اور نہ ہی یہ اس کا دردِسر ہے، وہ اگر کسی چھوٹے مکان میں بھی چار چار ونڈو اے۔سی (Window A.C) بھی استعمال کرے، تو اُس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وفاق اور صوبوں میں مختلف سیاسی جماعتوں کی حکومتیں ہیں، اس لیے اول تو یکساں پالیسی تیار ہونا مشکل ہے اور اگر بادلِ نخواستہ تیار ہو بھی جائے، تو اُس کا نفاذ مشکل ہے۔

توانائی کے بُحران کے اصل متاثرین وہ لوگ ہیں، جو نہایت دیانت داری سے بجلی استعمال کرتے ہیں اور باقاعدگی سے بل ادا کرتے ہیں اور یہ بل انتہائی ظالمانہ اور سفاک ہیں، بجلی کے میٹر انتہائی ناقابلِ اعتبار ہیں۔ صورتِ حال کچھ ایسی ہے کہ قتل کسی نے بھی کیا ہو، آپ کے ہاتھ جو بندہ آجائے اور پھندا جس کی گردن میں فٹ ہوجائے، آنکھیں بند کرکے اُسے لٹکادو۔ اِس طرح مُتمدّن اور مُہذّب دنیا میں نہ حکومتیں چلتی ہیں اور نہ نظام چلتا ہے۔ اِسی لیے پاکستان پیپلز پارٹی کے پنج سالہ دور میں صرف مفاہمت چلتی رہی، حکومت جیسے تیسے لڑکھڑاتے ہوئے چلتی رہی، لیکن ملک چلتا ہوا دکھائی نہیں دیا۔

ایسی صورتِ حال میں ہمیں بھی کسی "مجلسِ تشخیصِ مَصلحتِ نظام" کی اَشد ضرورت ہے۔ ضروری ہے کہ ہر علاقے میں نیشنل گرڈ سے وفاقی، صوبائی اور مقامی حکومتوں کو بجلی کسی میگا میٹر کے ذریعے دی جائے اور آگے تقسیم اور وصولی کی وہ ذمے دار ہو۔ بعض علاقوں میں یا کسی علاقائی امتیاز کے بغیر انتہائی کم آمدنی والوں کو بجلی بالکل مفت یا انتہائی سستی دینا بھی

مقصود ہوتو باقاعدہ سسٹم کے تحت اور میٹر کے ذریعے دی جائے اور اُس کی حد متعیّن ہو۔ ورنہ انتہائی کوشش کے باوجود اِس حکومت کے پانچ سال بھی پورے ہوجائیں گے، لیکن یہ بُحران حل نہیں ہوگا، کیونکہ آبادی بڑھ رہی ہے، شہروں اور دیہاتوں میں مکانات کی تعمیر زور شور سے جاری ہے اور طلب میں روز بروز اِضافہ ہورہا ہے۔ جب تک نظامِ اقتدار (یعنی حزبِ اقتدار وحزبِ اختلاف) میں شامل تمام ذمّے داران خلوصِ نیت سے یک سُو ہوکر اِس مسئلے کا حل نہیں نکالیں گے اور اپنے زیرِ اثر حکومتوں کو پابند نہیں کریں گے، تو اِس مسئلے کی سنگینی اور شدّت میں اِضافہ ہی ہوتا رہے گا۔ سیاستدان تو ایک دوسرے کو لعن طعن کرکے اور ناکامیوں اور نامرادیوں کا ملبہ ایک دوسرے پر ڈال کر اپنی نفسانی تسکین کا انتظام کرلیں گے، مگر ملک وقوم کا کیا بنے گا؟، اِس کے بارے میں سب کو سوچنا چاہیے۔ یہ بھی تحقیق ہونی چاہیے کہ مثلاً KESC کو پرائیوٹائز کرتے وقت بجلی کے سامان سمیت اسٹاک کیا تھا اور آج کیا ہے، اس ادارے کے مالکان نے یہاں کے وسائل ہی باہر منتقل کیے ہیں یا باہر سے کچھ وسائل لاکر سسٹم کو ترقی دی ہے؟ ہمیں تو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جہاں جہاں تانبے کی تاریں (Copper Wire) بجلی کی ترسیل کے نظام میں پہلے سے تھیں، اُنہیں اُتار کر اُن کی جگہ المونیم کی تاریں ڈال دی گئی ہیں۔ لہٰذا یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اداروں کی پرائیوٹائزیشن لوٹ مار کے لیے ہوتی ہے یا نظام کو بہتر بنانے کے لیے ہوتی ہے۔ لہٰذا اَشَد ضروری ہے کہ اداروں کی پرائیوٹائزیشن سے پہلے آئینی اور قانونی ماہرین سے ان سے معاہدے کی دستاویز (Contract Deed) تیار کروائی جائے اور اُس میں قومی وملکی مفادات کے تحفظ کو اوّلین ترجیح دی جائے، ورنہ جیسا کہ انٹرنیشنل پاور پروجیکٹس کی "Deal" کے وقت بے تدبیری اور عجلت سے کام لیا گیا، وہ بعد میں ملک کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔

20 اکتوبر 2013ء

❁

امریکا مردہ باد

جی ہاں! ''امریکا مردہ باد''، یہ ہماری قومی اور ملکی سیاست کا سب سے قیمتی اور اثر آفرین نعرہ (Slogan) ہے اور اگر اس میں ''انڈیا مردہ باد'' اور ''اسرائیل مردہ باد'' کو بطورِ اجزائے ترکیبی (Ingredients) شامل کر دیا جائے، تو یہ دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو جاتا ہے۔ یہی نعرہ ہمارے ہر درد کی دوا ہے، ہر زہر کا تریاق ہے اور ہر مرض کے لیے اکسیر ہے۔ انتخابی سیاست میں تو یہ کارآمد ثابت نہیں ہوا، لیکن احتجاجی سیاست میں اس کی اثر آفرینی سے کوئی مردِ دانا اختلاف نہیں کر سکتا۔ یہ ہماری سیاسی جبلّت کا حصہ اور فطرتِ ثانیہ بن چکا ہے۔ لیکن اس کا منفی اثر ہمارے قومی مزاج اور سیاسی حس (Political Sense) پر یہ مرتب ہوتا ہے کہ ہماری ہر ناکامی، بے تدبیری، بے ہمتی، سیاسی عدمِ استحکام، معاشی زبوں حالی، معاشرتی ناآسودگی اور دینی و ملّی بے حمیتی، بے امنی و فساد اور بدعنوانی کا ذمے دار امریکا ہے۔ اس طرح لاشعوری طور پر ہم اپنے آپ کو اپنی دینی، ملّی، قومی اور ملکی ذمے داریوں سے بری الذمہ سمجھتے ہیں، کیونکہ ہم اپنی تمام تر ناکامیوں کا ملبہ کسی اور کے سر ڈال کر فارغ ہو جاتے ہیں۔

ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ ہمارے دینی، ملی، قومی اور ملکی مفادات کا تحفظ ہماری اپنی ذمے داری ہے نہ کہ کسی اور کی۔ امریکا یا دنیا کی کسی استعماری طاقت نے پاکستانی مفادات کو کبھی بھی اپنے ترجیحی ایجنڈے میں شامل نہیں کیا۔ جب ہم اپنی کامیابیوں کا کریڈٹ خود لیتے ہیں، تو اپنی ناکامیوں کی ذمے داری بھی قبول کرنی ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

ہمارے حکمران اپنے اقتدار کے حصول یا اس کے تحفظ کے لیے مغربی استعماری قوتوں کی آشیر باد کے محتاج ہوتے ہیں۔ لیکن اپنے پسندیدہ حکمرانوں کو مسندِ اقتدار پر بٹھانا اور ناپسندیدہ حکمرانوں کو مسندِ اقتدار سے معزول کرنا، یہ ہمارا کام ہے۔ اور ہم اگر اس میں ناکام ہوتے ہیں، تو یہ ہماری ناکامی ہے۔ کسی اور کو کوسنے، ملامت کرنے یا لعن طعن کا ہدف بنانے سے نفسانی تسکین تو مل سکتی ہے، لیکن اپنی ناکامیوں کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔

ہماری امریکا دشمنی کے اظہار کے طریقے بھی عجیب ہیں، ہم امریکا اور مغرب کے خلاف مذمّتی جلوس نکالتے ہیں اور پھر اپنی ہی نجی یا قومی اَملاک کو آگ لگا دیتے ہیں اور پھر اپنے دل کی طمانیت کے لیے اس دلیل کا سہارا لیتے ہیں کہ امریکا یا انڈیا کے ایجنٹ ہماری صفوں میں گھس آئے اور یہ سب گھیراؤ جلاؤ ان کا کیا دھرا ہے۔ اسی طرح ہمارے بعض کرم فرما امریکا دشمنی میں پاکستان کی دفاعی اور سویلین تنصیبات کو نشانہ بناتے ہیں۔ مساجد، مزارات، مدارس، غیر مسلموں کی عبادت گاہوں اور بازاروں میں بے قصور لوگوں (جن میں مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے سب شامل ہوتے ہیں) کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ میڈیا کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے اس کی ذمے داری قبول کی ہے اور کچھ کا بیان آتا ہے کہ یہ ہمارے مخالفین یعنی امریکا کی کارستانی ہے۔

پس ہمیں امریکا سمیت اپنے مخالفین کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے اپنے آپ کو منظم کرنا ہوگا اور اپنی صفوں میں در آنے والے ایجنٹوں کو تلاش کرنا ہوگا، خود کو طاقتور بنانا ہوگا اور جنہیں ہم اپنا دشمن قرار دیتے ہیں، ان پر انحصار ختم کرنا ہوگا اور خود کفالت کی منزل کو کم از کم وقت میں حاصل کرنا ہوگا۔ قانون کی حکمرانی قائم کرنی ہوگی، کرپشن کے ناسور سے نجات پانی ہوگی اور ایمانی وروحانی قوت کے ساتھ ساتھ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی میں ان کے مقابل آنا ہوگا۔ ورنہ ہم صرف اس طرح کی شکست ہی دشمن کو دے پائیں گے، جس طرح ہمارا دعویٰ ہے کہ افغانستان میں امریکا کو شکست ہو گئی ہے، لیکن ہماری فتح کا سورج کب طلوع ہوگا، اس

کا کسی کو پتا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بھی ہدایت دی ہے:

''اور تم دشمن سے مقابلے کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق حربی طاقت تیار رکھو اور بندھے ہوئے گھوڑے کہ تم ان کے ذریعے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو مرعوب کرو اور ان کے سوا دوسرے دشمنوں کو بھی، جنہیں تم نہیں جانتے، اللہ انہیں جانتا ہے''۔ (انفال:60)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلامی ریاست کو ہمیشہ دشمن سے مقابلے کے لیے مستعد اور چوکنا رہنا چاہیے، جسے جدید فوجی اصطلاح میں ''Red Alert'' اور ''High Alert'' کہا جاتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے تاکیداً تین بار فرمایا: سنو! قوت یقیناً ''رَمی'' (یعنی تیر اندازی یا پھینکنے کی صلاحیت) ہے اور آج کل اس کی جدید ترین شکل گائیڈڈ میزائل ہے، جو کمپیوٹرائزڈ طریقے سے اپنے ہدف کو نشانہ بناتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کے مقابل اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعائیں بھی فرمائیں اور اپنے وسائل کے اندر افرادی قوت اور سامانِ حرب اور حربی استعداد کا بھی اہتمام فرمایا۔ لہٰذا دشمن کے عزائم کی موت مسلمان کی اپنی طاقت میں ہے اور خود کو طاقتور بنانا ہی دشمن کی کمزوری ہے اور یہ گوہرِ مقصود محض نعروں سے حاصل نہیں ہوگا بلکہ جُہدِ مسلسل، سعیِ پیہم اور مسلمانوں کی عزیمت و استقامت اور ناقابلِ شکست اتحاد سے حاصل ہوگا۔ اب یہ ہر فریقِ معاملہ کی اہلیت اور استعداد پر منحصر ہے کہ وہ فریقِ مخالف کی ضرورت یا مجبوری کو اپنے حق میں کس طرح استعمال کرتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا، یعنی سیاست ذہانت، ہوشیاری اور سودا بازی کی مہارت کا نام ہے۔ اور قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہ واضح پیغام دیا گیا ہے کہ جب اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ مفادات و معاملات کا ٹکراؤ ہوگا، تو سارا عالمِ کفر ملتِ واحدہ بن جائے گا۔

ہماری ایک غلط فہمی یہ ہے کہ ہم ممالک کے تعلقات کو دو اشخاص کے معاشقے کی طرح

سمجھتے ہیں اور پھر مایوس ہو کر کہتے ہیں کہ امریکا ہم سے بے وفائی کر رہا ہے، ہماری قربانیوں کی قدردانی نہیں ہو رہی اور ہماری خدمات کا صلہ نہیں مل رہا۔ ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ دو ملکوں کے تعلقات، مفادات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنی اپنی ضرورت، مجبوری اور قومی مقاصد کے تابع ہوتا ہے۔ ایک طرح سے یہ خالص کاروباری معاملات ہیں، ان میں دائمی دوستی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ امریکا کے خلاف جنگ میں چین، ویت نام کا دوست اور ہر طرح کی سیاسی، اخلاقی، مالی اور فوجی مدد کرنے والا ساتھی تھا، لیکن ویت نام کی آزادی کے بعد دونوں کے مفادات ٹکرا گئے اور ان میں مختصر سرحدی جنگ بھی ہوئی۔ جب مفادات تبدیل ہو گئے، تو دوستی دشمنی میں بدل گئی۔

پس ہمیں علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ کے درد دل کو پلے باندھ لینا چاہیے اور متاعِ کارواں کے لٹ جانے اور چھن جانے کی ذمے داری خود قبول کر کے اور اپنے اندر احساسِ زیاں پیدا کر کے اپنی نشاۃ ثانیہ اور إحیاء (Renaissance) کا سامان کرنا چاہیے۔ ہمارے حکمرانوں کو چاہیے کہ سچ بولیں اور قوم کے سامنے تمام حقائق اپنی اصل صورت میں بیان کریں اور اجتماعی دانش سے کام لیتے ہوئے إحیا کا متفقہ اور طویل المدت ایجنڈا ترتیب دیں، جس میں فوری نوعیت کے اقدامات اور طویل المدت منصوبوں کی فہرست الگ الگ ہو۔ علامہ اقبال ہی کا فرمان ہے۔

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ حرم خیز
از خوابِ گراں خیز، از خوابِ گراں خیز

ہماری کوتاہ اندیشی کا حال یہ ہے کہ اٹھارہویں آئینی ترمیم کی ساری کارروائی پسِ پردہ ہوتی رہی، جو بھی بحث ہوئی، اس کی تفصیلات قوم کے سامنے نہیں آئیں اور پھر قوم نے دیکھا کہ دو تین دن میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں ایک سو ایک آئینی ترامیم محض نشست و برخاست کی مشق کرتے ہوئے منظور کر لی گئیں، اراکین کی حمایت ومخالفت میں

تقسیم (Division) محض ایک آئینی مشق تھی۔ کسی نے کوئی بحث نہیں کی، ترامیم کی حُسن و قُبح پر اراکین نے اظہارِ خیال ہی نہیں کیا، ایسا لگتا تھا کہ اراکینِ اسمبلی اپنی اپنی سیاسی جماعتوں کے قائدین کے مزارعین ہیں اوران کا فرض محض ہاں یا ناں کرنا ہے۔ سو ہم کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہماری اجتماعی دانش کا مظہر ہے۔ جمہوری دنیا میں مجوّزہ آئینی ترامیم کو شائع کیا جاتا ہے تاکہ ان پر قومی سطح پر بحث و تمحیص ہو، آئینی و قانونی ماہرین ان پر اظہارِ رائے کریں اور پھر پارلیمنٹ کی اجتماعی دانش بروئے کار آئے اور قابلِ عمل اور قابلِ اعتماد دستوری نظام وضع ہو۔ اس وقت آئینی صورتِ حال یہ ہے کہ تعلیمی نصاب (Curriculum) کا تعین وفاق کے پاس نہیں ہے، حالانکہ ابتدائی تعلیمی نصاب کے ذریعے ہی نئی نسل میں قومی و ملی شعور اُجاگر کیا جاتا ہے۔

الیکشن کمیشن کی تشکیل اور قومی احتساب بیورو کے چیرمین کے تقرر کے وقت ان ترامیم کی کمزوری سامنے آگئی اور چیف الیکشن کمشنر کے تقرر کے وقت تو فریقین نے اس کا اعتراف بھی کرلیا کہ تعطل (Deadlock) کا دستور میں کوئی حل نہیں ہے۔ چنانچہ قوم کو جو نگران وزیر اعظم ملا، وہ ہماری پارلیمنٹ کی اجتماعی دانش کا شاہکار تھا اور ان کا نام نشانِ عبرت کے طور پر قومی عجائب گھر کی زینت ہونا چاہیے۔ اس ترمیم کا مقصد شاید یہ تھا کہ ایک غیر جانبدار، مضبوط قوتِ فیصلہ اور انتظامی صلاحیت کے حامل غیر جانبدار شخص کا تقرر ہو، جو اپنے آپ کو صرف آئین و قانون کا پابند سمجھے اور اس کا انتخابی میدانِ کارزار میں شامل جماعتوں میں سے کسی کی طرف جھکاؤ نہ ہو، جانبداری کا تاثر نہ پیدا ہو اور قومی انتخابات کی ساکھ اور اعتبار مجروح نہ ہو۔ لیکن ایسا بالکل نہ ہوا، کچھ یہی صورتِ حال قومی الیکشن کمیشن کی تھی اور حال ہی میں نیشنل ڈیٹا رجسٹریشن اتھارٹی (NADRA) نے قومی اسمبلی کے دو حلقوں کی جو چھان بین کی، تو حیران کن نتائج سامنے آئے ہیں۔ اس صورتِ حال میں عمران خان کا یہ مطالبہ درست معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم آئندہ قومی انتخابات کے لیے کوئی

قابلِ عمل اور قابلِ اعتبار طریقۂ کار(Mechanism)وضع کیا جائے اور اس کا تجرباتی آغاز عنقریب منعقد ہونے والے مقامی حکومتوں(Local Governments)سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات عیاں ہوگئی کہ اگرچہ آئینی وقانونی طریقۂ کار کے اعتبار سے ہمارا نظامِ انتخاب آئیڈیل نہیں تو بہتر ضرور ہے، لیکن جب کسی مقام پر پورے کا پورا حلقہ یا پولنگ اسٹیشن یرغمال ہوجائے، تو پھر سارے قاعدے اور ضابطے اور آئینی وقانونی نظام محض نمائشی(Show Piece)بن کر رہ جاتے ہیں۔

25اکتوبر2013ء

توسُّط و اعتدال

اسلام توسُّط اور اعتدال کا دین ہے، افراط وتفریط اور غُلُو سے پاک ہے۔ ''غُلُو'' کے معنی ہیں: ''اظہارِ عقیدت میں حد سے تجاوز کرنا''۔ یہ اہلِ کتاب کا شِعار تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اے اہلِ کتاب! تم اپنے دین میں حد سے تجاوز نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں صرف حق (اور سچ) کہو، مسیح عیسیٰ بن مریم تو صرف اللہ کا رسول ہے اور اس کا کلمہ ہے، جس کو اس نے مریم کی طرف القا کیا اور اس کی طرف سے روح ہے، پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور (یہ) نہ کہو کہ (معبود) تین ہیں، (ایسی بات کہنے سے) باز رہو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے، صرف اللہ ہی اکیلا معبود ہے، وہ اس سے پاک ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو''۔ (النساء:171)

اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو نبی بنایا اور اپنی قدرت کی نشانی کے طور پر ظاہری اسباب سے ماوراء انہیں کلمہ ''کُن'' یعنی امرِ تکوینی سے پیدا فرمایا۔ قرآنِ مجید کی رُو سے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام خود فرماتے ہیں: ''بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا اور اس نے مجھے برکت والا بنایا، خواہ میں کہیں بھی ہوں اور اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے''۔ (مریم:31-30)

''اور یہود نے کہا: عزیر (علیہ السلام) اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا: مسیح اللہ کا بیٹا ہے، یہ ان کی خودساختہ باتیں ہیں''۔ (توبہ:30)

یعنی یہود ونصاریٰ دونوں مذاہب کے ماننے والوں نے غلو کیا، حد سے تجاوز کیا اور نبی جو اللہ کا بندۂ خاص ہوتا ہے، اُس کی امتیازی شان کو دیکھ کر اسے اللہ کا بیٹا قرار دے دیا۔ یہود نے تفریط سے کام لیا اور نہ صرف عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا بلکہ ان کی عفیفہ (Pious) اور پارسا والدۂ ماجدہ حضرت مریم پر تہمت بھی لگائی۔ اسلام نے اسی لیے توسط واعتدال کا حکم دیا۔ ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

"میری شان میں مبالغہ آرائی نہ کرو، جیسا کہ نصاریٰ نے (مسیح) ابن مریم کے بارے میں کی، میں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا بندۂ خاص ہوں، سوتم میرے بارے میں یہ کہو: اللہ کا بندہ اور اس کا رسول"۔ (بخاری:3445)

اور اسی لیے کہا گیا کہ:

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید وبایزید ایں جا

یعنی اس آسمان کی چھت تلے بارگاہِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم سب سے نازک مقامِ ادب ہے کہ جنید وبایزید جیسے اولیائے کاملین بھی اپنی اَنا کو فنا کر کے اور پیکر عجز وانکسار بن کر اس بارگاہ میں آتے ہیں اور کہا گیا۔

ع: باخدا دیوانہ باش وبا محمد ہوشیار

یعنی اظہارِ بندگی میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں دیوانگی اختیار کرو کہ اس کی ذات کو جتنا بھی بلند ترین کہو گے اور مانو گے، وہ اس سے بھی بلند ترین ہے۔ لیکن ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہمیشہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے مقام سے اتنا نہ بڑھایا جائے کہ مقامِ اُلوہیت سے جا ملے اور نہ اتنا گراؤ کہ ساری نیکیاں برباد ہو جائیں اور نعمتِ ایمان سے محروم ہو جاؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے مزاجِ مبارک میں بھی یہی اعتدال تھا۔ طویل نماز پڑھنا اور طویل قراءت کرنا شریعت کی نظر میں پسندیدہ عمل ہے۔ لیکن ایک روتے ہوئے بچے کی ماں کی بے قراری کے پیشِ نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم

اپنی پسندیدہ خواہش کے باوجود نماز کو مختصر کر دیا کرتے تھے۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے:

(۱): ''میں (بعض اوقات) نمازِ (باجماعت) کے لیے کھڑا ہوتا ہوں اور طویل نماز پڑھنا چاہتا ہوں کہ اچانک میں کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو میں صرف اسی سبب سے اپنی نماز کو مختصر کر دیتا ہوں کہ کہیں (بچے کا رونا) اس کی ماں کے لیے تکلیف کا باعث نہ ہو''۔ (بخاری: 707)

واضح رہے کہ عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں خواتین بھی باجماعت نماز پڑھتی تھیں اور شاید چھوٹے بچوں کو مسجد میں لے آتی تھیں اور بعض کے گھر بھی مسجدِ نبوی کے قریب تر ہوتے تھے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

(۲): ''جب تم میں سے کوئی جماعت میں لوگوں کی امامت کرے، تو وہ (بہت طویل نماز نہ پڑھائے بلکہ) نماز کو مختصر کرے، کیونکہ جماعت میں شامل لوگوں میں کچھ کمزور ہوتے ہیں، کچھ بیمار ہوتے ہیں اور کچھ بڑی عمر کے لوگ ہوتے ہیں (اور وہ کمزوری یا بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے طویل نماز کی مشقت برداشت نہیں کر سکتے) اور جب تم میں سے کوئی اپنی انفرادی نماز پڑھ رہا ہو، تو (اپنے ذوق اور استطاعت کے مطابق) جتنی چاہے طویل نماز پڑھے''۔ (بخاری: 703)

(۳) ابومسعود بیان کرتے ہیں کہ: ''ایک شخص نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! میں فلاں شخص کی وجہ سے جو (امامت کرتا ہے اور) طویل نماز پڑھاتا ہے، فجر کی نماز سے رہ جاتا ہوں۔ تو میں نے اس دن کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو وعظ کے دوران اتنی شدید غضب کی کیفیت میں کبھی نہیں دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو لوگوں کو (دین اور عبادت سے) متنفر کرتے ہیں، سو تم میں سے جو شخص نماز میں لوگوں کی امامت کرے، تو وہ نماز میں اختصار سے کام لے، کیونکہ مقتدیوں میں کمزور اور بوڑھے بھی ہوتے ہیں اور ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں، جنہیں کوئی حاجت درپیش ہوتی ہے''۔ (بخاری: 702)

اسی طرح اسلام نے انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں توسط اور اعتدال کی تعلیم دی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اور (اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے وہ ہیں) جو خرچ کرتے وقت نہ تو فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ ہی بُخل سے کام لیتے ہیں اور ان کا شِعار (ان دونوں انتہاؤں) کے درمیان میانہ روی کا ہوتا ہے"۔ (الفرقان:67)

اور یہی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمائی:

(۱) "خرچ کرنے میں میانہ روی آدھی معیشت ہے (یعنی معیشت کی آدھی مشکل خرچ میں توازن سے آسان ہوجاتی ہے)"۔ (المعجم الاوسط للطبرانی:6744)

(۲) جس نے (خرچ کرنے میں) میانہ روی کو اپنا شِعار بنایا، وہ کبھی اِفلاس میں مبتلا نہیں ہوگا۔ (المعجم الکبیر للطبرانی)

چال ڈھال، رویّے اور گفتار کے بارے میں اپنے بیٹے کے لیے حضرت لقمان کی حکیمانہ نصیحتوں کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"اور (ازراہِ تکبر) لوگوں سے اپنا رخ نہ پھیرو اور زمین میں اِتراتے ہوئے نہ چلو، بے شک اللہ کسی اکڑنے والے متکبر کو پسند نہیں فرماتا اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو اور اپنی آواز کو ذرا نیچی رکھو، بے شک سب سے بُری آواز گدھے کی آواز ہے"۔ (لقمان:19-18)

امام محمد بن محمد شافعی غزالی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "اِحیاء علوم الدین" میں نفسِ انسانی کے اخلاقی واعتقادی عوارض پر طویل فلسفیانہ بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نفسِ انسانی میں قدرت نے چار مَلکات ودیعت کیے ہیں:

(۱) "سَبُعِیَّتْ (Predacity)، اسے ہم غضبانی قوت اور درندگی سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔

(۲) بَہِیْمِیَّتْ (حیوانیت Animality)، اسے ہم جنسی آوارگی سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں یعنی جنسی خواہش کی تکمیل کا وہ جذبہ جو حدود وقیود کا پابند نہ ہو اور حلال وحرام کی تمیز سے ماوراء ہو۔

(۳) شَیطَنَتْ یا اِبلِیسِیَّتْ، اس سے مراد انسان کے اندر ابلیسی جِبلّت جو حق اور خیر کی ہر

بات کو رد کرے اور جس میں سرکشی اور تمرد ہو۔

(۴) مَلکُوتیت یا رَبّانِیّت، اس سے مراد انسانی نفس کی وہ پاکیزہ استعداد جو خیر کے ہر پیغام کو قبول کرتی ہے اور اس پر عمل کے لیے آمادہ کرتی ہے، یعنی وہ خصلتِ انسانی جو فرشتوں سے مشابہ ہو۔

امام غزالی لکھتے ہیں کہ:

''انسانیت کا جوہرِ کمال نفسانیت کی سبعی، بہیمی اور ابلیسی جبلّت اور استعداد کو قابو میں لاکر شریعت کے تابع کر دینا ہے، انسانیت کا یہی وہ اَرفَع مقام ہے کہ بقولِ کسے:

ع: فرشتوں کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اور یہی مقامِ انسانیت و آدمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنی خلافت کے اعزاز سے نوازا اور مسجودِ ملائک بنایا۔ انسانی جبلّت کی یہ خصلتیں دو انتہاؤں کے درمیان جب توازن کو اختیار کرتی ہیں، تو بنی آدم شرف و تکریم کے مرتبے کو پالیتا ہے، مثلاً انفاق کی ایک انتہا اسراف و تبذیر ہے، یعنی فضول خرچی کرنا اور شریعت نے جہاں منع کیا ہے وہاں خرچ کرنا اور دوسری انتہا بُخل ہے اور ان دونوں کے درمیان اعتدال کی راہ سخاوت اور سماحت ہے۔ اسی طرح غضبانی قوت کی ایک انتہا تہوُّر (غضب سے مغلوب ہو کر تمام حدود کو پار کر لینا /To become rash) ہے اور دوسری انتہا جُبن (بزدلی/Cowardice) ہے اور ان دونوں کے درمیان اعتدال شجاعت ہے، علیٰ ہٰذا القیاس۔ الغرض عقائد، عبادات، معاملات، اخلاقیات اور آداب ہر چیز میں اسلام توسُّط، توازُن اور اعتدال کو پسند کرتا ہے اور ان کی ضد افراط و تفریط اور غُلُو ہے، جسے آج کل Extremism یا Excessiveness کہا جاتا ہے۔ اور مسلمانوں کے لیے ان اصطلاحات کو نفرت کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، لہٰذا مسلمانوں پر لازم ہے کہ اپنے آپ کو حدودِ شریعت کا پابند بنائیں، اسوۂ رسول ﷺ سے ہٹ کر دین میں خیر کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

27 اکتوبر 2013ء

خطابت کی شعلہ نوائی

ہمارے ہاں جب محرم الحرام کا مہینا آتا ہے تو حکومت کی طرف سے ایک لگا بندھا روایتی نوٹیفیکیشن جاری ہوتا ہے کہ فلاں فلاں علماء، خطباء اور ذاکرین اس مہینے میں فلاں شہر میں داخل نہیں ہو سکتے۔ یہ کیوں ہوتا ہے؟، کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری زبانیں اچانک آتش بداماں ہو جاتی ہیں، ہمارے لب ولہجے میں زہر آلود تلوار کی سی کاٹ آجاتی ہے، ہم نفرتوں اور عصبیتوں کی فصل اُگاتے ہیں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے بجائے باہم دست بہ گریباں کر دیتے ہیں اور اب تو حق وباطل کے فیصلے دلیل واستدلال کے بجائے خنجر کی نوک اور کلاشنکوف کی گولی سے ہونے لگے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ ناگزیر ہے؟۔ ائمۂ کبار اور اہلِ بیتِ اطہار کی تعریف سے تو ہر مسلمان کا ایمان تازہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارک کے ساتھ کسی بھی چیز کو ادنیٰ نسبت حاصل ہو جائے، تو وہ ہماری عقیدتوں کا مرکز بن جاتی ہے۔ پس جن مقدس شخصیات کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے وجود کا حصہ قرار دیا ہے اور جن کی محبت کو اپنی محبت کا لازمی تقاضا قرار دیا ہے، اُن کے بارے میں مسلمانوں کے دلوں میں احترام واکرام اور عقیدت ومحبت کے سوا کوئی اور چیز جگہ پا ہی نہیں سکتی، محبتِ رسول عینِ ایمان ہے اور رسول اللہ ﷺ کی محبت اور ان مقدس شخصیات سے نفرت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ لیکن جب طنز وتعریض اور توریہ (Double-Entender, Hint) ہماری خطابت کا جوہر بن جائیں اور ہم اشارات وکنایات میں دوسروں کے جذبات کو

مجروح کریں، تو کوئی ہماری بات کیوں سنے گا اور کسی کے دل میں ہمارے لیے گنجائش کیسے پیدا ہوگی۔ جب دین مشن کے بجائے معاش بن جائے، تو پھر ہمارے الیکٹرونک میڈیا کی طرح ریٹنگ ہماری مجبوری بن جاتی ہے۔

اسی طرح اگر مخصوص ذوق کے حامل سامعین سے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے پر تحسین مطلوب ہو، تو پھر ڈرائیونگ سیٹ پر خطیب نہیں رہے گا بلکہ لگام سامعین کے ہاتھ میں ہوگی اور خطیب اپنی ریٹنگ کی شرح کو قائم رکھنے کے لیے ان کی داد و تحسین کو اپنی ترجیحِ اوّل سمجھے گا۔ اس سے کچھ لوگوں کی نفسانی تسکین تو یقیناً ہو جائے گی، مگر معاشرے میں بڑے پیمانے پر نفرت کی فضا پیدا ہوگی۔ تو کیا ایسا ممکن نہیں کہ الیکٹرونک میڈیا پر اور بڑے عوامی اجتماعات میں خطابات کے لیے خطبائے کرام خود ہی اپنے لیے کم از کم معیارِ اَخلاق وضع کریں اور خود کو اس کا پابند بنائیں۔

اس زمینی حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ ہمارے ہاں مسالک و مکاتبِ فکر کے کچھ تفردات اور امتیازات ہیں اور کسی انتظامی تدبیر یا سرکاری حکم نامے یا خوبصورت خواہش سے بیک جنبشِ قلم ان سب باتوں کا خاتمہ ممکن نہیں ہے۔ لیکن طرزِ خطاب اور اندازِ بیان میں اعتدال اور میانہ روی کو اپنانا یقیناً ممکن ہے اور یہ عہدِ حاضر کا ایک ناگزیر تقاضا بھی ہے۔ مسلکی تفردات کے بیان کے لیے بہترین مقام کلاس روم یا چہار دیواری کے اندر مجالسِ درس و وعظ کا انعقاد ہے۔ اس کے لیے عوامی اجتماعات اور الیکٹرونک میڈیا مناسب مقامات نہیں ہیں۔ الیکٹرونک میڈیا کو بھی پابند کیا جائے یا وہ خود رضا کارانہ طور پر یہ پابندی اختیار کریں کہ مخصوص مواقع پر مذہبی اجتماعات کے خطابات کو ایڈٹ کر کے نشر کریں۔ ٹیلی ویژن پروڈکشن میں ڈائریکٹر اور Pre-Review کا شعبہ بھی اسی لیے قائم کیا جاتا ہے۔ ٹیلی ویژن چینلز کی مسابقت سے بھی مسائل پیدا ہو رہے ہیں کہ موضوعات کم ہیں اور مقابلہ سخت، چنانچہ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ نیوز چینلز کو گھر کے تمام افراد (باپ بیٹا، ماں بیٹی، بہن بھائی) کامن روم میں اکٹھے بیٹھ کر دیکھتے ہیں، ان میں متعہ اور حلالہ پر مناظرے

کرائے جاتے ہیں اور اس کارِ خیر کے لیے علمائے کرام بھی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں، تو کیا کوئی باوقار شخص اپنی بیٹی یا بہن کے لیے ان چیزوں کا تصور کر کے خوشی محسوس کرے گا؟۔

سفرِ معراج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کو عالمِ برزخ کے مشاہدات کرائے گئے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ آپ ﷺ کا گزر ایک ایسی قوم سے ہوا، جن کی زبانیں اور ہونٹ آگ کے انگاروں سے کاٹے جا رہے تھے اور فوراً ہی وہ صحیح ہو جاتے، اس طرح ان کے ساتھ یہ عمل ایک عذاب کی صورت میں مسلسل دہرایا جا رہا تھا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ تو جبریلِ امین نے بتایا کہ یہ آپ کی امت کے فتنہ پرور خطیب ہیں۔ اس سیاق وسباق میں کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم ذاتِ رسالت مآب ﷺ کی اتباع اور آپ ﷺ کے اندازِ خطابت کو اپنا شعار بنائیں۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ، آپ کے اقوال وافعال اور اَحوالِ مبارکہ کو ہمارے لیے اُسوہ وقُدوہ، نمونۂ عمل اور "Role Model" قرار دیا ہے تاکہ ہم ان کی اتباع کر کے اپنی نجات کا سامان کریں۔ آپ کا اندازِ گفتار انتہائی سہل، متوازن، اثر آفریں اور دل ودماغ میں اُتر جانے والا تھا، جس کے نتیجے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں انقلاب برپا ہو جاتا تھا۔ حدیث پاک میں ہے:

"رسول اللہ ﷺ کے کلام کا ہر لفظ اتنا جدا جدا (اور واضح) ہوتا کہ جو بھی اسے سنتا، اُس (کے الفاظ ومعانی) کو پوری طرح سمجھ لیتا"۔ (سنن ابوداؤد: 4806)

ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ اس طرح ٹھہراؤ کے ساتھ بات کرتے کہ اگر کوئی سننے والا آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا۔

اسی طرح کلامِ ربانی قرآنِ مجید کا اندازِ بیان بھی خطابی (Oraterical) ہے۔ اور قرآن اور صاحبِ قرآن کے اندازِ خطاب میں تاثیر کا عالَم یہ تھا کہ قریشِ مکہ لوگوں کو آپ ﷺ سے دُور رکھنے کے لیے کہتے کہ ان کے قریب نہ جاؤ، یہ تو کاہن

(Soothsayer) ہیں، ساحر ہیں اور کبھی کہتے کہ یہ شاعر ہیں۔ چنانچہ جب طوفانِ نوح کے تھم جانے کے بارے میں سورۂ ہود کی آیت: 44 نازل ہوئی، جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اور حکم دیا گیا اے زمین! اپنے پانی کو نگل لے اور اے آسمان! تھم جا (اور یک لخت) پانی زمین میں جذب ہو گیا اور حکمِ الٰہی نافذ ہو گیا اور کشتی کوہِ جودی پر جا ٹھہری''۔

علامہ محمود آلوسی نے اپنی تفسیر ''روح المعانی'' میں لکھا ہے:

''یہ آیت شانِ اعجاز کے بلند ترین مقام پر فائز ہے اور اس کے آگے عرب کے مایہ ناز خطبا سرنگوں ہو گئے، فصاحت و بلاغت کے اتنے محاسن کا کسی کلام میں جمع ہونا انسان کی طاقت سے باہر ہے''۔

روایت میں ہے کہ عہدِ بنو عباس کا ایک مُلحِد فصیح و بلیغ ادیب ابن مُقَفَّع قرآنِ مجید کے مقابل اپنا کلام پیش کرنے کے لیے نکلا۔ راستے میں حفظِ قرآن میں مشغول بچوں کے مکتب کے پاس سے اس کا گزر ہوا اور اس نے بچوں کو یہی آیت پڑھتے ہوئے سنا، وہ وہیں دم بخود ہو گیا اور کہا کہ کسی بھی انسان کے لیے اس کلام کے مقابل کلام لانا ممکن نہیں ہے۔ ذرا سوچیے! کہ پانی چاروں جانب پہاڑوں کی بلندیوں کو چھو رہا ہے کہ اچانک زمین کو قادرِ مطلق کا حکم آتا ہے کہ اے زمین! اپنے پانی کو نگل لے۔ ''نگل لینا'' لقمے کو حلق سے اتارنے کے لیے آتا ہے اور یہ کام ایک لمحے میں ہو جاتا ہے۔ مگر ایسا حکم تو صرف قادرِ مطلق ہی جاری کر سکتا ہے کہ زمین کو حکم ہوا اور ایک لمحے میں طوفانِ نوح کا سارا پانی زمین ''نگل'' لے، یعنی آنِ واحد میں وہ پانی زمین میں جذب ہو جائے۔ عالمِ اسباب میں انسان اپنی تمام تر سائنسی وفنی ترقی اور علمی و فکری صلاحیتوں اور ظاہری وسائل کے باوجود ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیا ہم نے بارہا مشاہدہ نہیں کیا کہ ہمارے ہاں سیلاب کا پانی مہینوں زمین پر کھڑا رہتا ہے اور ہم کچھ بھی نہیں کر پاتے۔ پس ہم سب پر لازم ہے کہ رحمۃ للعالمین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے شعارِ خطابت اور اندازِ تکلم کو اپنے لیے نمونۂ عمل اور رہنما بنائیں تاکہ نفرتوں اور عصبیتوں کے عفریت کو کچلنے میں کامیابی نصیب ہو۔

30 اکتوبر 2013ء

نومبر 2013ء

نبوت کے تراشے ہوئے انسانی ہیرے

(پہلی قسط)

حدیثِ پاک میں ہے: ''لوگوں کی مثال کانوں (Mines) کی سی ہے، جیسے سونے اور چاندی کی کانیں ہوتی ہیں، ان (اہلِ عرب) میں سے جو زمانہ جاہلیت میں کسی بھی انسانی خوبی کے حامل تھے، وہ دین کی کامل فہم حاصل کرنے (اور مکتبِ نبوت میں تربیت پانے) کے بعد اسلام میں بھی انسانی کمالات کا مظہر بنے''۔ (مسند احمد: 10956)

رسول اللہ ﷺ نے انسان کی جبلّت (Nature) اور فطری استعداد (Talent) کو کان سے تشبیہ دی، جیسے سونے، چاندی، لوہے اور کوئلے کی کان ہوتی ہے، اسے ہم بشریت کی امکانی استعداد وصلاحیت (Potential Ability) سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اور شریعت میں اسے ''تَصَلُّب فی الدین'' (یعنی دین میں مضبوطی اور پختگی) سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی حق کی حمایت میں ڈٹ جانا، جم جانا اور پائے ثبات میں لغزش نہ آنا۔ یہ ایک اعلیٰ انسانی قدر ہے، تعصُّب اس سے مختلف صفت ہے، جس کی حدیثِ پاک میں مذمت آئی ہے۔ آپ ﷺ نے عصبیت کی شدید مذمت کرتے ہوئے فرمایا: ''جس نے عصبیت پر برانگیختہ کیا، وہ ہم میں سے نہیں ہے، جس نے عصبیت پر جنگ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے اور جو عصبیت پر قائم رہتے ہوئے مرا، وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔ (سنن ابوداؤد: 5080)

صحابۂ کرام نے عرض کی: یارسول اللہ! ایک شخص اپنی قوم سے محبت کرتا ہے، کیا یہ بھی عصبیت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں (اپنی قوم سے محبت کرنا عصبیت نہیں ہے)،

بلکہ عصبیت یہ ہے کہ کوئی شخص ظلم پر اپنی قوم کی حمایت کرے"۔(سنن ابن ماجہ:3949)

یعنی حق اور باطل کی تمیز کے بغیر اپنی قوم، قبیلے، گروہ یا مکتبۂ فکر کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہونا اور فساد پر آمادہ ہو جانا "عصبیت" ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"جب کافروں نے اپنے دلوں میں تعصُّب کو جگہ دی جو جہالت (ہٹ دھرمی اور کٹ حجتی) پر مبنی تھا"۔(الفتح:26)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"گناہ اور حق سے تجاوز (یعنی ظلم) میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔(المائدہ:2)

اور عہدِ جاہلیت کی انہی عصبیتوں کے بتوں کو پاش پاش کرنے کے لیے ختم المرسلین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور آپ ﷺ نے فرمایا:

"سنو! میں جاہلیت کے تمام نسلی و نسبی تفاخر اور نسل در نسل جاری رہنے والے خونی انتقام اور مالی مطالبات کو اپنے قدموں تلے روند رہا ہوں۔(سنن ابوداؤد:4536)

سونا صرف سونے کی کان سے نکلتا ہے اور ہیرے جواہرات کی کانوں ہی سے نکلتے ہیں، مگر سونے کو خالص بنانے کے لیے بھٹی سے گزارا جاتا ہے اور ہیرے کو تراشا جاتا ہے۔ الغرض جن انسانوں میں فطری کمالات تھے، کردار کی خوبیاں تھیں، شجاعت، سخاوت، عِفت (Piety)، اولوالعزمی اور نظریے اور عقیدے کی پختگی تھی۔ جب یہ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تو نبوت کی تعلیم و تربیت اور تزکیے سے اُن کی تمام انسانی خوبیاں جو کبھی عداوتِ اسلام اور کفر کی حمایت کے لیے کام آتی تھیں، اب وہ حق کی سربلندی اور باطل کو مٹانے کے لیے کام آئیں۔ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی باطنی صلاحیتوں اور اُن کے ذاتی جوہر کے بارے میں آگہی عطا فرمائی تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے دعا فرمائی:

"اے اللہ! عمر بن خطاب یا ابوجہل بن ہشام میں سے جو تجھے سب سے زیادہ محبوب ہے، اس کے ذریعے اسلام کو غلبہ عطا فرما، راوی کہتے ہیں: حضرت عمر کے اسلام قبول کرنے

سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی بارگاہ میں سب سے محبوب عمر بن خطاب ہی تھے"۔(سنن ترمذی:3686)

اسی لیے بجا طور یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مطلوبِ رسول اور مرادِ رسول تھے۔ پس جب حضرت عمر بن خطاب اسلام لے آئے تو آپ کے اسلام سے مُشرّف ہونے کے بعد مسلمانوں نے پہلی بار بیت اللہ شریف میں کھلے عام نماز پڑھی۔ ماہرینِ سیرت نے بتایا ہے کہ آپ چالیسویں مسلمان تھے اور آپ کے اسلام قبول کرنے کے موقع پر یہ آیت نازل ہوئی: "اے نبی! آپ کو اللہ کافی ہے اور آپ کے پیروکار مومنوں کی یہ جماعت"۔ (انفال:64)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۱) "اے عمر! تم جس راستے پر چلتے ہو، شیطان تمہیں دیکھ کر اپنا راستہ بدل دیتا ہے" (بخاری:3683)۔ یعنی شیطان تمہارا سامنا نہیں کر سکتا۔

(۲) "اللہ تعالیٰ نے عمر کے دل اور زبان پر حق کو جاری فرما دیا"۔(سنن ترمذی:3682)

(۳) تم میں سے پہلی اُمتوں میں ایسے (مردانِ کمال) ہوتے تھے، جن کے قلب پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کلمۂ حق کا اِلقاء ہوتا تھا، پس اگر میری اُمت میں کوئی خوش نصیب اس منصب کا حامل ہے، تو وہ یقیناً عمر ہے۔(صحیح مسلم:6199)

حضرت عمر کے کردار کا یہی امتیاز ان کی ہجرت کے وقت بھی نکھر کر سامنے آیا: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

"مجھ سے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: میرے علم کے مطابق مہاجرین میں سے حضرت عمر کے سوا ہر شخص نے چھپ کر ہجرت کی ہے، حضرت عمر نے جب ہجرت کا قصد کیا تو انہوں نے تلوار لٹکائی، تیر اور کمان اپنے ہاتھ میں لیے اور نیزہ سنبھال کر کعبہ کی طرف گئے۔ اس وقت قریش کی ایک جماعت صحنِ کعبہ میں بیٹھی ہوئی تھی، حضرت عمر نے کعبہ کے گرد سات چکر لگائے اور مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھی، پھر قریش کے ان لوگوں کی

طرف متوجہ ہو کر کہا: جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس پر اس کی ماں روئے، اس کے بچے یتیم ہوں اور اس کی بیوی بیوہ ہو جائے، وہ اس وادی (یعنی حدودِ حرم) کے باہر آ کر مجھ سے مقابلہ کر لے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: کسی شخص نے حضرت عمر کا پیچھا نہیں کیا اور بعض معمر لوگوں نے قریش کو سمجھایا اور نصیحت کی، حضرت براء بن عازب بیان کرتے ہیں کہ سب سے پہلے مہاجرین میں سے ہمارے پاس حضرت مصعب بن عمیر آئے، پھر حضرت ابن ام مکتوم (نابینا) آئے، پھر بیس سواروں کے ساتھ حضرت عمر آئے، پھر حضرت ابو بکر کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے''۔ (اُسد الغابہ، جلد: 4، ص: 59-58)

اب ذرا اس پسِ منظر پر غور کیجیے جس میں آفتابِ اسلام طلوع ہوا، جہاں نسلی تفاخر، خاندانی عصبیت، نسل در نسل خونی انتقام کا سلسلہ جاری تھا، سب لوگوں کی نس نس اور رگ و پے میں ''حَمِیَّۃُ الجاہلیہ'' رچی بسی تھی اور حق و باطل میں امتیاز کا کوئی تصور نہیں تھا، بلکہ صورتِ حال یہ تھی کہ جب ابو جہل سے سوال ہوا کہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ تو اس نے جواب دیا: ''حقیقت یہ ہے کہ سیادت و قیادت میں بنو عبدِ مناف (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِّ اعلیٰ) سے ہمارا ہمیشہ مقابلہ رہا۔ انہوں نے دستر خوان وسیع کیا تو ہم نے بھی بڑھ چڑھ کر مقابلہ کیا، انہوں نے لوگوں کی ذمے داری کا بار اُٹھایا تو ہم بھی پیچھے نہ رہے، انہوں نے داد و دہش کا مظاہرہ کیا تو ہم نے بھرپور مقابلہ کیا، یہاں تک کہ جب ہم دونوں (بنو عبدِ مناف اور بنو مخزوم) ریس کورس کے دو نامی گرامی گھوڑوں کی طرح برابر کی ٹکر کے ہو گئے، تو اچانک انہوں نے کہا کہ ہم میں ایک نبی پیدا ہو گیا ہے اور اُس پر آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے۔ اب اس میدان میں ہم کیسے مقابلہ کریں، بخدا! ہم ان پر کبھی ایمان نہیں لائیں گے اور کبھی اس کی تصدیق نہیں کریں گے، (یعنی ایسا کرنے سے تو ہماری ناک کٹ جائے گی، قریش میں ہماری سیادت چھن جائے گی اور ان کا پرچم بلند ہو جائے گا)''۔ (سیرت ابن ہشام، جلد: 1، ص: 338-337)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبِ پاک میں آٹھویں پشت میں حضرت کعب بن مالک آتے

ہیں۔ اُن کے صاحبزادگان میں سے حضرت مُرّہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِّ اعلیٰ تھے اور اُن کے بھائی عدِی، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے جدِّ اعلیٰ تھے۔ خاندان قریش کے مختلف بُطون میں مختلف ذیلی شاخیں تھیں، جنہیں عربی زبان میں ''جِیل'' (Race) کہتے ہیں اور پنجابی زبان میں ''پوت'' کہتے ہیں، ان ذیلی شاخوں میں قریش کے اجتماعی نُظم (Social Structure) کے مختلف مناصب موروثی طور پر چلے آرہے تھے۔ ''بنوعدِی'' کے خاندان میں سفارت کاری، منافرہ اور قبائلی تنازعات کو طے کرنے کا منصب چلا آرہا تھا، جیسے آج کل ہمارے قبائلی نظام میں ''جرگہ سسٹم'' ہے۔ یہ مَنصب جن خصوصیات کا مُتقاضی تھا، ان میں نسب دانی، فیصل اور حَکَم (Command & Control) بننے کی استعداد اور قائدانہ صلاحیت کا حامل ہونا لازمی تھا۔ خاندانی تفاخر میں شاعری بھی اہم عنصر تھا اور جسمانی استعداد بھی لازمی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان تمام خصوصیات کے بدرجۂ اُتم حامل تھے، آپ ''عُکاظ'' کے سالانہ میلے میں پہلوانی میں بھی حصہ لیتے تھے اور شہسواری میں آپ کی مہارت کا عالَم یہ تھا کہ دوڑتے ہوئے گھوڑے پر سوار ہوتے اور اُسے قابو کر لیتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اِن خصوصیات کا تذکرہ میں نے اِس لیے کیا کہ ''فاروق'' (حق و باطل کی کسوٹی) بننے کے لیے جو شخصی خصوصیات اعلیٰ درجے میں مطلوب ہوتی ہیں، وہ ان کے حامل تھے۔ (جاری ہے)

4 نومبر 2013ء

نبوت کے تراشے ہوئے انسانی ہیرے

(دوسری قسط)

رحمۃ للعالمین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی تربیت کے نتیجے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قلوب واذہان کا ایسا تزکیہ (Purification) ہوا کہ ان کی سوچ رضائے الٰہی اور وحیِ ربانی کے سانچے میں ڈھل گئی۔ صحابہ کرام نے ایسی آیاتِ مبارکہ کی نشاندہی کی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ذہنِ رسا نے نزولِ وحی سے پہلے ہی منشائے ربانی کو پالیا تھا، ایسی آیات کو محدثینِ کرام نے ''موافقاتِ عمر'' سے تعبیر کیا ہے۔ صحابہ کرام بارگاہِ الٰہی میں مقبولیت کے جس درجے پر فائز تھے اور انہیں اخلاص اور تسلیم ورضا میں جو اعلیٰ مقام نصیب ہوا، وہ نورِ نبوت ہی کا فیضان تھا، بقولِ علامہ محمد اقبال:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے جس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

ایمان کے اسی اعلیٰ معیار کو رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمایا:

''(اے اہلِ ایمان!) میرے صحابہ کی شان میں نازیبا کلمہ نہ کہو، اگر تم میں سے کوئی اُحد پہاڑ کے برابر سونا بھی اللہ کی راہ میں خرچ کردے، تو وہ میرے صحابہ کے دو یا چار کلو کے اجر کے برابر بھی نہیں ہوسکتا''۔ (صحیح مسلم:222)

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے اپنے بارے میں پیار ومحبت کے ایک کلمے کو کائنات کی عظیم ترین دولت سے تعبیر کرتے تھے۔ حدیث پاک

میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عمرے کی اجازت مانگی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت دیتے ہوئے فرمایا: اے پیارے بھائی! ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں شریک کرنا اور بھلا نہ دینا"۔ (ترمذی: 3562)

اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر کو پیار سے "اُخَیَّ" (جیسے ہم اردو میں پیار سے بھیا کہتے ہیں) فرمایا، تو حضرت عمر فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک سے میرے لیے جو پیار کا کلمہ ارشاد فرمایا ہے، یہ کلمہ مجھے پوری کائنات سے زیادہ عزیز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"بنی اسرائیل میں امورِ سیاست انبیائے کرام انجام دیتے تھے، جب ایک نبی کا وصال ہوجاتا تو دوسرا نبی اس کی جگہ لیتا اور اب میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، (پس یہ فریضۂ سیاست) خلفاء انجام دیں گے"۔ (بخاری: 3455)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دوسرے خلیفہ مقرر ہوئے، آپ کی خلافت کا عرصہ تقریباً ساڑھے دس سال ہے۔ آپ کے عہدِ خلافت میں اس دَور کی دو سپر پاور (قیصر و کسریٰ) اسلام کے قدموں میں سرنگوں ہوئیں اور اسلام اس عہد کی واحد سپر پاور بن کر نمودار ہوا۔ عہدِ فاروقی میں اسلامی سلطنت تقریباً پچیس لاکھ مربع میل تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسلامی سلطنت روئے زمین پر سب سے پہلی منظم ریاست کے طور پر قائم ہوئی۔ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ ظاہری میں حجاز پر اسلامی حکومت قائم ہوچکی تھی، نزولِ قرآن کی تکمیل ہوچکی تھی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں پر تکمیلِ دین اور اِتمامِ نعمت کا اعلان کیا جاچکا تھا اور اسلام کو انسانیت کے لیے حتمی اور قطعی ضابطۂ حیات قرار دیا جاچکا تھا۔ خلافتِ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ میں اصولِ دین سے انحراف اور انکارِ ختمِ نبوت کے فتنوں کی سرکوبی کی جاچکی تھی اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہی کے صائب مشورے پر قرآن مجید کی ایک مرتب تحریری صحیفے کی شکل میں تدوین کا کام مکمل ہوچکا تھا۔ وہ خلافتِ اسلامی کے بنیادی اصول وضوابط یا دستور ومنشور کا تعین کرچکے تھے اور وہ اصول یہ تھے کہ خلیفہ سمیت تمام مسلمان اللہ تعالیٰ اور اس

کے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے پابند ہیں، ریاست کے قیام کا مقصد ظالم کے ظلم کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ کو روکنا بلکہ توڑ دینا اور مظلوم کو اس کا ہر جائز حق دلانا، یہ کہ مسلمانوں کی عزت ووقار کا راز جہاد میں ہے، روحانی اور اخلاقی اقدار کا تحفظ ریاست کی ذمے داری ہے اور خلیفہ کا کام اُمّت کو جادۂ مستقیم پر چلانا اور اُمّت کی ذمے داری خیر کے ہر کام میں خلیفہ کی معاونت ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد سے پہلے تاریخِ انسانیت فلاحی ریاست کے تصور سے ناآشنا تھی، حاکم عوام کے سامنے جوابدہ نہیں تھا، عدل کے معیارات مختلف تھے۔ یہ شاہکارِ رسالت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شخصیت تھی، جن کی ذات آج بھی ایک فلاحی عادلانہ ریاست کے لیے مستند اور معتبر حوالہ ہے اور آپ کا شِعارِ حکومت آج بھی انسانیت کے لیے مشعلِ راہ اور منارۂ نور ہے۔ قرآن مجید نے حضرت موسیٰ ویوسف علیہما السلام اور حضرت طالوت کے حوالے سے کسی اعلیٰ منصب کی اہلیت کے چند اوصاف بیان کیے ہیں، جو یہ ہیں: قوی، امین، حفیظ، علیم اور مادّی طاقت کا حامل ہونا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں یہ سارے اوصاف بدرجۂ اَتم موجود تھے اور آپ کا طرزِ حکومت انہی اوصاف کا مظہر تھا۔ علامہ اقبال نے اپنے انداز میں یہی بات کہی:

قہّاری و غفّاری و قدّوسی و جبَروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

جنگِ قادسیہ کے موقع پر مدائن میں فارس کی سلطنت کی شکست ہوئی اور ان کا قصرِ ابیض (White House) فتح ہوا تو مشہور مصری مؤرّخ حسنین ہیکل کے مطابق تیس کھرب دینار کا مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا اور اسے دارالخلافہ مدینہ منورہ بھیجا گیا۔ جب اسے مسجد نبوی میں پھیلا دیا گیا، تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ انتہائی قیمتی زر وجواہر اور مال ومتاع پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا۔ کسی نے کہا: امیر المؤمنین! یہ تو مسرت کا مقام ہے اور آپ رو رہے ہیں؟، حضرت عمر نے فرمایا: یہ

آنسو حزن وملال کے نہیں، رنج والم کے نہیں، درد وکرب کے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تشکر کے آنسو ہیں۔ انہوں نے کہا: اتنی قیمتی متاعِ دنیا صحراؤں اور بیابانوں سے گزرتے ہوئے وہ مجاہدین لے کر آئے ہیں، جنہیں کھانے کو پوری خوراک، پہننے کو پورا لباس اور سواری کا پورا سامان میسر نہیں، مگر کسی کی نیت میں کوئی فتور نہیں آیا اور ایک سوئی اِدھر سے اُدھر نہیں ہوئی، اس درجہ کمالِ امانت اور کمالِ دیانت، حضرت علی المرتضیٰ نے فرمایا: امیر المؤمنین! سپاہ اس لیے دیانت دار ہیں کہ امیر دیانت دار ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ کے حکیمانہ قول سے پتا چلا کہ نظامِ ریاست وحکومت میں امانت ودیانت کے سرچشمے اوپر سے نیچے کی طرف پھوٹتے ہیں۔ آج اُمت اسی دیانت کو ترس رہی ہے۔

اِسی حقیقت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن الفاظ میں بیان فرمایا:

''جب قومی دولت کو حُکام ذاتی جاگیر بنالیں، اُمراء زکوٰۃ کو تاوان سمجھ کر دینے سے انکار کردیں، قومی امانتوں کو مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹا جائے، ایک شخص باپ کو دُور کردے اور دوست کو قریب کرے، ایک شخص ماں کا نافرمان بن جائے اور بیوی کا فرماں بردار، معاشرے میں کسی کی عزت اُس کی ضرر رسانی اور شر کے خوف سے کی جائے، بدکاریاں اور شراب نوشی عام ہوجائے، رقص وغنا کا دور دورہ ہو، تو پھر وہاں زلزلے آئیں گے، صورتیں مسخ کردی جائیں گی (یعنی بے توقیر ہوجاؤ گے) اور زمین میں دھنسا دیا جائے گا اور سرخ ہوائیں چلیں گی (یعنی قیامت کا منظر ہوگا)''۔

فتح بیت المقدس کے موقع پر ایلیا یعنی بیت المقدس کے کلیسا کے بطریق (Chief Priest) نے آپ کو اپنے کلیسا میں نماز پڑھنے کی پیش کش کی، تو آپ نے اس لیے گریز کیا کہ کہیں اسے مثال نہ بنالیا جائے۔ مسیحی رعایا کے لیے ایک حقوق کی دستاویز لکھوائی کہ ان کی جانوں، اموال، عبادت گاہوں اور اپنے مذہب کے مطابق آزادانہ طور پر حقِ عبادت کا تحفظ کیا جائے گا اور آخر میں آپ نے لکھا کہ یہ ضمان (Guarantee) اللہ تعالیٰ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، خلیفہ اور تمام مسلمانوں کی جانب سے ہے۔

حضرت عمر فاروق نے مختلف ریاستی ذمے داریوں کو منظم اداروں (Institutionalize) کی شکل دی۔ بہت سے امور کو تاریخ میں اوّلیاتِ عمر (Originated by Umar) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ان میں سے چند یہ ہیں:

- سنِ ہجری کا اجراء
- مردم شماری
- محکمۂ خزانہ کا قیام
- نئے شہروں کی آباد کاری
- نہروں کی کھدائی
- فوج کی تنظیم
- نمازِ تراویح باجماعت
- ہر شہری (یہاں تک کہ نومولود بچوں) کے لیے وظائف کا اجراء
- مساجد کی تنظیم
- نظامِ عدل اور قضاۃ کا تقرر
- خلیفہ کے لیے "امیر المومنین" کا لقب
- عشور یعنی ریاست کے "Revenue" کا انتظام
- زمینوں کی پیمائش
- پولیس کے محکمے کا قیام
- فوجی چھاؤنی کا قیام
- مہمان خانوں اور سراؤں کی تعمیر
- چیک پوسٹوں کا قیام

جیل خانوں کا قیام اور راتوں کو گشت کر کے رعایا کے احوال معلوم کرنا وغیرہ کئی امور شامل ہیں۔ آپ نے مالِ فئے (یعنی وہ مفتوحہ علاقے جو کسی فوج کشی کے بغیر فتح ہو گئے ہوں) کو مجاہدین میں تقسیم کرنے کے بجائے بعد میں آنے والوں کے لیے ریاستی تحویل میں رکھا اور اس پر قرآنِ مجید سے استدلال کیا، جسے تمام صحابۂ کرام نے تسلیم کرلیا۔

5 نومبر 2013ء

مٹادے اپنی ہستی کو

اس کائنات میں سنتِ الٰہیہ یہ ہے کہ ہرادنیٰ چیز اپنے سے اعلیٰ چیز پر قربان ہوکر اپنے آپ کو فنا کردیتی ہے اور اُس اعلیٰ چیز کے ضمن میں اسے ایک نئی حیات مل جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین میں یہ صلاحیت رکھی ہے کہ پانی کے ساتھ مل کر اُس میں روئیدگی اور نمو (Growth) کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، قرآن مجید میں اِسے ''زمین کی حیات'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور اُس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ (اے مخاطب!) تو زمین کو خشک اور بنجر دیکھتا ہے، پھر جب ہم اُس پر (بارش کا) پانی نازل کرتے ہیں، تو وہ تروتازہ ہوکر لہلہاتی ہے، بے شک جس نے اس بے جان (غیر آباد) زمین کو زندہ کیا ہے، وہی ضرور (قیامت کے دن) مُردوں کو زندہ کرے گا، (حٰم السجدہ:93)''۔

زمین سے غذا حاصل کر کے نباتات واَشجار پروان چڑھتے ہیں۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

(۱) ''بے شک اللہ ہی (بیج کے) دانے اور (تخم کی) گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے، وہ زندہ کو مُردے سے نکالتا ہے (جیسے مرغی سے انڈا) اور مُردے کو زندہ سے نکالتا ہے (جیسے انڈے سے چوزہ)''۔ (انعام:95)

(۲) ''اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اُس سے ہر قسم کی نباتات اُگائی اور ہم نے اُس سے سرسبز کھیت اور درخت پیدا کیے، پھر ہم نے اُن سے تہہ بہ تہہ لگے ہوئے دانے اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے پیدا کیے جو جُھکے پڑتے ہیں اور (اِسی

طرح ہم نے) انگور، زیتون اور انار کے باغ اُگائے جو باہم ملتے جلتے بھی ہیں اور مختلف بھی، جب یہ درخت پھل لائیں تو ذرا ان کے پھل اور اُس کے پکنے کی طرف تو دیکھو“۔

(انعام:99)

نباتات اپنے آپ کو فنا کر کے حیوانات کی غذا بنتے ہیں اور نباتات و حیوانات (اپنے آپ کو فنا کر کے) انسان کی غذا بنتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اور وہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کر دیا تا کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ“۔(النحل:14)

اسی طرح قرآن مجید میں شرعی حدود و قیود کے ساتھ چوپایوں اور پرندوں کے شکار کے حلال ہونے کا بیان ہوا۔ الغرض یہ نظامِ قدرت ہے کہ جمادات اپنے وجود کو فنا کر کے نباتات کی غذا بنتے ہیں اور نباتات حیوانات کی غذا بنتے ہیں اور جمادات، نباتات، حیوانات الغرض تمام اشیاء وجودِ انسانی کا جزء بن جاتی ہیں۔ فنا و بقا کے اس راز کو اس شعر میں منظوم کیا گیا ہے:

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہیے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

احمد ندیم قاسمی نے کہا تھا:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

تو پھر انسان کو بھی اگر حیاتِ ابدی اور بقا چاہیے تو اُسے سب سے برتر اور سب سے اعلیٰ ہستی کے نام پر اپنے وجود کو فنا کرنا ہوگا، جو اس کے وجود اور پوری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اگر انسان بقائے دوام کے اِس راز کو پالے تو موت اُس کا مطلوب اور محبوب بن جاتی ہے، ورنہ وہ موت سے بھاگتا ہے اور موت اُس کا تعاقب کرتی ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ”تم جہاں کہیں بھی ہو(اپنے مقررہ وقت پر) موت تم کو آپہنچے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں (قلعہ بند) ہو“۔(النساء:78)

حیاتِ ابدی کی معراج منزلِ شہادت ہے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) ''اور (اے مومنو!) جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جائے، اسے مردہ نہ کہو، بلکہ وہ (درحقیقت) وہ زندہ ہیں، لیکن تمہیں اُن کی زندگی کا شعور نہیں ہے''۔(بقرہ:154)

(۲) ''اور جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیے جائیں، انہیں مُردہ گمان نہ کرو، بلکہ (حقیقت میں) وہ زندہ ہیں اور اپنے ربّ کے پاس رزق پاتے ہیں''۔(آل عمران:14)

اب آپ ان ارشاداتِ باری تعالیٰ پر غور کیجیے کہ: ''اُنہیں قتل کر دیا گیا''، یعنی عام طبی معیار کے مطابق ظاہری طور پر وہ مر گئے، اُن کی نماز جنازہ پڑھ لی گئی، تدفین کے مراحل مکمل ہو گئے، اگر شادی شدہ تھے، تو ان کی بیویاں عدتِ وفات گزاریں گی۔ اگر اُن کا کچھ ترکہ ہے تو وارثوں میں تقسیم ہو جائے گا، یعنی دنیاوی اعتبار سے اُن پر موت کے سارے احکام جاری ہو گئے لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جو تمہارے نظروں کے سامنے مر گیا، اُس پر موت کے تمام قوانین جاری ہو گئے، خبردار! نہ اسے زبان سے مُردہ کہو اور نہ ہی اسے اپنے دل و دماغ کے کسی حاشیۂ خیال میں مُردہ گمان کرو کیونکہ جو اللہ کی راہ میں اُس کی رضا اور اُس کے دین کی سربلندی کے لیے موت کو گلے لگا چکے ہیں، اِس عارضی موت کے صلے میں انہیں حیاتِ دوام نصیب ہو گئی۔ اس ''قتل فی سبیل اللہ'' کی تفصیل حدیث پاک میں ہے:

رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: ''ایک شخص شجاعت کے جوہر دکھانے کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص (اپنے قبیلے، خاندان اور گروہ کی) عصبیت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص ناموری (اور شہرت) کے لیے لڑتا ہے، (یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم!) ان میں سے ''فی سبیل اللہ'' کون ہے؟۔ آپ ﷺ نے فرمایا: (صرف وہ) ''فی سبیل اللہ'' ہے، جو (محض) اس لیے لڑا کہ اللہ کا کلمہ (یعنی اللہ کا دین) غالب ہو جائے''۔(صحیح مسلم:4914)

سورۃ العادیات کی ابتدائی پانچ آیات میں مجاہد جس گھوڑے پر سوار ہو کر میدانِ جہاد میں کفر کے مقابل لڑتا تھا، اللہ تعالیٰ اُس گھوڑے کے ہانپتے ہوئے دوڑنے، سموں سے چنگاریاں نکالنے، علی الصباح دشمن پر حملہ کرنے، قدموں کی ٹاپ سے غبار اڑانے اور دشمن

کی صفوں میں گھس جانے، الغرض اُس گھوڑے کی سب اداؤں کی قسم فرماتا ہے، تو ذرا سوچیے کہ جب مجاہد کا گھوڑا اللہ تعالیٰ کو اتنا محبوب ہے، تو بارگاہِ اُلوہیت میں خود مجاہد کی محبوبیت کا عالم کیا ہوگا۔

اِسی ''مقتول فی سبیل اللہ'' کو قرآن، حدیث اور فقہ کی اصطلاح میں ''شہید'' کہا جاتا ہے۔ شہید کا درجہ اس لیے بلند ہے کہ وہ اپنی سب سے قیمتی متاع، متاعِ حیات کو راہِ خدا میں قربان کر دیتا ہے، علامہ اقبال نے کہا تھا:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

یعنی حقیقت حیاتِ دنیا دی سود و زیاں کے تصور سے بالاتر ہے، کبھی جان کا سلامت رہنا زندگی کہلاتا ہے اور کبھی جان کو ''جاں آفریں'' کے سپرد کرنے کا نام حیات ہے، بلکہ حیاتِ دوام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ''قتل فی سبیل اللہ'' (یعنی شہادت) کو اپنی پسندیدگی کی معراج عطا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''اگر میری اُمّت پر دشوار نہ ہوتا تو میں کسی سَرِیَّہ (مجاہدین کی چھوٹی مُہمات) سے بھی پیچھے نہ رہتا اور میری تو تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں''۔ (صحیح بخاری: 36)

اس حدیث پاک میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی تمنا کا اختتام شہادت پر فرمایا ہے لیکن چونکہ اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کی حفاظت کا وعدہ فرمایا تھا، اس لیے آپ کی شہادت ممکن نہ تھی، مگر آپ نے شہادت کی تمنا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو سِرّی شہادت نصیب فرمائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حسن (رضی اللہ عنہ) کے جسم کا بالائی حصہ یعنی سینے سے سر تک اور حسین (رضی اللہ عنہ) کے جسم کا زیریں حصہ رسول اللہ ﷺ کے جسمِ مبارک سے زیادہ مشابہ تھا''۔ (ترمذی: 3779)

اور رسول اللہ ﷺ کے یہ دونوں شہزادے شہید ہوئے اور ان کی شہادت کو بعض

علمائے کرام نے رسول اللہ ﷺ کی سرّی اور معنوی شہادت سے تعبیر کیا ہے۔ آپ ﷺ نے اسی لیے فرمایا تھا کہ سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا میرے وجود کا حصہ ہے اور حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کے بارے میں فرمایا: "یہ دونوں میرے جنت کے پھول ہیں"، اور آپ ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے:

"حسین مجھ سے ہیں اور میں حسین سے ہوں"۔ ارشادِ نبوی ﷺ کے یہی معنی مراد لیے گئے ہیں کہ امام حسین رضی اللہ عنہ میرے نسب سے ہیں اور میرے کمالات کا ظہور حسین سے ہوگا"۔

اور ظاہر ہے کہ اِن فیوض وکمالاتِ نبوت میں سے ایک شہادت بھی ہے۔ شاعر نے شہید کے اِسی جذبے اور تمنا کو اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا کہ:

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یعنی میں نے اپنی متاعِ عزیز یعنی جان تو بلاشبہ جاں آفریں کے سپرد کر دی، لیکن حق تو یہ ہے کہ اس سے بھی حق ادا نہیں ہوا۔ کیونکہ یہ جان تو اسی خالق و مالک کی دی ہوئی امانت تھی، جو میں نے اُسے لوٹا دی۔ بندے کا کمال تو یہ ہوتا کہ ایک جان کے بدلے میں سو جانیں نچھاور کرتا، مگر وہ کہاں سے لاتا۔ حیات و موت کا خالق تو وہی ہے۔

11 نومبر 2013ء

کاش کہ ایسا نہ ہوتا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے:

''بنی اسرائیل کے اُمورِ سیاست (یعنی اجتماعی نظم اور عدلِ اجتماعی کے معاملات) انبیائے کرام انجام دیتے تھے، جب ایک نبی کا وصال ہو جاتا، تو دوسرا نبی اُن کی جگہ لے لیتا (اور یوں مُعاشرتی صلاح وفلاح کا نظام کسی تعطُّل کے بغیر جاری وساری رہتا)، مگر اب یہ اَمر قطعی ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، سو تم میں خُلفاء ہوں گے''۔

(صحیح بخاری:3455)

اِس حدیثِ پاک سے معلوم ہوا کہ سیاست شِعارِ نبوت ہے، ایک مُقدّس سماجی فریضہ ہے اور اِس کے بغیر مُعاشرے کے دینی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اَخلاقی نظم میں توازن قائم نہیں رہتا اور معاشرہ افراتفری اور اَنارکی یعنی لاقانونیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی کو آج کل کے عرف میں جنگل کا قانون یا دہشت وفساد کے راج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ سیاست کے شعبے میں پے دَرپے ایسے عناصر آئے کہ سیاست گالی بن گئی، سیاست کو بدعنوانی، مفاد پرستی، اقربا پروری اور دھوکے بازی کے ہم معنیٰ سمجھا جانے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے سیاست دان، یہ جاننے کے باوجود، کہ ملک کے درپیش حالات اور دستیاب وسائل میں ان دعووں پر پورا اُترنا اور ان وعدوں کا ایفا عملاً ممکن نہیں ہے، اپنی انتخابی مُہم اور انتخابی منشور میں بلند بانگ دعوے اور وعدے کرتے ہیں۔

آج کل جب کوئی کسی سے کہتا ہے کہ ''مجھ سے سیاست نہ کرو''، تو اُس کی مراد یہ ہوتی ہے

کہ مجھے دھوکا نہ دو اور مجھ سے جھوٹ نہ بولو۔ یہ ہمارے معاشرتی زوال اور اَخلاقی تنزُّل کی اِنتہا ہے۔ یہ سطور لکھنے پر میں اِس لیے مجبور ہوا کہ حال ہی میں ہمارے مذہبی سیاست دان بھی آپے سے باہر ہو گئے اور دین کی حساسیت اور نزاکتوں کو خیر باد کہہ دیا۔ امریکا دشمنی اور امریکا سے نفرت مُسلّم اور اُس کا جواز بھی موجود ہے، لیکن کیا اِظہارِ نفرت وعداوت کے لیے ہماری بولیاں اور لُغتیں اتنی بانجھ ہو گئی ہیں کہ ہمیں اِظہارِ نفرت کے لیے الفاظ نہیں مل پا رہے اور اِس کے لیے شہادت اور شہید کے مُقدّس شِعار کو استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہمارے عوام وخواص میں اگرچہ بے عملی اور بے حمیتی در آئی ہے، مگر اِس کے باوجود دین اور دینی شعائر کے بارے میں حسّاسیت موجود ہے۔ ایسی بات کیوں کہی جائے کہ بعد میں دُور اَز کار تاویلات کا سہارا لینا پڑے۔

ہمارے یہاں شہادت کا اعزاز عطا کرنے کا حق لوگوں نے دینی ترجیح اور معیار کو نظر انداز کر کے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، چنانچہ اپنا بندہ دو چار قتل کے بعد بھی مارا جائے، تو شہید ہے اور فریقِ مخالف مظلوم بھی ہو تو ہماری نفرتوں کا مستحق ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِن لوگوں کی جاری کردہ شہادت کی اسناد مقتولین کے کفن یا تابوت میں رکھی جائیں گی اور اُس پر اُن کی جزا وسزا کے فیصلے ہوں گے۔ لِلّٰہ! یہ شِعار چھوڑ دیجیے۔ کون عصبیّت جاہلیت پر مرا، کس نے دولت کی خاطر جان دی، کس کو اپنی شجاعت کے جوہر دکھانے تھے اور کس کو ناموری مطلوب تھی اور کس نے "فی سبیل اللہ" جان دی، یہ سب فیصلے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ہوں گے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اللہ خیانت کرنے والی نگاہوں اور دلوں میں چھپے رازوں کو خوب جانتا ہے۔ (غافر:19)

ہم زیادہ سے زیادہ ظاہر حال پر بات کر سکتے ہیں، لیکن اُس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حدود کی پاسداری ہونی چاہیے۔ دینی شعائر، علامات، اصطلاحات اور مناصب کے اِطلاق (Application) میں اِبتذال (Vulgarity) کا انداز اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اکابر علمائے دیوبند دو سال پہلے جامعہ اشرفیہ لاہور میں تین روز تک بند کمرے میں اجلاس کے

بعد ایک اجتماعی بیان جاری کر چکے ہیں، جس میں واضح طور پر یہ قرار دیا گیا تھا کہ اسلامی ریاست میں نفاذِ شریعت کی مسلح جدوجہد جائز نہیں ہے۔ جمعیت علمائے اسلام کے رہنما مولانا فضل الرحمن اور جماعتِ اسلامی کے سابق امیر قاضی حسین احمد بھی ایک سے زائد بار یہ پالیسی بیان جاری کرتے رہے ہیں۔ یعنی موجودہ دَور میں پُرامن اور جمہوری طریقوں ہی سے شریعت کا نفاذ ممکن ہے۔ اس کے علاوہ متبادل ہر راستہ فساد و انتشار کا باعث بنتا ہے۔ اس لیے اس امر کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ جن لوگوں نے خلوصِ نیت ہی سے سہی جو متبادل راستے اختیار کیے، ان کا انجام کیا ہوا۔ مابعد نتائج (Subsequences) کے اعتبار سے امت کو فائدے زیادہ حاصل ہوئے یا نقصانات، اس کا کوئی نہ کوئی تخمینہ یا زائچہ (Balance Sheet) ضرور مرتب ہونی چاہیے۔

میں بارہا یہ عرض کر چکا ہوں کہ ہم ایک مشکل صورتِ حال سے دوچار ہیں، جس میں پورا سچ بولنا اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔ گزشتہ سالوں میں مختلف NGOS نے مختلف مسالک کے علما اور یونیورسٹی کے پروفیسروں کو جمع کر کے مکالمے (Dialogues) کرائے، علمی، فکری اور تحقیقی نشستیں منعقد ہوئیں اور پھر ان کے نتائج کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ اُن میں بڑے معتبر نام بھی شامل رہے ہیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ لوگوں نے خروج اور خوارج کا حکم تو بیان کر دیا، مگر اپنے ملک کے داخلی تناظر میں اس کا مصداق کون ہے اور اس کا حکم کیا ہے؟۔ یہ نہیں بتایا، کیوں کہ یہاں آ کر سب کے پَر جلتے ہیں۔ میں نے ان NGOS سے کہا کہ جب اپنے ملک کے داخلی تناظر میں اس کا اطلاق نہیں کرنا تو اس ساری مشق کی ضرورت یا افادیت کیا رہ جاتی ہے اور اس پر جو وسائل خرچ ہوئے، اُن کا عملی زندگی میں ماحَصَل (Output) کیا ہے؟۔ دوسرا بہت نزاعی مسئلہ جسے متنازعہ بنا دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ملک کے اندر داخلی انتشار و فساد اور تمرُّد (Insurgency) کو کنٹرول کرنے کے لیے ہمارے قومی سلامتی کے ادارے امن وامان کے قیام کے لیے میدانِ عمل میں آتے ہیں، بعض اوقات وہ جان سے جاتے ہیں، ان کی شہادت کو بھی محلِ نزاع بنا دیا گیا

ہے۔ آپ وقت کے حکمرانوں اور مُقتدِرہ (سول اور ملٹری اسٹیبلشمنٹ) پر تنقید ضرور کریں، وہ پالیسیاں بناتے ہیں، بیرونی غالب قوتوں کے ساتھ خفیہ معاہدے کرتے ہیں اور ملک وقوم کے مستقبل کے فیصلے اپنے اقتدار کے دوام کے لیے کرتے ہیں۔ لیکن اُن سے تو آج تک کسی نے جواب طلبی نہیں کی، 9/11 کے بعد ملک وقوم کے مستقبل کا سودا کن شرائط پر ہوا، کیسے ہوا، کیونکر ہوا؟ یہ تو آج تک کسی کو معلوم نہیں ہے۔ ہماری نام نہاد ہمہ مقتدر (Sovereign) پارلیمنٹ 2002ء تا 2007ء اور پھر 2008ء تا 2013ء رہی۔ اس نے اپنی قومی ذمے داریاں پوری کیں، کسی سے حساب مانگا، جواب مانگا، عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا۔ لیکن اگر آپ سیاسی یا برسرِ زمین مصروفِ عمل فوجی جوانوں اور افسروں کو اس بات کا مکلف (Accountable) بنائیں گے کہ وہ اپنے اجتہاد سے فیصلہ کریں کہ کس کے مقابل کھڑا ہونا ہے، کس پر گولی چلانی ہے اور کس پر نہیں چلانی، تو پھر فوج کا نظم (Command & Control System) تو تباہ وبرباد ہو کر رہ جائے گا۔ ماتحت نے تو اپنے افسر کا حکم ماننا ہے۔ جواب طلبی ہر ادارے کی مقتدرہ اور اتھارٹی سے ہونی چاہیے۔

حضرت علی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (کفار کے مقابلے کے لیے) ایک لشکر بھیجا اور ان پر ایک شخص کو امیر بنایا۔ اُس (امیر) نے آگ جلائی اور سپاہیوں سے کہا کہ اس آگ میں داخل ہو جاؤ۔ کچھ لوگ (اطاعتِ امیر کو لازم سمجھتے ہوئے) اس کے لیے تیار ہو گئے، لیکن کچھ دوسرے سپاہیوں نے کہا کہ آگ سے بچنے کے لیے ہی تو ہم نے اسلام قبول کیا ہے۔ اس واقعے کو (واپسی پر) رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیان کیا گیا، تو آپ ﷺ نے، اُن مجاہدین کو جو امیر کے حکم پر آگ میں داخل ہونے کے لیے تیار ہو گئے تھے، فرمایا: اگر تم (خدانخواستہ) آگ میں داخل ہو جاتے تو قیامت تک آگ میں جلتے رہتے۔ اور دوسرے گروہ (جنہوں نے آگ میں داخل ہونے سے انکار کیا تھا) کی تحسین فرمائی اور آپ ﷺ نے فرمایا: کسی ایسے امر میں جس سے خالق کی نافرمانی لازم

آئے، مخلوق (خواہ اس کا منصب کوئی بھی ہو) کی اطاعت لازم نہیں ہے۔ اطاعتِ امیر صرف معروف میں ہے (یعنی صرف اُن امور میں جو شریعت میں جائز ہیں)''۔

(صحیح مسلم:4761)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جن منکرین زکوٰۃ سے جہاد کیا، وہ کلمہ گو تھے، اُنہوں نے صرف دین کے قطعی فریضے زکوٰۃ کا انکار کیا تھا، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: واللہ! میں اُن کے خلاف ضرور قتال کروں گا، جو فریضۂ دین اور حکم ربانی ہونے کے اعتبار سے صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں فرق کریں گے۔ پس تاریخِ اسلام سے یہ ثابت ہے کہ مجاہدین اسلام نے امیر کی اِطاعت میں تلوار چلائی اور جان قربان کرنے والے ''شہید'' کہلائے۔

''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اہلِ نہروان (یعنی ان کے عہد کے خوارج) کے بارے میں (شرعی حکم) پوچھا گیا کہ کیا وہ مشرک ہیں؟، تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: شرک سے بچنے کے لیے تو وہ اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔ پھر اُن سے سوال ہوا: کیا وہ منافق ہیں؟، اُنہوں نے فرمایا: منافق تو اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں۔ پھر سوال ہوا: امیر المومنین! تو پھر یہ کون لوگ ہیں؟، اُنہوں نے فرمایا: یہ ہمارے بھائی ہیں، جنہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے، تو ہم نے اُن کی بغاوت کی وجہ سے اُن پر تلوار اٹھائی ہے۔ اس روایت کو اس مقام پر ابن جریر اور دیگر محدثین نے بھی بیان کیا ہے''۔ (البدایہ والنہایہ لابن کثیر، جلد 5، ص:393)

اِس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین نے حکومتِ اسلامی کے باغیوں کے خلاف جہاد کیا۔ اب فُقہائے عصر کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ تمام تر مصلحتوں سے بالاتر ہو کر خالص قطعی شرعی حکم بیان فرمائیں تاکہ اُمّت کے لیے اِس مشکل اور اِبتلا میں صحیح سمت کا تعین ہوسکے۔

12 نومبر 2013ء

ضرورت ہے ایک قائد کی

ماشاء اللہ ہمارے پاس حکمران بہت ہیں، سیاست دان بھی بکثرت ہیں، جماعتوں کے رہنما بھی بیسیوں ہیں، پشتو اصطلاح کے مطابق مشران (Elders) اور چوہدری، وڈیرے، خوانین اور Gangsters بھی وافر تعداد میں ہیں، بلکہ اگر موجودہ روش برقرار رہی تو خدانخواستہ آگے چل کر یہ پیارا وطن Warlords کے حلقہ ہائے اثر میں منقسم ہوجائے گا، ریاست اور حکومت کا نام محض تعارف اور برکت کے لیے رہ جائے گا۔

آج ہمارے وطنِ عزیز کے انسانی ہجوم میں ہمیں جس نایاب انسانی جوہر اور ہیرے کی تلاش اور ضرورت ہے، تو وہ ایک قائد اور مدبّر (Statesman) ہے، جو فی الوقت بحیثیتِ قوم ہم میں مفقود ہے۔ قیادت کی خصوصیات یہ ہیں: اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل، خوداعتمادی، جرأت وجسارت، دینی، ملّی اور قومی غیرت وحمیّت، عزیمت واستقامت، فکری استحکام (Integrity) کے ساتھ ساتھ نصب العین کا تعین کرکے نفع ونقصان کی پروا کیے بغیر اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے یکسوئی ضروری ہے۔ مزید براں قوم کا غیر متزلزل اعتماد حاصل کرنے کے لیے دیانت وامانت، ایفائے عہد اور قول وفعل میں مطابقت ضروری ہے اور یہ کہ قوم کو دھوکے میں نہ رکھے، فریب نہ دے اور بلا کم وکاست قوم کے سامنے حقائق بیان کرے۔ یہ قائداعظم کی بے لوث قیادت ہی تھی کہ برصغیر کے مسلمان انگریزی استعمار اور ہندو غلبے کے باوجود پاکستان کی صورت میں ایک آزاد وخود مختار اسلامی ریاست حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن یہ قیادت کا فقدان ہی تھا کہ قائدِاعظم کا قائم کیا ہوا

پاکستان اپنی اصل شکل میں باقی نہ رہا اور 16، دسمبر 1971ء کو دولخت ہو گیا۔

آج ایک بار پھر پاکستان انتہائی حوصلہ شکن اور پیچیدہ صورتِ حال سے دوچار ہے۔ اپنا سالانہ بجٹ بنانے کے لیے ہمیں ہمیشہ بھاری خسارے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بیرونی قرضوں سے نجات حاصل کرنے کے بجائے ہمیں واجب الادا اقساط کی ادائیگی کے لیے مزید قرضوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اور اس طرح ہر سال معاشی غلامی کی زنجیروں کے آہنی حلقے (Circles of Chain) ہمارے قومی وملکی اور ملی وجود کے اردگرد کسے جاتے ہیں اور ظاہری اسباب میں ان سے نجات کی کوئی تدبیر نظر نہیں آتی۔ ملک کے داخلی قرضوں کا حجم بھی بیرونی قرضوں سے کم نہیں ہے۔ سرکاری ملازمین کے جی پی فنڈ، بہبود فنڈ، مختلف طرح کے سیونگ سرٹیفکیٹ، ڈیفنس سرٹیفکیٹ، انعامی بانڈز اور وفاقی اور صوبائی حکومتوں پر عائد مالی واجبات اور سودی واجبات یہ سب داخلی قرضے کی مختلف صورتیں ہیں۔ دفاع کے علاوہ داخلی سلامتی پر ہمارے مختلف النوع مصارف اس کے علاوہ ہیں، جن میں اداروں اور شخصیات کا تحفظ، غیر ملکی سفارت خانوں کا تحفظ، داخلی بغاوت یا خروج (Insurgency) پر اُٹھنے والے مصارف شامل ہیں۔ اس کے باوجود ہماری سرحدوں کے اندر بہت سے علاقوں پر ہماری حکومت کی عملداری (Writ) قائم نہیں ہے۔ ہماری پارلیمنٹ میں موجود مختلف جماعتوں کی خواہش ہوتی ہے کہ حکومتِ وقت کو جوش دلا کر بند گلی میں لے جائیں اور پھر اسے بے بس اور بے حال کر کے اقتدار سے محروم کر دیں، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ اس سیاسی محاذ آرائی کی قوم کو کیا قیمت چکانی پڑے گی اور یہ کہ پھر قوم کے سامنے متبادل راستہ اور حل کیا ہے؟۔ یہی وجہ ہے کہ 1958ء، 1969ء، 1977ء اور 1999ء کی سیاسی کشمکش اور خلفشار کا نتیجہ ہر بار مارشل لاء کی صورت میں برآمد ہوا۔ آزاد کشمیر کی جنگ بندی لائن (Ceasefire line) آگے چل کر لائن آف کنٹرول میں تبدیل ہوئی اور سیاچن اور کارگل سے ہاتھ دھونے پڑے۔

9/11 کے بعد تو ملک کی تقدیس، داخلی سلامتی اور قومی رازوں کے تحفظ کا کوئی

تصور ہی باقی نہ رہا۔ ملک کے ہوائی اڈے، بندر گاہیں، زمینی راستے، فضائی حدود سب کچھ امریکا کے لیے مباح کر دیا گیا۔ ہمارے ملک میں غیر ملکی جاسوس اداروں کا جال بچھا دیا گیا۔ بیرونی جاسوسوں کو تھوک کے حساب سے سفارتی ویزے کبھی دبئی میں اور کبھی اسلام آباد ائیر پورٹ پر جاری ہوتے رہے، اصلی اور فرضی ناموں کی تمیز بھی باقی نہ رہی اور نہ ہی پاکستانی ویزے کے حاملین کا کوئی اتا پتا کسی کے پاس محفوظ رہا۔ واشنگٹن میں پاکستانی سفیر حسین حقانی کے بارے میں مسلسل کہا جاتا رہا کہ وہ پاکستان میں امریکا کے سفیر ہیں۔ یہ تو سپریم کورٹ کی کارروائی (Proceedings) کے دوران معلوم ہوا کہ کئی ملین ڈالر واشنگٹن میں پاکستانی سفارت خانے کا خفیہ بجٹ (Secret Budget) تھا، جس کا کوئی حساب کتاب دستیاب نہیں، یعنی یہ ناقابلِ محاسبہ (Unauditable) بجٹ تھا۔

صورتِ حال یہ ہے کہ ہم پر تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار ملکی قوانین اور ساڑھے بارہ ہزار بین الاقوامی قوانین حاکم ہیں۔ اور آج کی دنیا کے عالمی قریہ (Global Village) ہونے کی وجہ سے عالمی گاؤں کے وڈیرے کے شکنجے سے نکلنا آسان نہیں ہے۔ اس کا اندازہ دنیا کو اس حقیقت سے بخوبی ہو گیا ہے کہ ماضی کی سپر پاورز اور استعماری طاقتوں (برطانیہ، فرانس، جرمنی بلکہ پورے یورپ) کے حکمرانوں کے ٹیلی فون اور ای میلز کی جاسوسی ہوتی رہی اور ان کی شخصی اور ریاستی معاملات میں رازداری (Privacy) ختم ہو کر رہ گئی، حالانکہ یورپ امریکا کا ہمیشہ سے اتحادی رہا ہے۔ الغرض سابق امریکی وزیرِ خارجہ ڈاکٹر ہنری کسنجر کا یہ قول بالکل درست ہے کہ اگر امریکا تمہارا دشمن ہے تو تمہیں اس سے خطرہ ہے اور اگر تم امریکا کے دوست ہو تو پھر تمہیں اس سے بہت زیادہ خطرہ ہے۔ اس کے باوجود ہم بین الاقوامی معاہدے بھی پوری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ جائزہ لیے بغیر محض رواروی میں کر دیتے ہیں اور پھر وہ ہمارے گلے کا طوق بن جاتے ہیں؛ ''نہ پائے رفتن اور نہ جائے ماندن'' والی کیفیت ہو جاتی ہے۔

پاکستانی مفادات کے حوالے سے سندھ طاس معاہدہ ناقص ہونے کی وجہ سے آج

بھارت پاکستان کو قطرہ قطرہ پانی کے لیے ترسانے کے پروگرام بنا رہا ہے اور جن دریاؤں پر بین الاقوامی قوانین اور انسانی تاریخی روایات کی رُو سے پاکستان کا مُسلّمہ حق تھا، بھارت ان پر لاتعداد آبی ذخائر (Reservoirs) یعنی ڈیم بنا رہا ہے۔ ہمارے حصے میں صرف تباہی و بربادی کے لیے سیلابی پانی رہ جاتا ہے۔ اور قومی اعتبار سے ہماری نالائقی کا عالم یہ ہے کہ ہم تباہی لانے والے اس پانی کو ذخیرہ کر کے اپنی زرعی آبادی کی بھی کوئی تدبیر نہیں کر سکے۔ یہی حال آئی پی پی معاہدوں، رینٹل پاور پروجیکٹس اور ریکوڈک پروجیکٹ کا ہوا، سپریم کورٹ کی مداخلت سے کچھ جزوی بچت ہوگئی، ورنہ رینٹل پاور پروجیکٹ کو بجلی پیدا کیے بغیر ادائیگیاں کر دی گئی تھیں، مگر میڈیا پر رونقوں اور پروپیگنڈے کے علاوہ کبھی کسی کا حقیقی معنی میں احتساب نہیں ہوا اور شاید آئندہ بھی نہ ہو سکے۔

پس ضرورت اس امر کی ہے کہ قیادت ہمت سے کام لے کر قوم کو حقائق سے آگاہ کرے، بڑی سیاسی جماعتوں کے قائدین مل کر ایک لائحۂ عمل تیار کریں اور اس کے نتائج اور ذمے داریوں کو بھی قبول کریں، کسی ایک پر لعن طعن کر کے باقی سیاسی رہنما اپنی قومی ذمے داریوں سے کنارہ کش نہ ہوں، یعنی ہمیں اس وقت اجتماعی دانش (Collective Wisdom) اور ایسی اجتماعی قیادت (Collective Leadership) کی ضرورت ہے جو نہ خود دھوکا کھائے اور نہ قوم کو دھوکا دے۔

قیصر (Roman Empire) کا سیاسی نمائندہ مدینۂ منورہ آیا اور لوگوں سے پوچھنے لگا کہ تمہارے بادشاہ کا محل کہاں ہے؟۔ صحابۂ کرام نے بتایا: ہمارے ہاں بادشاہ نہیں ہوتا، ایک امیر ہوتا ہے اور اس کا محل نہیں ہوتا، اس کا رہن سہن عام لوگوں کی طرح ہوتا ہے۔ اس نے پوچھا کہ تمہارا امیر کہاں ہے؟، اُسے بتایا گیا کہ وہ تمہیں مسجدِ نبوی میں مل جائے گا۔ اس نے دیکھا کہ امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں ننگی زمین پر اپنے بازو کو سرہانہ بنائے ہوئے لیٹے ہیں۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا، اس نے پوچھا کہ تمہارے امیر کو سیکورٹی کی ضرورت نہیں ہے؟، انہوں نے کہا: نہیں، کیوں کہ ہمارا امیر نہ دھوکا دیتا ہے اور نہ

دھوکا کھاتا ہے۔ شاید ہمیں کچھ عرصہ مشکلات سے گزارنا پڑے، لیکن فیصلے عوامی مقبولیت (Popular) کے نہ کیے جائیں بلکہ دینی، ملّی اور قومی مفاد پر مبنی فیصلے کیے جائیں، جن کے فوری اور دیرپا نتائج سے قوم کو پیشگی آگاہ کرکے ذہنی اور عملی طور پر تیار کیا جائے، لیکن اس کے لیے ہمارے حکمرانوں اور سیاسی قائدین کو اپنے آپ کو مثال بنا کر پیش کرنا ہوگا، ورنہ لفظوں کے کھیل سے قوم کا اعتماد حاصل نہیں ہوگا۔ امریکا یا اہلِ مغرب پر اعتماد کے بجائے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اپنی قوم کی اجتماعی صلاحیتوں پر اعتماد کرکے بھی دیکھ لیں، اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ بہ نسبت ماضی بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔

15 نومبر 2013ء

مسئلے کا حل موجود ہے

اس سال یومِ عاشور کو راولپنڈی میں پھر ایک بڑا سانحہ واقع ہوا، جو انتہائی قابلِ مذمت، افسوس ناک اور دردناک ہے۔ بادی النظر میں حکومت نے اس سال یومِ عاشور پر کسی بڑے المیے سے بچنے کے لیے وسیع انتظامات کیے تھے۔ بڑے شہروں میں پولیس کے ساتھ ساتھ رینجرز بھی موجود تھی اور فوج کو بھی کسی سنگین صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ہائی الرٹ رکھا گیا تھا۔ ہمارے ہاں کراچی میں پولیس اور رینجرز کی مجموعی نفری تقریباً ایک ڈویژن فوج کے برابر تھی۔ ہماری فوج پہلے ہی شمالی اور جنوبی سرحدوں پر مصروفِ عمل ہے اور ایسی صورتِ حال میں ہم بڑے پیمانے پر کسی بھی داخلی فساد اور تخریب کاری کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس کے باوجود راولپنڈی میں یہ سانحہ رونما ہوا، جس میں اَموات اور زخمیوں کی صورت میں جانی نقصان بھی ناقابلِ تلافی ہے اور مالی نقصان بھی غیر معمولی ہے۔ مالی نقصان یعنی دکانوں اور کاروباری مراکز کو منظم انداز میں آگ لگانے کی صورتِ حال چند برس پہلے بولٹن مارکیٹ کراچی کی صورتِ حال سے کافی مشابہت رکھتی ہے، جس میں پاؤڈر پھینک کر اور پٹرول کے ذریعے آگ لگانے کی وارداتیں ہوئی تھیں۔ شیخ رشید احمد نے اپنی پریس کانفرنس میں کہا کہ بوتلوں میں پٹرول کے ذریعے دکانوں کو آگ لگائی گئی اور یہ کہ آگ لگانے اور گھیراؤ جلاؤ والے لوگ اہلِ راولپنڈی کے لیے اجنبی تھے، یہی صورتِ حال سانحۂ کراچی میں رونما ہوئی تھی، لیکن ویڈیو تصویروں میں نظر آنے والے چہروں کی شناخت ناممکن نہیں تھی۔

ہمارا الیکٹرونک میڈیا ایسے مواقع پر فرقہ وارانہ تصادم اور فرقہ وارانہ منافرت کے عنوان سے پروگرام شروع کر دیتا ہے اور پھر مقابلہ شروع ہو جاتا ہے اور اس میں مختلف مسالک کے مذہبی رہنماؤں کو بلا کر بیٹھا دیا جاتا ہے، جو بھائی چارے کا بھاشن دے رہے ہوتے ہیں، لیکن بیرونی صورتِ حال اسٹوڈیوز میں جاری ہونے والے بیانات سے مطابقت نہیں رکھتی اور ایک تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذہبی لوگ اور مذہبی تنظیمیں اس ساری صورتِ حال کی ذمے دار ہیں اور پھر دیگر مقامات پر اس کا ردِ عمل پیدا ہونے کی خطرات بڑھ جاتے ہیں۔

گورنر ہاؤس کراچی میں محرم الحرام کے دوران حالات کو پرامن رکھنے کے لیے تمام مسالک کے علماء کا اجلاس منعقد ہوا۔ اہلِ تشیُّع سمیت تمام مسالک کے علماء نے یہ کہا کہ ملک میں بڑے پیمانے پر سنی شیعہ تصادم نہیں ہے۔ تمام مسالک کے لوگ شہروں، قصبوں، قریوں اور محلوں میں امن وعافیت کے ساتھ رہ رہے ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ لہٰذا جب بھی مذہبی تقریبات کے دوران فساد، قتل وغارت اور جلاؤ گھیراؤ کی صورتِ حال پیدا ہو، تو اسے دہشت گردی قرار دیا جائے اور دہشت گردی کے قوانین کے تحت اس سے نمٹا جائے۔ دہشت گردوں اور مفسدین کو مسالک، مکاتبِ فکر یا دینی وسیاسی، لسانی اور قومیتوں پر مبنی گروپوں کا تحفظ (Cover) نہ دیا جائے۔

مشکل یہ ہے کہ گزشتہ کئی عشروں سے ہمارا نظامِ حکومت عزیمت واستقامت سے عاری ہے، ہم ایک طرح سے خوف کے عالم میں ہیں، حالات سے نمٹنے کے لیے جو بھی کارروائی کی جاتی ہے وہ دفع الوقتی (Time passing) ہوتی ہے۔ ہمارے پاس کوئی پُرعزم اور دیرپا پالیسی نہیں ہوتی، ہم بحیثیت قوم امن وامان کے قیام کے حوالے سے Ventilator پر چل رہے ہیں، جو دن خیریت سے گزر جائے اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور بحیثیتِ مجموعی ہم دہشت گردوں کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔

اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ دہشت گردوں کے خلاف مذہب ومسلک کے امتیازات سے

بالاتر ہو کر کارروائی کی جائے اور اسے نتیجہ خیز بنایا جائے۔ میڈیا کی غیر معمولی آزادی کی وجہ سے بھی انتظامیہ اور سیکورٹی کے ادارے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ آج کل سی سی ٹی وی کیمروں، ویڈیو کیمروں، موبائل کیمروں اور پریس فوٹو گرافرز کی پہنچ سے بچنا کسی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ پرانے ڈی ایم جی نظام میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یعنی ڈپٹی کمشنر امن وامان کا ذمے دار ہوتا تھا اور اسے کسی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے گولی چلانے کا بھی اختیار تھا، لیکن اب ضلعی حکومت میں امن وامان کا والی وارث (Custodian) کوئی نہیں ہے، گزشتہ مقامی حکومتوں کے نظام میں ناظم کو مالیاتی اور انتظامی اختیارات تو حاصل تھے، لیکن امن وامان کے حوالے سے اس میں بھی غیر یقینی کیفیت (Uncertainty) اور کنفیوژن موجود تھا۔ اس سے قطعِ نظر کہ ہماری انتظامیہ اور سیکورٹی اداروں کے ذمے داران عوامی رائے کے مطابق نااہل، غیر ذمے دار یا خائن ہیں، اعلیٰ عدالتوں نے ان کی بے توقیری میں اضافہ کیا ہے اور باقی کی میڈیا پوری کر دیتا ہے۔ ہم عہدِ رسالت مآب ﷺ میں تو ہیں نہیں کہ ایک صحابی آکر خود یہ کہے: یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! میں نے موجبِ حد (liable to punishment) جرم کا ارتکاب کیا ہے، مجھ پر حدِ شرعی نافذ کر دیجیے تاکہ سزا کے نفاذ اور توبہ کے بعد میں آخرت کی سزا سے بچ جاؤں۔ رسول اللہ ﷺ بارہا اسے اپنے اقرارِ جرم (Confession) سے انحراف کا موقع دیتے ہیں، مگر اس کا ضمیر اسے بے قرار کیے رکھتا ہے کہ اپنے آپ کو معصیت کے اثر سے پاک کرے۔ لیکن ہم جس دور میں جی رہے ہیں، اس میں ضمیر یا تو مر چکے ہیں یا ماضی کی گمراہ امتوں کی طرح سرکش ہو چکے ہیں، جرم پر ناز کرتے ہیں اور اثر ورسوخ، مالی وسائل یا دہشت کے ذریعے سزا سے بچ جانے کو کمال سمجھا جاتا ہے اور یہ معیارِ افتخار بن گیا ہے، پس ہم ایسی صورتِ حال میں نہیں ہیں کہ عدل وانصاف کے آئیڈیل معیارات کے تحت مجرم کو پکڑا جا سکے، قانون کے شکنجے میں کسا جا سکے اور عبرت ناک سزا دی جا سکے۔ جج، گواہ، سیکورٹی کے ضامن ادارے سب خوف کے عالم میں رہتے ہیں، کیونکہ ریاست وحکومت

اُن کے تحفظ میں ناکام ہے۔

اس صورتِ حال سے نکلنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ نظامِ اقتدار میں شامل تمام لوگ (حزبِ اقتدار و حزبِ اختلاف) ایک قطعی اور حتمی فیصلہ کریں اور پھر یک جا یک سُو ہو کر اُس پر عمل درآمد کریں اور نتائج کی ذمے داری بھی سب قبول کریں اور کسی بھی ممکنہ ردِ عمل کی صورت میں سب ایک ہی صف میں کھڑے نظر آئیں اور ایک دوسرے کے لیے منافقت کو اپنے دل میں جگہ نہ دیں، ورنہ منظر کچھ یوں ہوگا کہ:

"(اے مخاطب!) تم ان کو (بظاہر باہم) اکٹھے سمجھتے ہو حالانکہ (حقیقت یہ ہے کہ) ان کے دل جدا جدا ہیں"۔ (الحشر: 14)

جہاں تک اس مطالبے کا تعلق ہے کہ سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ کی سطح پر اس سانحے کے حقائق معلوم کرنے کے لیے عدالتی تحقیقاتی کمیشن قائم کیا جائے، ایسے تمام مواقع پر یہ ہمارا روایتی مطالبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ حکومت پنجاب نے لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سے استدعا بھی کردی ہے کہ وہ اس سانحے کی تحقیقات کے لیے ہائی کورٹ کے ایک سینئر جج کا تقرر کریں۔ کیا یہ امرِ واقع نہیں کہ ماضی میں ایسے کئی تحقیقاتی کمیشن قائم ہوئے، مگر ان کا کوئی عملی نتیجہ برآمد نہیں ہوا، قریب ترین تحقیقاتی کمیشن ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کی موجودگی اور امریکیوں کے ہاتھوں ان کے قتل اور پھر لاش کو لے جانے کے بارے میں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کمیشن کی رپورٹ تقریباً دس ہزار صفحات پر مشتمل ہے، لیکن جو اقتباسات غیر سرکاری طور پر سامنے آئے ہیں، ان کی رُو سے بھی نہ کسی کو ذمے دار ٹھیرایا گیا اور نہ ہی کسی کے خلاف مقدمہ قائم کرنے کی سفارش کی گئی۔ لہٰذا اس طرح کے تمام کمیشنوں کی رپورٹیں تجریدی (Abstract) قسم کی ہوتی ہیں اور آخر میں داخل دفتر کردی جاتی ہیں۔ یا تو مجوزہ کمیشن کے Terms of Reference یعنی دائرۂ کار کو حقائق جاننے (Facts Finding) تک محدود نہ کیا جائے بلکہ اس کے پاس یہ اختیار ہو کہ اپنے آپ کو ٹرائل کورٹ میں تبدیل کرسکے۔ کیونکہ بالفرض مجوزہ کمیشن کسی فرد یا افراد کو اس کا

ذمے دار قرار دیتا ہے اور اس پر مقدمہ دائر کرنے کی سفارش کرتا ہے، تو مقدمہ پھر اے بی سی سے یعنی از سرِ نو شروع ہوگا اور تب تک صورتِ حال بدل چکی ہوگی۔ اگر سانحۂ بولٹن مارکیٹ کراچی کی مکمل اور جامع تحقیقات کر کے ذمے داروں کا ٹرائل کیا گیا ہوتو شاید سانحۂ راولپنڈی رُونما نہ ہوتا۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ دونوں متاثّرہ فریق اپنے اپنے اِدّعا (Claim) کے مطابق بے قصور ہیں اور دونوں کا مطالبہ ہے کہ یہ سازش ہے۔ مولانا سمیع الحق نے کہا ہے کہ یہ داخلی اور خارجی سازش ہے، تو لازم ہے کہ اس کی تحقیق جامع، مکمل اور ہمہ جہت ہو اور دونوں فریق اس کے ساتھ مکمل تعاون کریں۔

18 نومبر 2013ء

قیامت کا منظر

قیامت کا قائم ہونا حق ہے اور اس کا قطعی علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ کتبِ حدیث میں ''باب الفِتَن'' اور ''اَشراط الساعۃ'' کے عنوان کے تحت محدّثینِ کرام نے ایسی احادیث درج کی ہیں، جنہیں ایسی علاماتِ قیامت قرار دیا گیا ہے، جن کا ظہور قیامت سے پہلے ہوگا، خواہ ایک ایک کر کے ہی کیوں نہ ہو اور ظاہر ہے کہ قیامت سے پہلے یہ سب علامتیں جمع ہو جائیں گی، کچھ علاماتِ قیامت کا تعلق تکوینی امور سے ہے، یعنی نظامِ کائنات کا درہم برہم ہو جانا، سورج کی بساطِ نور لپٹ جانا، ستاروں کا بکھر جانا، پہاڑوں کا دھنکی ہوئی روئی کے بگولوں کی طرح اُڑنا، ہر ذی حیات کا فنا ہو جانا اور یہ مدوّر زمین (Rounded) ہموار اور مُسطّح (Flat) میدان کی طرح ہو جائے گی اور پھر میزانِ عدل قائم ہوگا۔

قیامت سے پہلے ان احادیثِ مبارکہ کا قطعی مصداق تو ہم کسی ایک چیز یا عنوان کو نہیں ٹھہرا سکتے۔ لیکن جب ہم اپنے گرد وپیش پر نظر ڈالتے ہیں، تو بہت سے حقائق و واقعات ایسے ہیں جو قیامت کا منظر پیش کرتے ہیں اور یہ قیامت خیز منظر ہمارا اپنا پیدا کیا ہوا ہے۔ پس حقیقی قیامت تو اللہ تعالیٰ کے امر کے مطابق جب آنی ہے، یقیناً آئے گی۔ لیکن ہم نے اپنی انفرادی اور اجتماعی بداعمالیوں، بے تدبیریوں اور خدا فراموشی کے سبب قیامت برپا کر رکھی ہے۔ بعض احادیثِ مبارکہ ہمارے حالات پر پوری طرح منطبق ہوتی ہیں، لہٰذا ان کا بغور مطالعہ کیجیے اور عبرت حاصل کیجیے اور اگر ہو سکے تو ان حالات سے نجات کے لیے کوئی حکمتِ عملی مرتب کیجیے یا کوئی تدبیر کیجیے۔ ذیل میں تنبیہ اور عبرت کے لیے چند

احادیثِ مبارکہ درج کی جا رہی ہیں:

(۱) رسول اللہ ﷺ سے ایک اعرابی نے پوچھا قیامت کب آئے گی؟۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرو، پھر سوال ہوا: یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! امانت کیسے ضائع ہوتی ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: جب مسلمانوں کے (ملکی اور ملّی) امور کا اختیار نااہلوں کو سپرد ہو جائے تو قیامت کا انتظار کرو''۔

(صحیح بخاری:6496)

(۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تمہارے سربراہان تم میں سے بہترین لوگ ہوں اور تمہارے اجتماعی معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں، تو تمہارا زمین کے اوپر رہنا زمین کے نیچے چلے جانے سے بہتر ہے اور جب تمہارے اربابِ اختیار تم میں سے بدترین لوگ ہو جائیں اور تمہارے مال دار بخیل ہو جائیں اور معاملات کی باگ ڈور عورتوں کے ہاتھ میں چلی جائے تو تمہارا زمین کے اندر چلے جانا زمین کے اوپر رہنے سے بہتر ہے۔

(سنن ترمذی:2266)

(۳) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب قومی خزانے کو ذاتی دولت بنا لیا جائے اور قومی امانتوں کو غنیمت سمجھ کے لوٹا جائے اور زکوٰۃ کو تاوان سمجھ کر دینے سے انکار کر دیا جائے اور دین کا علم دنیا سنوارنے کے لیے حاصل کیا جائے اور ایک شخص اپنی بیوی کا فرمانبردار اور ماں کا نافرمان ہو جائے اور اپنے دوست کو قریب کرے اور باپ کو دُور رکھے اور مسجدوں میں آوازیں بلند ہونے لگیں (یعنی جھگڑے ہوں) اور قبیلے کا سردار ان کا بدترین شخص بن جائے اور قومی امور کا نگران کمینہ شخص بن جائے اور (معاشرے میں) کسی شخص کی عزت (اس کے علم، کردار یا شرافت کی بنا پر نہیں بلکہ) اس کے خوف سے کی جائے، گانا گانے والیاں اور آلاتِ غنا عام ہو جائیں اور شراب (سرِ عام) پی جائے اور اس امت کے بعد کے ادوار والے اوّلین دور والوں پر لعن طعن کریں، تو (ایسے حالات میں) سرخ ہواؤں اور زلزلے اور زمین میں دھنس جانے اور صورتیں بگاڑی جانے اور سنگ باری (ایسی

بربادیوں) کی پے در پے علامات کا انتظار کرو، جیسے ایک تسبیح کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے سارے دانے پے در پے گرتے ہیں"۔ (ترمذی: 2211)

صورتوں کے مسخ ہونے کی ایک شکل تو وہ ہے جیسے بنی اسرائیل کو ان کی سرکشی اور ہٹ دھرمی کی وجہ بندر اور خنزیر بنا دیا گیا اور ایک یہ ہے کہ اقوامِ عالم کے درمیان بے توقیر ہو جاؤ اور تمہارے لیے کوئی مقامِ افتخار باقی نہ رہے، بقول شاعر:

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں، جنہیں تصویر بنا آتی ہے

ہمارے لیے مقامِ غور ہے کہ کیا آج ہمارے معاشرے میں کردار، دیانت، شرافت، امانت، علم اور تقویٰ عزت وافتخار کا باعث ہے یا حدیثِ پاک کی رُو سے دہشت گردی، ضرررسانی اور خوف زدہ کرنے کی صلاحیت باعثِ تکریم ہے۔

(۴) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: "جس قوم میں خیانت غالب آجائے تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں دشمن کا رُعب ڈال دیتا ہے اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرے، اس کے رزق میں تنگی آجاتی ہے اور جو قوم حق کے خلاف فیصلے کرے تو اس میں خون ریزی عام ہو جاتی ہے اور جو قوم عہد شکنی کرے تو اس پر دشمن غالب آجاتا ہے"۔

(مؤطا امام مالک، ص: 476)

(۵) آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ عام لوگوں کو کسی خاص شخص (یا طبقے کی بدعملی) کی سزا نہیں دیتا، مگر جب وہ عام لوگ اپنے درمیان برائیوں کو پنپتا ہوا اور پھیلتا ہوا دیکھیں اور ان کو روکنے کی (اجتماعی) قوت کے باوجود نہ روکیں، تو پھر اللہ تعالیٰ سزا کو سب کے لیے عام کر دیتا ہے"۔ (مشکوٰۃ)

(۶) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ جبرئیل علیہ السلام کو حکم فرماتا ہے کہ فلاں بستی کو اس کے رہنے والوں سمیت اُلٹ دو، جبرئیل امین عرض کرتے ہیں، اے پروردگار! اس بستی میں تیرا فلاں (انتہائی متقی) بندہ ہے، جس نے کبھی پلک جھپکنے کی مقدار بھی تیری نافرمانی

نہیں کی (یعنی اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟)، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اس سمیت اس بستی کو الٹ دو، کیونکہ میری ذات کے بارے میں کبھی بھی اس کا چہرہ غضب ناک (یا مضطرب) نہیں ہوا"۔ (مشکوۃ المصابیح: 5192)

حدیثِ مبارک کا مطلب یہ ہے کہ اس کے سامنے دینِ اسلام کی حدود پامال ہوتی رہیں، منکرات کا چلن عام ہوتا رہا، لیکن ان برائیوں کو روکنے کی عملی سعی تو دور کی بات ہے، اس کی طبیعت پر یہ سب کچھ گراں بھی نہیں گزرا، صرف اپنی عبادت اور ذکر و اذکار میں مشغول رہا اور اپنے حال میں مست رہا، برائیوں کو مٹانے کے حوالے سے اور معاشرے کی اصلاح کے حوالے سے ایک مسلمان پر جو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں ان کو ادا کرنے سے قطعی طور پر غافل اور لاتعلق رہا۔

(۷) نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے، لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ (قتل وغارت عام ہو جائے گی مگر) قاتل کو پتا نہیں ہوگا کہ وہ مقتول کو کس جرم میں قتل کر رہا ہے اور نہ ہی مقتول کو معلوم ہوگا کہ اسے کس جرم میں مار ڈالا گیا۔ (صحیح مسلم: 7171)

(۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جب دو مسلمان تلواریں لیے آپس میں لڑ پڑیں، تو قاتل اور مقتول (دونوں) جہنم میں ہوں گے، راوی نے عرض کی: یارسول اللہ! یہ (جہنمی ہونا) قاتل کے لیے تو ٹھیک ہے، لیکن مقتول کا کیا قصور ہے؟، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ (بھی) یقیناً اپنے مقابل کو قتل کرنے کا شدت سے آرزومند تھا"۔ (بخاری: 6875)

حدیث کا منشاء یہ ہے کہ جب دو مسلمان آپس میں لڑ پڑیں اور دونوں ہی ایک دوسرے کی جان لینے کے درپے ہوں، تو ظاہر ہے کہ کامیابی کسی ایک کو ملے گی اور ایک مارا جائے گا، مگر چونکہ ارادۂ قتل میں مقتول بھی قاتل ہی کے درجے میں ہے، لہٰذا وہ بھی سزا پائے گا، یقیناً قاتل کی سزا مقتول سے زیادہ ہوگی، لیکن مقتول بھی سزا سے بچ نہیں سکے گا۔ وہ مقتول جو کسی ظالم حملہ آور، ڈاکو یا لوٹ مار کرنے والوں یا عصمت دری کرنے والوں سے

مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان، مال یا آبرو کے تحفظ میں ظلماً مارا جائے، حدیثِ پاک کی رُو سے اسے ''شہید'' کا درجہ ملے گا۔

(۹) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی حدود میں مُداہنت (یعنی بے جا رعایت) کرنے والا یا محرماتِ شرعیہ کے بارے میں حدودِ الٰہی کو پامال کرنے والے کی مثال اس قوم کی سی ہے، جو ایک کشتی میں سوار ہوئے، بعض نچلی منزل پر چلے گئے اور بعض بالائی منزل پر چلے گئے، تو وہ شخص جو نچلی منزل پر تھا، اس نے اوپر والوں سے پانی مانگا، انہوں نے اسے تکلیف پہنچائی اور پانی دینے سے انکار کردیا، تو اس نے کلہاڑا لیا اور (دریا کا) پانی حاصل کرنے کے لیے کشتی میں سوراخ کرنے لگا، تو اوپر والے آئے اور اس سے کہا: یہ کیا کر رہے ہو؟ اس نے کہا: تم نے مجھے (پانی نہ دے کر) تکلیف پہنچائی ہے اور مجھے پانی کی ضرورت ہے، تو اگر انہوں نے (اس کی تکلیف) کا ازالہ کر کے اس کے ہاتھ روک لیے تو اسے (ڈوبنے سے) بچالیں گے اور اپنے آپ کو بھی بچالیں گے اور اگر (وہ اپنی ہٹ دھرمی پر) قائم رہے اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا، تو اسے بھی ہلاک کریں اور خود بھی ہلاک ہو جائیں گے''۔ (بخاری: 2286)

اس حدیث کا منشاء ومدّعا یہ ہے کہ جب معاشرہ ایک سرکش طبقے کے ہاتھوں تخریب کاری، دہشت گردی، قتل وغارت، فساد اور بے امنی کا شکار ہو جائے اور معاشرے کی نظمِ اجتماعی (موجودہ حالات میں ریاست وحکومت) ان کو ظلم وفساد سے نہ روکیں، ان کی سرکوبی نہ کریں اور معاشرے کو ان سے امان نہ دیں، تو انجامِ کار ہلاکت وبربادی سب کا مقدر ہوگی۔

21 نومبر 2013ء

آیئے! سچ بولنے کی کوشش کریں۔۔۔مگر؟

(پہلی قسط)

رسول اللہ ﷺ سے سوال ہوا: کیا مومن بزدل ہوسکتا ہے؟، آپ نے فرمایا: ہاں! پھر سوال ہوا: کیا مومن بخیل ہوسکتا ہے؟، آپ نے فرمایا: ہاں!، پھر سوال ہوا: کیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے؟، آپ نے فرمایا: نہیں (مومن کذاب نہیں ہوسکتا)''۔(مؤطاامام مالک،ص:732)

مومن اور کافر کے درمیان اصولی طور پر حق وباطل کا فیصلہ دلیل واستدلال سے ہونا چاہیے، لیکن جب نجران کے نصاریٰ دلیلِ حق کو سننے اور قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو فرمایا کہ آخری حجت کے طور پر ان کو مباہلے کی دعوت دیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''پس (اے رسولِ مکرم!) جو لوگ (دین کی حقانیت کا) علم حاصل ہوجانے کے بعد بھی آپ سے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کٹ حجتی کریں، تو آپ (آخری حجت کے طور پر ان سے) کہیں: آؤ! ہم دونوں فریق بلالیں اپنے اپنے بیٹوں کو، اپنی اپنی عورتوں کو اور خود بھی (کھلے میدان میں نکل آئیں)، پھر ہم مباہلہ کریں (یعنی انتہائی عاجزی کے ساتھ گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے فریاد کریں) پس جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں''۔(آل عمران:61)

اس آیت کو آیت مباہلہ (Invocation) کہتے ہیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے نجران کے وفد کو مباہلہ کے لیے بلایا، رسول اللہ ﷺ حضرت علی، سیدہ فاطمۃ الزہرا، حضرات حسنین کریمین (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کو لے کر نکلے اور فرمایا: جب میں

دعا کروں تو آمین کہنا۔ نصاریٰ کے چیف بشپ نے کہا: اے نصاریٰ کی جماعت! میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں کہ اگر وہ اللہ سے دعا کریں کہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا دے، تو اللہ ان کی دعا کو قبول کر کے پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا دے گا، سو تم ان سے مباہلہ نہ کرو ورنہ تم ہلاک ہو جاؤ گے اور قیامت تک کوئی عیسائی روئے زمین پر باقی نہیں بچے گا۔ پھر انہوں نے جزیہ دینا قبول کر لیا اور اپنے علاقے میں واپس چلے گئے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے، اللہ کا عذاب اہلِ نجران کے نزدیک آچکا تھا اور اگر یہ مباہلہ کرتے تو ان کی صورتیں مسخ کر دی جاتیں، ان کی وادی میں آگ بھڑکتی رہتی اور اہلِ نجران کو ملیا میٹ کر دیا جاتا، حتیٰ کہ درختوں پر پرندے بھی ہلاک ہو جاتے اور سال ختم ہونے سے پہلے تمام عیسائی فنا کے گھاٹ اتر جاتے''۔

(الوسیط، جلد:1، ص:444، المستدرک، جلد:2، ص:596)

اس سے معلوم ہوا کہ مباہلہ کی صورت میں بھی ہلاکت کی دعا جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجنا ہے۔ دو احادیثِ مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے منافق کی یہ نشانیاں بیان فرمائیں:

(۱) جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

(۲) جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔

(۳) جب اُس کے پاس امانت رکھی جائے، تو خیانت کرے۔

(۴) جب معاہدہ کرے تو دھوکا دے۔

(۵) اور جب جھگڑا کرے تو بدکلامی کرے اور حد سے تجاوز کرے''۔ (صحیح بخاری: 34-33)

اس حدیث کی رُو سے منافق کی سب سے پہلی نشانی جھوٹ بولنا ہے، یعنی جو کچھ دل میں ہے، زبان سے اس کے برعکس اظہار کرنا۔ لیکن بعض اوقات سچ بولنے کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب جہاد کے لیے نفیرِ عام (یعنی عام اعلانِ جنگ) کا حکم فرماتے، تو جو لوگ جہاد میں جانے سے پیچھے رہ جاتے، انہیں ''مُخَلَّفِین'' کہا جاتا تھا۔

جب آپ سفرِ جہاد سے واپس تشریف لاتے، تو مسجد نبوی میں بیٹھ جاتے، حالات دریافت کرتے اور جہاد سے پیچھے رہ جانے والوں سے جواب طلبی فرماتے۔ ان میں راسخ العقیدہ اور صداقت شعار اہلِ ایمان بھی ہوتے اور منافقین بھی۔ منافقین اپنے پیچھے رہ جانے کے جواز کے لیے طرح طرح کے عذر اور بہانے تراشتے، اللہ تعالیٰ ان کی کیفیت کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

''(اے مسلمانو!) جب تم اِن (منافقین) کی طرف لوٹ کر جاؤ گے، تو وہ تمہارے سامنے طرح طرح کے عذر پیش کریں گے، (اے رسولِ مکرم!) آپ کہیے کہ تم بہانے نہ بناؤ، ہم ہرگز تمہاری بات پہ یقین نہیں کریں گے، اللہ نے ہمیں تمہارے بارے میں مطلع فرما دیا ہے اور اب اللہ اور اس کا رسول تمہارے (طرزِ) عمل کو دیکھیں گے''۔ (توبہ:94)

غزوۂ تبوک کے موقع پر جہاد سے پیچھے رہ جانے والے اَسّی (۸۰) سے کچھ زائد افراد تھے، ان میں زیادہ تر منافقین تھے، ان منافقین کے علاوہ تین مومنین صادقین صحابۂ کرام (کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ) بھی تھے، جو جہاد میں شریک نہ ہو سکے، مگر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنے پیچھے رہ جانے کے جواز کے لیے کوئی عذر پیش نہیں کیا، بلکہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا، رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں فرمایا، بلکہ وہ عتاب کا شکار ہوئے۔ پہلے مرحلے میں آپ ﷺ نے صحابۂ کرام کو ان کے ساتھ گفتگو کرنے سے منع فرمایا اور یوں وہ سب کے لیے اجنبی بن گئے (کیونکہ صحابۂ کرام کی دوستی اور دشمنی صرف اللہ اور اس کی رضا کے لیے ہوتی تھی)۔ پھر ان کی بیویوں کو بھی ان سے ملنے سے روک دیا گیا، صرف بڑھاپے کی وجہ سے حضرت ہلال بن امیہ کی بیوی کو ان کی خدمت کی اجازت دی گئی۔ یہ ان تین صحابۂ کرام کا سماجی مقاطعہ (Social Boycott) تھا۔

حضرت کعب بن مالک بیان کرتے ہیں کہ جو ہمارے قریبی رشتے دار تھے اور ہم پر

جان چھڑکتے تھے، انہیں ہم بلاتے یا سلام کرتے تو وہ سلام کا جواب تک نہ دیتے۔ اس بائیکاٹ اور معاشرتی تنہائی کے دور میں شام سے ایک شخص میرے پاس آیا اور غسان کے بادشاہ کا خط مجھے دیا، اس میں لکھا تھا: ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے صاحب نے تم پر ظلم کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تم کو ذلت اور رسوائی کی جگہ رہنے کے لیے پیدا نہیں کیا، تم ہمارے پاس آجاؤ، ہم تمہاری ہر طرح کی دل جوئی کریں گے۔ میں نے یہ خط پڑھا اور اسے تنور میں پھینک دیا، کہ یہ بھی آزمائش کا حصہ ہے۔ شدید تکلیف اور اذیت کے جب پچاس دن پورے ہوئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انہیں طلب فرمایا: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جب سے تمہاری ماں نے تمہیں جنا ہے، تمہارے لیے آج کے دن سے زیادہ بہتر دن کوئی نہیں آیا، اس مبارک دن کی تمہیں خوشخبری ہو۔ دراصل یہ ان کی توبہ کی قبولیت کا اعلان تھا۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں! میں نے عرض کی، یارسول اللہ! مجھ پر یہ کرم آپ کی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے؟، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اللہ کی طرف سے۔ اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خوش ہوتے تو آپ کا رُخِ انور چاند کی طرح روشن ہو جاتا اور ہم اس علامت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خوشی اندازہ لگا لیتے۔ حضرت کعب بن مالک نے قبولیت توبہ کی خوشی میں غزوۂ خیبر کے مالِ غنیمت کے حصے کے علاوہ اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کی قبولیت کا اعلان ان کلماتِ طیبات میں فرمایا:

"بے شک اللہ نے نبی پر فضل فرمایا اور ان مہاجرین وانصار پر (بھی) جنہوں نے انتہائی تنگی کے عالم میں نبی کی اتباع کی، جبکہ اس کے بعد یہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل اپنی جگہ سے ہل جائیں، پھر اس کے بعد اس نے ان کی توبہ قبول کی، بے شک وہ ان پر نہایت مہربان بہت رحم والا ہے اور (خاص طور پر) ان تین افراد کی توبہ بھی قبول فرمائی، جن کا فیصلہ مؤخر کر دیا گیا تھا، یہاں تک کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر

تنگ ہو گئی اور وہ اپنی جان سے بھی تنگ آ گئے اور انہوں نے یہ یقین کر لیا کہ اللہ کے سوا ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں، پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی"۔ (توبہ:118)

یہ طویل حدیث مبارک کا خلاصہ ہے اور بیان کرنے کا مدعا یہ ہے کہ سچ کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، آیئے! ہم اپنے درپیش قومی مسئلے کے بارے میں سچ بولیں اور قیمت کے لیے تیار ہو جائیں۔ (جاری ہے)

25 نومبر 2013ء

آیئے! سچ بولیں اور اس کی قیمت چکائیں

(آخری قسط)

کل میں نے قرآنِ مجید اور احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں بتایا تھا کہ غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں میں سے بظاہر جھوٹے عذر اور بہانے تراشنے والے منافقین کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا اور اُن کی آخرت کا معاملہ اللہ کی عدالت پر چھوڑ دیا گیا۔ ایک حدیثِ مبارک کا مفہوم ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے ظاہری بیان کو قبول فرمالیا، اُن سے بیعت لے لی، اُن کے لیے استغفار کی اور اُن کے باطن کا فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیا''۔ لیکن جن تین صحابہ کرام نے سچ بولا، اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا، کوئی جھوٹا بہانہ نہیں تراشا، انہیں اِبتلا سے گزرنا پڑا، اُس کا اجران کو اتنا عظیم ملا کہ اُن کی توبہ کی قبولیت کی شہادت قرآنِ کریم قیامت تک دیتا رہے گا۔

ہم نے انفرادی اور اجتماعی طور پر سچ بولنا چھوڑ دیا ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں ڈرون حملوں اور نیٹو سپلائی کے حوالے سے سیاست کی گہما گہمی جاری ہے، حالانکہ یہ کام ایک عشرے سے جاری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں چیزوں کی مخالفت مقبولِ عام نعرہ ہے۔ لیکن جب ہم الیکٹرونک میڈیا کو دیکھتے ہیں اور اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں، تو اہلِ فکر ونظر اور سیاسی جماعتیں بھی منقسم نظر آتی ہیں۔ ہمارے لبرل طبقے اور جدید ماہرین معیشت کا کہنا ہے کہ امریکا سے بگاڑ ہمارے لیے مشکلات پیدا کرے گا۔ داخلی وخارجی قرضوں کا ناقابلِ برداشت بوجھ، بین الاقوامی تجارت میں ادائیگیوں کا عدمِ توازن، اور

بے امنی وفساد کی وجہ سے معاشی بدحالی ہمیں امریکا اور مغرب کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایران کی طرح ہمارے پاس پٹرولیم کے غیر معمولی ذخائر بھی نہیں ہیں۔ ہماری برآمدات کپاس، ٹیکسٹائل، چاول، آلات جراحی اور چند دیگر اشیاء کے سوا کیا ہیں اور ان کا انحصار بھی امریکا اور یورپ پر ہے۔ بیرونی زرِ مبادلہ کا ایک ذریعۂ آمدن پاکستانی تارکینِ وطن کی مالی ترسیلات ہیں، ان کا ذریعہ بھی امریکا و یورپ اور ان کے زیرِ اثر ممالک ہیں۔

دوسری طرف راسخ العقیدہ عام مسلمانوں اور ماہرین کی رائے یہ ہے کہ غیرت مند بنو، دوسروں پر انحصار چھوڑو، قناعت اختیار کرو، چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ، اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسا کرو، اللہ تعالیٰ غیب سے مدد فرمائے گا۔ وسائل سے محروم افغانی، امریکا کو شکست دے چکے ہیں اور ہم تو دنیا کی ساتویں ایٹمی طاقت ہیں۔

پس بہتر یہ ہے کہ ہمارے سیاسی و مذہبی کے قائدین بند کمرے میں طویل اجلاس کریں۔ مختلف تدابیر اور حکمتِ عملی کا جائزہ لیں، تمام صورتوں میں نفع ونقصان کا تخمینہ لگائیں، کامیابیوں کے فوائد اور ناکامیوں کے مُضمرات کا جائزہ لیں اور ایک ملّت بن کر اپنی استعداد کا بھی حقیقت پسندانہ تجزیہ کریں۔ نہ آپس میں جھوٹ بولیں اور نہ عوامی مقبولیت کے لیے عوام کے سامنے جھوٹ بولیں۔ جس پر آپ سب کا اتفاق ہو جائے، ایک صف میں کھڑے ہو کر قوم کو ذہنی، فکری اور عملی طور پر پیش آنے والی ممکنہ مشکلات کے لیے تیار کریں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیزِ مصر کے خواب کی تعبیر یہ بتائی تھی کہ تم پر سات سال خوش حالی کے آئیں گے اور اس کے بعد سات سال قحط سالی کے آئیں گے، سو خوش حالی کے سالوں میں ضرورت سے زائد خوراک کو خوشوں میں ذخیرہ کر کے قحط کے سات سالوں کے لیے منصوبہ بندی کریں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی منصوبہ بندی اور ان کی امانت اور علم نے مصری قوم کو مشکلات سے نکالا۔

مگر ہم جس صورتِ حال سے دوچار ہیں، یہاں ابتدا میں ہمیں قوم کو مشکلات کا مقابلہ کرنے، راحتوں اور آسائشوں کی قربانی دینے کے لیے تیار کرنا ہوگا اور پورا سچ بتانا ہوگا اور

عوام کو ملّی حمیت کی قیمت چکانے کے لیے بھی آمادہ کرنا ہوگا۔

ہماری قوم مزید آسائشوں اور راحتوں کی طلب گار ہے۔ لہٰذا حکمرانوں اور سیاسی قائدین کو اپنے آپ کو رول ماڈل بنا کر پیش کرنا ہوگا اور پوری سیاسی قیادت کو اس کی ذمّے داری قبول کرنی ہوگی۔ یہ نہیں کہ کچھ لوگ اپنے حق میں نعرے لگواتے رہیں اور کچھ پر سنگ زنی ہوتی رہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس قربانی کے نتیجے میں قوم میں خود اعتمادی پیدا ہو، ہم بحیثیت قوم اپنے قدموں پر کھڑے ہوجائیں اور دو وقت کے بجائے ایک وقت کھا کر گزارہ کرنا سیکھ لیں تو پھر دوسروں کے سہارے کے بغیر اپنے وسائل پر جینے کا سلیقہ آجائے، ہم کام چوری اور کاہلی کے بجائے محنت کرنے کے عادی ہوجائیں، دیانت دار بن جائیں اور ہمارے معاشرے میں عدلِ اجتماعی قائم ہوجائے۔ حکمران اور عوام وقت کے فرعون کی غلامی کے بجائے اللہ کی بندگی اختیار کرلیں۔ مگر منفی پہلو بھی نظر میں رہے، معروف مقولہ ہے: ''بہتر کی توقع کرو، مگر بدتر کے لیے بھی تیار رہو''۔ الغرض سچ کی وہ قیمت چکانے کے لیے بھی تیار ہوجاؤ، جس کا ہمیں سامنا کرنا پڑسکتا ہے، کیونکہ

ع: اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں

یہ بھی حقیقت ہے کہ سب جماعتیں پوری طرح ہم خیال نہیں ہیں اور نہ ہی کسی اے پی سی میں گہرائی اور گیرائی کے ساتھ تمام مضمرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اے پی سی کی قرارداد کے پیچھے نہ کوئی حقیقت پسندانہ تجزیہ ہے اور نہ ہی عمیق غور وفکر۔

ڈرون حملے اور نیٹو سپلائی گزشتہ ایک عشرے سے جاری ہے، لیکن ہم اب بیدار ہوئے اور ہم نے اب اپنے آپ کو دریافت کیا ہے۔ مزید یہ کہ خیبر پختون خوا کی حکومت اور اس کے رہبر عمران خان کہہ چکے ہیں کہ وفاقی حکومت اگر مذاکرات کی کوئی تدبیر نہیں کرپا رہی تو ہم اپنی سطح پر یہ عمل شروع کردیں گے۔ وہ غیر ترئی انداز میں کام کرنے کے بجائے مذاکرات کے لیے باقاعدہ دفتر اور عملی ساخت کا مطالبہ کررہے ہیں۔ وہ بھی پاکستانی ہیں اور ان کے پاس بھی جزوی مینڈیٹ ہے، تو انہیں آزمانے میں کیا حرج ہے؟۔ چوہدری نثار علی خان

کی ساری مشق پسِ پردہ تھی اور اس کا علم انہیں کو ہے یا چند صحافی حضرات کو جو اس کے مدعی ہیں، جب کہ دوسرے اسے ہوائی باتیں قرار دے رہے ہیں۔ چوہدری صاحب نے مذہبی طبقات میں سے صرف ایک طبقے پر اعتماد کیا ہے، باقی اُن کے اعتماد پر پورے نہیں اترے۔ ہمارے علم میں دو جملوں کی اپیل ہے: ''اللہ اور رسول کا واسطہ دونوں فریق جنگ بندی کریں اور مذاکرات کا آغاز کریں''۔ تو سوال یہ ہے کہ آیا مذاکرات جرم ہیں جو چوری چھپے کیے جانے ضروری ہیں یا ڈر ہے کہ کہیں ان نادیدہ مذاکرات کو چرا لیا جائے گا۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ حکومت اپنی بے بسی اور مجبوری کا دوسرے فریق پر بھی اظہار کرے اور دونوں مل کر کوئی راستہ نکالیں۔

چوہدری نثار علی خاں پر اب آشکارا ہوا ہے کہ امریکا طالبانِ پاکستان سے ہمارے مذاکرات نہیں چاہتا اور وہ پاکستان میں امن کا خواہاں نہیں ہے، وہ کیسے ہمارا دوست ہو سکتا ہے؟ چوہدری صاحب کے علاوہ ہر صاحبِ نظر کو روزِ اوّل سے معلوم ہے کہ جنرل پرویز مشرف نے جن شرائط پر پاکستان کو امریکا کے سپرد کیا تھا، وہ یہ تھیں:

(۱) افغانستان پر حملے کے لیے زمینی وفضائی سہولتیں فراہم کرنا یعنی ہوائی اڈے اور زمینی نقل وحمل۔

(۲) خفیہ معلومات کا تبادلہ، یعنی ان کے دشمنوں کو مارنا یا پکڑ کر ان کے حوالے کرنا یا اُن کی پناہ گاہوں کی نشاندہی۔

(۳) سب سے پہلے پاکستان، یعنی امریکیوں کی جانیں قیمتی ہیں، لہٰذا ان کی سلامتی اور تحفظ کے لیے سب سے پہلے پاکستان کو قربانی کا بکرا بننا ہوگا۔ بس فرق یہ ہے کہ پاکستانی حکمرانوں اور سیاست دانوں کی نظر میں امریکا کے لیے پاکستان کی قربانی بہت زیادہ ہے، جب کہ امریکیوں کی نظر میں پاکستان اپنے پیمانِ وفا اور شعارِ غلامی پر پورا نہیں اترا، یعنی اِدھر صلہ وستائش کی کمی کی شکایت اور اُدھر توقعات یا پیمان پر پورا نہ اترنے کا گلہ۔ اور اب اکتوبر 2002ء کے گیارہ سال بعد پاکستانی حکومت اور سیاست دانوں اور اہلِ فکر ونظر میں

یہ بحث کہ یہ جنگ ہماری ہے یا امریکا کی؟ قابلِ تعجب ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں بلاشبہ یہ ہماری جنگ نہیں تھی لیکن ہم نے ڈالر اور خوف کے عوض اسے گود لے لیا، یہ جنگ کس کی ہے، اب یہ محض لفظی بحث ہے۔ ہاں! اس میں کوئی شک نہیں کہ تباہی ہماری ہے اور بہت دیر تک چلے گی۔۔امریکا چلا بھی جائے، پاکستان نے حساب چکانا ہے۔

لیکن اگر اس جنگ کے اختتام پر ہمیں طالبانِ پاکستان کی شریعت مل جائے، تو کیسا رہے گا؟۔اس کے لیے بعض لبرل ماہرین اور سیاسی قائدین ہماری پیشگی ہمدردی قبول فرمائیں اور ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں، کیونکہ اس میں ذرہ بھر شک نہیں کہ اس جنگ کے سب سے پہلے حامی یہی حضرات تھے۔

26نومبر2013ء

دسمبر 2013ء

ایں چہ بوُالعجبی ست؟

میرا بیٹا ضیاء الرحمٰن ایک خطرناک اور تکلیف دہ مرض میں مبتلا ہے۔ میں (SIUT) (Sindh Institute of Urology & Transplantation) یعنی ''ادارۂ امراضِ گردہ وانتقالِ گردہ'' میں گیا، وہاں ڈاکٹر نجیب نعمت اللہ سے ملاقات اور طبی مشورہ لینا تھا۔ وہاں پر ڈاکٹر الطاف ہاشمی اور ڈاکٹر نسیم خان سے بھی ملاقات ہوئی، انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو اس ادارے کے سربراہ عالمی شہرت یافتہ سرجن ڈاکٹر ادیب رضوی سے ملوانا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر ادیب رضوی بلاشبہ ایک لیجنڈ (اُسطوری، تخیلاتی) اور آئیڈیل شخصیت ہیں۔ وہ یقیناً ایک انسانیت نواز اور محبِ انسانیت شخص ہیں۔ ان کی دیانت، امانت، پیشہ وارانہ مہارت اور دکھی انسانیت کے درد کا درماں کرنے کے جذبے سے متاثر ہوکر ہی کئی اہلِ ثروت نے SIUT کے لیے مختلف عمارات بنا کر وقف کیں، طبی آلات فراہم کیے، مفت دوائیں فراہم کیں اور ہسپتال کے جملہ مصارف کی کفالت کر رہے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ ڈاکٹر ادیب رضوی اپنی ٹیم کے ساتھ SIUT میں روزانہ تقریباً بارہ سو بیرونی مریضوں (Out Door Patients) کا معائنہ کرتے ہیں۔ میں نے ان کی ساری ٹیم کو انتہائی مخلص، ہمدرد اور مقصد کی لگن سے سرشار پایا، ظاہر ہے کہ ماتحت عملے میں یہ خوبی ادارے کے سربراہ کے عملی نمونے سے پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ادیب رضوی نے بتایا کہ SIUT کے تحت تمام سہولتوں سے آراستہ ایک ہسپتال سکھر میں بھی قائم کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی خواہش ہے کہ پورے پاکستان

میں ایسے ہسپتال قائم ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ میری تمنا ہے کہ ہر شہری کے لیے علاج مفت ہو۔ لوگ میری اس تمنا کو مجذوب کی بڑ اور دیوانے کا خواب سمجھتے ہیں، بلاشبہ ایسے خواب دیکھنا بجائے خود ایک سعادت ہے اور فرزانوں کے دیس میں اس طرح کی باتیں کرنے والے کو لوگ دیوانہ نہیں سمجھیں گے تو اور کیا سمجھیں گے؟۔ جہاں سیم وزر، دراہم و دینار اور دولت کی پرستش ہونے لگے، دل جس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیبِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کی شمع فروزاں ہونی چاہیے۔ وہاں حرص وہوس ڈیرے ڈال دیں، تو ان کے نزدیک دکھی انسانیت کے دکھوں کا مداوا کرنے کے لیے اپنی کمائی ہوئی دولت کو لٹا دینا یا اپنی فنی مہارت بلامعاوضہ فراہم کرنا اور اپنے آپ کو تکلیف میں مبتلا کر کے دوسروں کو راحت پہنچانا، دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے؟۔

مجھے ڈاکٹر ادیب رضوی صاحب نے بتایا کہ وہ بدھ کی رات کو ٹرین سے سفر کر کے سکھر جاتے ہیں اور جمعرات کی صبح ریلوے اسٹیشن سے نکل کر سیدھا ہاسپٹل جاتے ہیں اور اپنے کام میں جت جاتے ہیں اور صبح تا شام بلاتمیز مذہب و مسلک تقریباً بارہ تیرہ سو مریضوں کو اپنی ٹیم کے ہمراہ دیکھتے ہیں، جو سندھ اور جنوبی پنجاب کے دور دراز علاقوں سے آتے ہیں، نہ صرف ان کی مرض کی تشخیص کرتے ہیں بلکہ دوا اور علاج کا بھی انتظام کرتے ہیں، پھر شب جمعہ ٹرین کے ذریعے سکھر سے کراچی کا سفر کر کے جمعۃ المبارک کی صبح SIUT کراچی میں اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جاتے ہیں اور پھر اپنے کام میں جت جاتے ہیں، نہ کسی سے صلے کی تمنا اور نہ کسی کی ستائش کی خواہش، بس وہ تو اپنے حصے کا کام کیے جارہے ہیں۔

لیکن میں اُس وقت سے اب تک سوچ رہا ہوں اور یہ خیال میرے ذہن سے نکل نہیں پاتا کہ ایک ایسا ملک جہاں کئی سرمایہ داروں کے ذاتی جہاز ہیں، جب چاہیں، جہاں چاہیں اُڑ کر پہنچ جائیں، وزرائے اعلیٰ اور مختلف سول اور دفاعی اداروں کے سربراہان کے لیے ہیلی کاپٹر چوبیس گھنٹے پرواز کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ ان سرمایہ داروں کا سرمایہ پاکستان کی سرزمین اور پاکستانیوں کے خون پسینے سے کشید ہوتا ہے، سول اور دفاعی اداروں

کے بہت سے سربراہان اور سیاست دانوں کو یہ سہولتیں اور راحتیں عوام کے ٹیکسوں سے حاصل ہیں، ڈاکٹر ادیب رضوی سندھ کے حکمرانوں اور سیاستدانوں کے ووٹروں کی تو خدمت کر رہے ہوتے ہیں، کیا ممکن نہیں کہ وزیرِ اعلیٰ سندھ یا کوئی اور دردِ دل رکھنے والا ہر جمعرات کو سکھر آنے جانے کے لیے ڈاکٹر ادیب رضوی کو اپنا ہیلی کاپٹر فراہم کردے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے، سو وہ پتھروں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت ہیں، بعض پتھروں سے دریا پھوٹ پڑتے ہیں اور بے شک بعض پتھر پھٹتے ہیں تو ان سے پانی نکل آتا ہے اور بے شک بعض پتھر اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں"۔ (البقرہ:74)

کیا وزیرِ اعلیٰ سندھ یہ نہیں کر سکتے کہ ڈاکٹر ادیب رضوی کو جمعرات کے دن صبح سویرے سکھر جانے اور سرِ شام واپس کراچی آنے کے لیے اپنا ہیلی کاپٹر فراہم کردیں یا مذکورہ بالا خوش حال طبقات یا افراد میں سے کوئی ایک بھی اپنے سینے میں ایسا دل نہیں رکھتا جو دکھی انسانیت کے لیے پسیج جائے اور نرم پڑ جائے؟

حدیثِ قدسی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے تو بھوکے انسان کی بھوک کو، لباس سے محروم انسان کی ضرورتِ لباس اور بیمار انسان کی عیادت کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا، ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے:

"اللہ عزوجل فرماتا ہے: اے بنی آدم! میں بیمار ہوا، تو تُو نے میری عیادت نہ کی اور میں پیاسا ہوا تو تُو نے مجھے پانی نہ پلایا، (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں) میں نے عرض کی اے میرے پروردگار! کیا تو بھی بیمار ہوتا ہے؟، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: زمین پر میرا کوئی بندہ بیمار ہوتا ہے اور اس کی عیادت نہیں کی جاتی، اگر وہ (یعنی بنی آدم میں سے کوئی) اس کی عیادت کرتا، تو وہ (درحقیقت) میری ہی عیادت کرتا۔ اور زمین میں کوئی میرا بندہ پیاسا ہوتا ہے اور اسے پانی نہیں پلایا جاتا، اگر اسے پانی پلا دیا جاتا، تو وہ (درحقیقت) مجھے ہی پلاتا ہے"۔ (مسند احمد:9242)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''پس وہ دشوار گھاٹی میں سے کیوں نہیں گزرا اور تو کیا جانے کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟، وہ (قرض یا غلامی کے پھندے سے کسی کی) گردن چھڑانا یا بھوک کے دن کسی قرابت دار یتیم یا خاک افتادہ مسکین کو کھانا کھلانا ہے''۔ (البلد: 14-11)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''(کسی قرابت داری یا خصوصی تعلق سے قطع نظر) ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ (عمومی) حقوق ہیں: کوئی مسلمان بھائی سلام کرے تو اس کا جواب دے اور بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کرے، اس کا انتقال ہو جائے تو جنازے میں شریک ہو، وہ دعوت دے تو اسے قبول کرے اور چھینک آنے پر وہ ''الحمدللہ'' کہے تو یہ جواب میں ''یرحمک اللہ'' کہے۔ (صحیح بخاری: 1240)

مریض کی عیادت یا بیمار پرسی یا تیمارداری سے مراد صرف یہی نہیں کہ اس کا حال پوچھ لیا بلکہ اس کی روح اور حقیقت یہ ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق اس کے مرض کے علاج، درد کے درماں اور دکھ کے ازالے کے لیے کوئی تدبیر بھی کرے۔ نہایت افسوس کی بات ہے ہم ایک ایسے معاشرے میں جی رہے ہیں جہاں الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا صفحۂ قرطاس اور ٹیلی ویژن اسکرین کی رونقوں، آب وتاب اور چمک دمک میں اضافے کے لیے رقص وغنا اور لہو ولعب کے مناظر کو انتہائی پرکشش بنا کر نوخیز نسل کی نظروں کے سامنے پیش کرتا ہے اور پھر ایسے ہی طبقات کے افراد کو اسٹار، سپر اسٹار اور ہیرو کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں نئی نسل کے ذہنوں میں یہی قدریں اور یہی نقش ثبت ہو جاتے ہیں۔ اسی کیفیت کو رسول اللہ ﷺ نے ان کلمات سے تعبیر فرمایا:

ہر بنی آدم کا زنا سے حصہ ہے، دونوں آنکھوں کا زنا اجنبیہ عورت کو شہوت کی نظر سے دیکھنا ہے اور دونوں ہاتھوں کا زنا اجنبی عورت کو شہوت کے ارادے سے پکڑنا ہے اور دونوں قدموں کا زنا تکمیلِ شہوت کے ارادے سے اجنبیہ کی طرف قدم بڑھانا ہے اور منہ کا زنا اجنبیہ کو بوسہ دینا ہے اور (ان تمام مبادیات اور محرکاتِ زنا کے بعد آخر میں) دل بدکاری کی خواہش اور تمنا کرتا ہے اور فرج اس کی تصدیق کرتا ہے یا تردید کرتا ہے''۔ (مسند احمد: 8524)

کاش کہ ہمارے معاشرے میں فکری رجحانات کے وسائل رکھنے والے (Trend Setter) کبھی تقوے، کردار، امانت ودیانت، صداقت وشجاعت، عفت وسخاوت اور خدمتِ انسانیت کو بھی تکریم کا درجہ دیں اور ان صفات کے حامل افراد وشخصیات کی تکریم اور احترام کا جذبہ ہماری نئی نسل کے ذہنوں میں بٹھائیں، کیونکہ ہمارے ہاں رقص کرنے والے، گانا گانے والے اور لہوولعب کے میلے سجانے والے تو بہت ہیں، مگر انسانیت سے محبت کرنے والے، دکھی انسانوں کو راحت پہنچانے والے، درد کے ماروں کے درد کا مداوا کرنے والے اور مصیبت زدوں کو مصیبت سے نجات دلانے والے نادر ہیں، کم یاب ہیں اور اگر معاشرے میں بے توقیری کا یہی رجحان رہا تو خدشہ ہے کہ نایاب ہوجائیں گے۔

3دسمبر2013ء

امن، جو ہم سے روٹھ گیا

امن کے معنی ہیں: ''دل ودماغ اور ماحول سے خوف کا زائل ہونا، نفس کا اطمینان، ذہن کا سکون اور دل کا قرار''، امن کے مقابل دہشت ہے، جس کے معنی ہیں: ''خوف کا طاری ہونا''، اسی کو آج کل Terror کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی آدم کے لیے نعمتِ وجود، نعمتِ حیات اور بطورِ خاص مسلمانوں کے لیے نعمتِ ایمان کے بعد سب سے بڑی نعمت ''امن'' ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جب قریشِ مکہ کو دعوتِ توحید دی، تو فرمایا:

''انہیں چاہیے کہ اس گھر (بیت اللہ) کے ربّ کی عبادت کریں، جس نے انہیں بھوک میں کھانا کھلایا اور (ہر قسم کے) خوف سے امن عطا کیا''۔ (قریش:4)

اس سے معلوم ہوا کہ بقائے حیات کے لیے خوراک انسان کی بنیادی ضرورت ہے، لیکن اگر خوف طاری ہو، تو لذیذ ترین اور محبوب ترین خوراک کو بھی انسان جب حلق سے اتارتا ہے تو کہتا ہے کہ زہر مار کیا اور شدید پیاس کی حالت میں پانی بھی حلق کا کانٹا بن جاتا ہے، بڑی سے بڑی نعمت کی لذت بھی ہوا ہو جاتی ہے۔ انسان کو دولت کے انبار جمع کرنے کی بڑی چاہت ہوتی ہے، لیکن خوف کے عالم میں یہی دولت عذاب بن جاتی ہے اور اس کے چھن جانے کا روگ کبھی کبھی جان لیوا ہو جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اہلِ مکہ کے لیے امن اور وسعتِ رزق کی دعا فرمائی تھی اور اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو بھی جائے امان قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الروم: 41 میں ایک آئیڈیل بستی کی مثال بیان فرمائی اور اس کی خصوصی صفت بھی امن واطمینان اور

وسعتِ رزق بیان فرمائی اور پھر فرمایا کہ جب اس پُرامن بستی والوں نے انعاماتِ الٰہیہ کی ناشکری کی تو اس کے وبال کے طور پر اُن پر خوف اور بھوک کو مسلط فرما دیا۔

آج پاکستان اِسی بے امنی اور فساد کا شکار ہے، آئے روز بے قصور انسانوں کی جان و مال اور آبرو کی حرمتیں سرِ عام پامال ہو رہی ہیں، کہیں مذہب و مسلک کے نام پر، کہیں زبان اور قومیت کے نام پر اور کہیں علاقائیت کے نام پر۔ اور بعض لوگ اتنے جری ہو چکے ہیں کہ اس ظالمانہ قتل و غارت کی ذمے داری بھی قبول کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو کسی شریعت یا آئین و قانون کا پابند سمجھنے کے بجائے خود کو معیار و مدارِ شریعت بنالیا ہے، ان کے نزدیک حق وہی ہے، جسے وہ حق سمجھیں۔ ناحق قتل اور ظلم و فساد پر اُنہیں نہ کوئی رنج و ملال ہے اور نہ ہی ندامت، بلکہ ماضی کی اُن اقوام کی طرح، جن کا نام ونشان ان کی سرکشی کے باعث صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا، اپنے ان کرتوتوں پر اظہارِ تفاخر کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس بے امنی اور فساد کی تخم ریزی (Seeding) کا عمل تین دہائیوں سے زیادہ پر محیط ہے، بد قسمتی سے ہمیں اس پورے دور میں ایسے حکمران ملے، جن کی ترجیحِ اوّل اپنا اقتدار رہا اور قوم و ملک کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، وطن کی سرزمین کو دنیا بھر کے جاسوسی اداروں کی آماجگاہ بنا دیا، ڈالروں کے عوض قومی اور ملکی خودمختاری بھی گروی رکھ دی گئی اور عوام کی جان و مال اور آبرو کا تحفظ صرف آئین و قانون کی کتابوں کی زیب و زینت بنا رہا۔ حکمران طبقہ، خواہ ان کا تعلق حزبِ اقتدار سے ہو یا حزبِ اختلاف سے، ایک دوسرے کے ساتھ منافقت اور پوری قوم کے ساتھ کھلواڑ کر رہے ہیں۔ وہ خود خوف میں مبتلا ہیں، جرأت و ہمت اور عزیمت و استقامت کا فقدان ہے، وہ امن کی خیرات اُن سے مانگ رہے ہیں، جو آتش بہ جاں، آتش بداماں، آتش بدہن اور آتش بدوش ہیں، ان کے پاس آگ لگانے اور جلانے کا سامان تو ہے، آگ بجھانے کا نہیں ہے۔

پوری انسانیت کی تاریخ گواہ ہے کہ امن کبھی خیرات و سوغات میں نہیں ملتا۔ تاجدارِ کائنات رحمۃ للعالمین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امن اُس وقت قائم کیا، جب

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ان تمام دشمنوں سے انتقام لینے کی پوزیشن میں تھے، جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر ظلم کے پہاڑ توڑے، ترکِ وطن پر مجبور کیا اور پھر دارالہجرت مدینہ منورہ میں بھی آپ کو چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ تین مرتبہ بڑے بڑے لشکروں کے ساتھ یلغار کی اور آخری بار عالمِ عرب کی ساری اسلام دشمن قوتوں کو مجتمع کر کے مدینۂ منور پر چڑھائی کی، جسے غزوۂ خندق یا غزوۂ احزاب کہتے ہیں۔ اس معرکے کی شدت کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

''جب کفار تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے (یعنی ہر جانب سے) تم پر حملہ آور ہوئے اور جب (دشمن کی دہشت سے) تمہاری آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے اور تم اللہ (کی نصرت کے نزول) کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے تھے، یہی وہ مقام تھا، جہاں مومنوں کی آزمائش کی گئی تھی اور ان کو شدت سے جھنجھوڑ دیا گیا تھا اور جب منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں (شک) کی بیماری تھی، یہ کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے (نصرت کا) جو وعدہ کیا تھا، وہ محض دھوکا تھا''۔

(الاحزاب:12-10)

اللہ کے بندوں نے جب اپنی تمام افرادی قوت اور مادی وسائل کو مجتمع کر کے اس کے دین کی حفاظت میں جھونک دیا اور ایثار وقربانی میں کوئی کسر نہ چھوڑی، تو اللہ تعالیٰ کا کرم متوجہ ہوا، اسبابِ غیب سے اس کی تائید مسلمانوں کو حاصل ہوئی اور دشمن جو حتمی فتح کا منظر کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، ناکام ونامراد ہو کر واپس پلٹ گیا، اللہ تعالیٰ نے اس منظر کو یوں بیان فرمایا:

''اے ایمان والو! تم اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو، جب تم پر کفار کے لشکر حملہ آور ہوئے، تو ہم نے ان پر ایک ایسی آندھی اور ایسے لشکر بھیجے، جنہیں تم نے (اس سے پہلے) کبھی دیکھا نہ تھا اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھنے والا ہے''۔ (الاحزاب:9)

کتبِ سیرت میں لکھا ہے کہ یہ محاصرہ ایک ماہ تک جاری رہا۔ پھر ایک دن اچانک

شدید زناٹے دار ٹھنڈی ہوائیں چلیں، اس طرح کی طوفانی آندھی کو مدینہ منورہ میں "بادِصبا" کہتے تھے، جو شمال سے جنوب کی جانب چلتی تھی اور اس کے برعکس چلنے والی ہوا کو "بادِ دَبُور" کہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بادِ صبا سے میری مدد کی گئی اور قومِ عاد کو بادِ دبور سے ہلاک کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں مشرکینِ مکہ کے خیمے اکھڑ گئے، اونٹ اور گھوڑے بِدک کر بھاگ گئے، دیگیں الٹ گئیں اور وہ ناکام و نامراد ہو کر واپس لوٹ گئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی تائید اور نصرت تھی، لیکن یہ نصرتِ الٰہی انہیں نصیب ہوتی ہے، جو سُود وزیاں سے بے نیاز ہو کر اپنی ساری متاعِ جاں و مال کو اللہ کے دین پر قربان کرنے کے لیے میدانِ عمل میں اتر آتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"کیا تم نے یہ گمان کر لیا ہے کہ تم (یونہی آزمائش کے مرحلے سے گزرے بغیر) جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟، حالانکہ ابھی تک تم پر ایسی آزمائشیں نہیں آئیں جو تم سے پہلے لوگوں پر آئیں تھیں، ان پر آفتیں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ (اس قدر) جھنجھوڑ دیے گئے کہ (اس وقت کے) رسول اور ان کا ساتھ دینے والے اہلِ ایمان پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ سنو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے"۔ (البقرہ:214)

یعنی تم نے اپنے حصے کا کام کر دیا اور اپنا سب کچھ راہِ حق میں قربان کرنے کے لیے میدانِ عمل میں نکل آئے ہو اور اب تم نصرتِ الٰہی کے حق دار ہو۔ پس معلوم ہوا کہ اہلِ ایمان کو اللہ کی نصرت اور اس کی جانب سے امن وسلامتی کی نعمت حاصل کرنے کے لیے ابتلا و آزمائش اور عزیمت و استقامت کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے اور اس کے لیے قوتِ ایمانی درکار ہوتی ہے، جبکہ ہمارے عہد کے حکمرانوں نے امن کا راستہ اس میں ڈھونڈا ہے کہ ہر ظالم و جابر کے سامنے ڈھیر ہو جاؤ، اُن کو جان کی امان مل جائے، خواہ ملک کا امن وسلامتی غارت ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ "امن ہم سے روٹھ گیا ہے"۔

6 دسمبر 2013ء

حقائق سے گریز کے حیلے

پاکستان میں گزشتہ ایک عشرے سے بدحالی اور شدید بے امنی کے باوجود تین شعبے ماشاء اللہ انتہائی منفعت بخش صنعت کی صورت اختیار کرتے جارہے ہیں اور پھل پھول رہے ہیں، یعنی تعلیم، صحت اور میڈیا۔ میڈیا کی مشکل یہ ہے کہ موضوعات کم ہیں اور مقابلہ سخت۔ پاکستان کا الیکٹرونک میڈیا شدید مسابقت کے ماحول میں ہے۔ ہر ٹیلی ویژن چینل کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے ناظرین کو ٹیلی ویژن اسکرین کے ساتھ جوڑے رکھے، اس کے لیے سنسنی خیز موضوعات کو ایک لازمی عنصر بنالیا گیا ہے تاکہ ناظر کے من اور تن میں سراسیمگی پھیل جائے اور جامد وساکت ہوکر اسکرین پر نظریں جمائے رکھے۔ ہمارے مایہ ناز اینکر پرسن خبر دہندہ (Infromer) کے بجائے مُصلح (Reformer) کا درجہ پا چکے ہیں، ہماری دعا ہے کہ ایسا ہی ہوجائے۔ کچھ یہی صورتِ حال کالم نگاری کی ہے، مذہبی مُصلح اب ذرا پیچھے چلے گئے ہیں، کیونکہ اب الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا کی عوام تک رسائی (Access) مسجد کے منبر یا مذہبی جلسے کے اسٹیج سے بدرجہا زائد ہوچکی ہے۔ لہٰذا اب ہمارے میڈیا کے اسٹار جہاں ہماری اجتماعی زندگی کے دیگر شعبوں کی اصلاح کا فریضہ رضاکارانہ طور پر انجام دیتے ہیں، وہاں وقتاً فوقتاً مذہب اور اہلِ مذہب کی اصلاح بھی فرماتے رہتے ہیں۔ ایک تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ شاید ہماری ساری یا بیش تر خرابیوں کی جڑ ہمارے معاشرے میں مذہب اور اہلِ مذہب کا اثر ونفوذ ہے۔ ظاہر ہے جب ہر طبقہ ناکامی اور نامرادی کا ملبہ دوسرے پر ڈالے گا تو خود ذمے داری سے بری الذمہ ہوجائے گا، حالانکہ

ہم سب کے لیے اصلاح کا سب سے سہل طریقہ اپنے اندر جھانکنا ہے، احتسابِ ذات ہے، لیکن انسان کے لیے شاید یہی کام سب سے زیادہ مشکل ہے، بقول بہادر شاہ ظفر:

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب وہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر، تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

بے امنی، ظلم وفساد، تخریب کاری اور دہشت گردی کا حل یہ ہے کہ ریاست وحکومت اسے اسلام، قوم ووطن اور انسانیت کے خلاف جرم سمجھ کر سختی سے کچل دے اور انسانیت کو قتل وغارت اور ظلم وفساد سے امان دینے کے لیے کسی مصلحت کا شکار نہ ہو، مگر ہمارے ہاں مذہبی، لسانی، علاقائی، صوبائی اور قومیتوں کا لیبل لگا کر اسے ایک طرح کا تحفظ (Cover) دے دیا جاتا ہے۔

بعض لوگوں کے نزدیک اُمّ الامراض فتویٰ ہے، لہٰذا ان کا من پسند مطالبہ یہ رہتا ہے کہ فتویٰ پر پابندی لگادی جائے اور یہ کام ریاست اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ان دانائے روزگار اہلِ دانش کو معلوم ہونا چاہیے کہ ریاست وحکومت ''دارالافتاء'' نہیں ہوتی، اس کا کام قضا ہے، اسے مختلف درپیش قومی، ملی اور ملکی مسائل کو قانون سازی، عدالتی نظام اور انتظامی اقدامات کے ذریعے حل کرنا ہوتا ہے، مگر یہ تب ہوگا جب حکومت پر فائز طبقہ ملک کو مسائل کے گرداب سے نکالنے کے لیے قوتِ ایمانی، سیاسی عزم اور جرأت کا حامل ہو، اور یہی گوہرِ مقصود ہمارے ہاں مفقود ہے۔ جب ریاست دین کی محافظ تھی تو کسی کو فتویٰ دینے کی ضرورت نہیں آئی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انکارِ ختم نبوت اور انکارِ فرضیتِ زکوٰۃ کو ارتداد قرار دے کر اُن لوگوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تھا، حتّٰی کہ منکرینِ زکوٰۃ نے زکوٰۃ کے بنیادی رکنِ اسلام کو تسلیم کرلیا اور جھوٹے مدعیانِ نبوت کا قلع قمع کردیا گیا۔ آج ریاست دین کے معاملے میں لاتعلقی کا رویہ اپنائے ہوئے ہے۔ فتویٰ، درپیش مسئلے کے بارے میں فقہی رائے (Juristic Opinion) کا نام ہے، فتویٰ کی زبان ہی یہ ہوتی ہے کہ اگر سوال میں بیان کردہ صورتِ مسئلہ درست ہے، تو اس کا شرعی حکم

یہ ہے، مُستفتی یا سائل کو جس مفتی یا عالم کی دینی ثقاہت (Authenticity) اور دیانت پر اعتماد ہوتا ہے، وہ برضا و رغبت اس کا فیصلہ مان لیتا ہے، نہ ماننا چاہے تو مفتی کے پاس ریاست یا حکومت یا قانون وعدالت کی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اس سے ضرور منوائے، سائل خود آتا ہے اور جواب لے کر چلا جاتا ہے، اس کے بعد یہ بندے اور ربّ کا معاملہ ہے۔

قضا، عدالتی منصب ہے جو ریاست کی طرف سے تفویض ہوتا ہے، جج یا قاضی کی شرعی اور قانونی ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی مدعی کے دعویٰ کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرے، عدالت میں پیش کی گئی عینی شہادتوں کا تزکیہ کرے، قرائن وواقعات کی شہادت کا جائزہ لے کر ان کے قابل قبول ہونے یا رَدّ ہونے کا فیصلہ کرے، دعویٰ صحیح ثابت ہونے کی صورت میں مدعی کو اس کا حق دلائے اور مدعیٰ علیہ پر فیصلے کو ریاست وحکومت اور قانون کی طاقت سے نافذ کرے۔ اس طرح کے قرائن بھی سامنے آئے ہیں کہ کراچی میں ''امن کمیٹی'' کے نام سے جو نیا عنصر سامنے آیا، اس میں بھی بعض فرقہ پرست عناصر اپنے مقاصد کے لیے نفوذ کر گئے تاکہ ایک تیر سے دو شکار کھیلیں۔ اور پھر جرم جب معاشرے میں نچلی سطح (Gross Root Level) تک پھیلتا ہے، تو گلی محلے کی سطح تک آزاد گروہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

ہمیں جب کوئی موضوع نہیں ملتا تو مذہب اور اہلِ مذہب کی مشکیں اور نٹ بولٹ (Nut Bolt) کسنا شروع کر دیتے ہیں، انہیں کوستے ہیں۔ اگر حکومت میں دم ہے تو حقائق سے گریز کے حیلے چھوڑ دیے اور بلا امتیازِ مذہب ومسلک دہشت گردوں، قاتلوں اور ظالموں کو عبرت ناک سزا دے کر کیفرِ کردار تک پہنچائے۔ اور جرم کو جو بھی تحفظ (Cover) دینا چاہے، اس کی پروا نہ کرے۔ ظاہر ہے کسی نہ کسی کو تو ناراض کرنا پڑے گا، مگر یہ مشکل کام ہے۔ سب سے آسان کام میڈیا کی عدالتیں ہیں جہاں چالیس منٹ میں رپورٹنگ، تجزیہ اور تحقیق کے تمام مراحل مکمل ہو جاتے ہیں، لیکن اگلی صبح ہم کولہو کے بیل کی طرح وہیں کھڑے رہتے ہیں، جہاں کل تھے۔

دینِ اسلام ایک حقیقتِ ثابتہ کا نام ہے، اس میں کچھ مسلَّمہ عقائد ہیں، ارکان ہیں اور عبادات واحکام ہیں، دین کا جو بھی حکم کسی قَطعِیُّ الثُّبوت اور قَطعِیُّ الدَّلالت حکمِ شرعی کا انکار کرے گا، ہم کہیں گے، اگر یہ دعویٰ یا الزام درست ہے تو ایسا کرنے والا اسلام سے خارج ہے۔ ہمارے لبرل دانشور ہمیں بتائیں کہ کوئی خدا کو نہیں مانتا یا قرآن کو نہیں مانتا یا رسول کو نہیں مانتا یا آخرت کو نہیں مانتا یا نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو نہیں مانتا یا خنزیر کو حرام نہیں مانتا، تو آپ اسے کیا کہیں گے کہ آپ بہت اچھے مسلمان ہیں کوئی حرج نہیں، یا کہیں گے انسان اللہ کی ہستی، قرآن مجید، رسالت اور آخرت پر ایمان لائے بغیر بھی مسلمان رہتا ہے، ارکانِ اسلام پر بھی ایمان ضروری نہیں ہے، اس کے بغیر بھی آپ، اچھے مسلمان بن سکتے ہیں، سو بنیادی مسئلہ یہ ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ کسی شخص کی طرف جو بات منسوب کی گئی ہے، وہ فی الواقع اس نے کہی ہے یا نہیں، یہ مفتی کا منصب نہیں ہے، یہ قضا کا منصب ہے۔

پاکستان کی پارلیمنٹ نے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم جیسے مغربی تعلیم یافتہ، ترقی پسند اور سوشل ازم کے نام پر اقتدار میں آنے والے وزیر اعظم کے عہدِ حکومت میں ساتویں آئینی ترمیم مکمل اتفاقِ رائے سے منظور کی، جس کی رُو سے عقیدۂ انکارِ ختمِ نبوت کو کفر وارتداد قرار دیا گیا اور اس کے نتیجے میں قادیانیوں کے دونوں گروپوں کو کافر قرار دیا گیا، لہٰذا یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو گیا اور اس پر کسی کو فتویٰ بازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب مسئلہ صرف یہ ہے کہ قادیانی پاکستانی کی حیثیت سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کا احترام کریں اور اپنے آپ کو غیر مسلم تسلیم کریں۔ تمام مسلم وغیر مسلم پاکستانیوں کی طرح ان کو جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ کے یکساں حقوق حاصل ہیں۔ وہ اپنی عبادت گاہ کو مسجد کا نام نہ دیں، اس کے علاوہ جو نام وہ مناسب سمجھیں اختیار کر لیں۔ دیگر غیر مسلموں کی طرح انہیں بھی اپنی عبادت گاہ میں اپنے مذہب کے مطابق عبادت کا آئینی وقانونی تحفظ ملے گا۔

9 دسمبر 2013ء

مذاکرات کی شامِ غریباں

محرم الحرام کا مہینا تھا، چوہدری نثار علی خان، عمران خان اور چند باخبر صحافی حضرات کی روایت کے مطابق سات ہفتوں کی شب وروز کی کاوشوں سے راہ ہموار کرنے کے بعد مذاکرات کا ڈول ڈالا ہی جانے والا تھا کہ امریکا نے ڈرون حملہ کرکے مذاکرات کا قتلِ عام کردیا، یہ بہت بڑا اجتماعی نقصان (Collateral Damage) تھا، جس کی تلافی اگر ناممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور ہے۔ چوہدری نثار علی خان نے مذاکرات کے ظالمانہ قتل کی انتہائی اثر انگیز ''شامِ غریباں'' منائی، جسے ٹیلی ویژن چینلز پر ایک دنیا نے دیکھا۔ چوہدری صاحب ماشاء اللہ ایک اچھے خطیب ہیں اور الفاظ کو اپنے تن بدن بلکہ مَن پر بھی طاری کرکے اپنے خطاب کے تاثر کو دوآتشہ بلکہ سہ آتشہ کردیتے ہیں، ان کے چہرے کا تاثر اُن کے الفاظ سے بھی زیادہ پُرتاثیر ہوتا ہے۔ اگر وہ یومِ عاشورہ کو شامِ غریباں کی خطابت والوں میں ہوتے تو مقبولیت (Rating) میں نامی گرامی خطبا کو پیچھے چھوڑ دیتے، خطابت کے ہنگام ان کی بدن بولی غضب ڈھانے والی ہوتی ہے۔

ہم جیسے سیاستِ دوراں سے نابلد لوگوں کے لیے مقامِ حیرت واستعجاب یہ ہے کہ یہ نیک کام اور اعلیٰ قومی مشن چوری چھپے کیوں ہو رہا تھا، کیا مذاکرات کاروں کو پہلے ہی سے ان کے چوری ہونے، لُٹ جانے اور سبوتاژ ہونے کا خدشہ تھا، ورنہ چھپ چھپ کر تو مجرم ضمیری (Guilty Conscience) والے کام کیے جاتے ہیں اور جن سے مذاکرات ہونے جارہے تھے، وہ تو آئی۔ٹی کے بھی بڑے ایکسپرٹ ہیں، قومی وعالمی میڈیا میں ان کی جڑیں

پیوست ہیں، خبر دینا یا لینا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے، وہ تو حال ہی میں اپنے حریفوں کو اسکائپ پر مناظرے کی پیشکش کر چکے ہیں، تو مذاکرات اسکائپ پر کیوں نہیں ہو سکتے تھے۔

ایک عشرے سے بین الاقوامی اور قومی سطح پر یہ الزام لگایا جا رہا تھا کہ شمالی علاقہ جات میں مصروفِ جہاد لوگوں کا نظریاتی منبع مدارس اور اہلِ مدارس ہیں اور اس کی نمود اور نشاۃ وزیرستان کے پہاڑوں میں ہوتی ہے اور پھر زیرِ زمین اپنی راہیں (Roots) بناتے ہوئے پورے ملک بلکہ پوری دنیا میں پھیل جاتے ہیں، ہم اتحادِ تنظیماتِ مدارس پاکستان کے پلیٹ فارم سے انتہائی شد ومد کے ساتھ اس کی تردید کرتے رہے، لیکن چوہدری صاحب نے اپنی سیاسی کرامت سے اس سے بھی آگے بڑھ کر استادی شاگردی اور پیری مریدی کے رشتے بھی ثابت کر دیے۔ اسی لیے جب تک ڈرون حملے نے نادیدہ (Unseen) غیبی مذاکرات کے غبارے سے ساری ہوا نہ نکال دی، چوہدری صاحب نے کسی اور کو اس کی ہوا بھی لگنے نہ دی۔ ورنہ ہم جیسے طالبانِ علم کو بھی پتا چل جاتا کہ کس شرعی اساس پر ان کی بنیاد پڑی اور کن اصولوں پر انہیں بتدریج آگے چل کر اختتام تک پہنچانا تھا۔ ہماری حکومت نے اپنی جانب سے کھلے دل کے ساتھ غیر مشروط طور پر مذاکرات کا ڈول ڈالا تھا، مگر فریقِ ثانی نے بے بس حکمرانوں کے سر پر ڈرون کا کوہِ گراں ڈال دیا، جو اٹھائے نہ اٹھے اور چھڑوائے نہ چھٹے۔ قراردادوں اور قومی وملکی خودمختاری اور بین الاقوامی قانون کی تقدیس پر مشتمل پُراثر اور پُردرد بیانات کے سحر سے یہ رُک نہیں پا رہے۔ ہلکی پھلکی بات ڈرون گرانے کی بھی ہوتی ہے، مگر سوال اٹھتا ہے کہ پھر کیا ہوگا (Than What?)، تو یہ بھی سو نہیں بلکہ ہزار ملین ڈالر کا سوال ہے۔ بجا طور پر ایران کی مثال دی جاتی ہے کہ ایران نے ڈرون کے کمپیوٹرائزڈ نظام کو De Code کر کے یعنی کمپیوٹرائزڈ نظام کے رموز واشارات کو دریافت کر کے کامیابی سے اتار بھی لیا تھا اور شاید ہم بھی یہ کر سکیں، مگر تیل کے ذخائر نہیں ہیں اور خزانہ خالی ہے، بس یا تو تیل کے وافر ذخائر چاہییں یا ڈالر کے انبار اور ہمارے ملک میں دونوں چیزوں کا قحط طاری ہے۔

ہماری اے پی سی بھی اسی طرح باکرامت ہوتی ہے، چند گھنٹوں میں اس کے بطن سے ایک قرارداد برآمد ہوتی ہے اور قومی ہو یا بین الاقوامی ہر مشکل سے مشکل مسئلہ دو چار گھنٹوں میں حل ہو جاتا ہے۔ قائدینِ کرام قرارداد پر دستخط کر کے باہر نکلتے ہیں اور پھر سب کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔ سید منور حسن صاحب سے ایم کیو ایم کے بدلتے موقف کے بارے میں یہی سوال ہوا، تو انہوں نے کہا کہ صرف قرارداد پر ان کے دستخط کو سچا ماننا چاہیے، باقی ان کی کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے۔

میں ایک عرصے سے کہہ رہا ہوں کہ پاکستان میں پورا سچ بولنا مشکل بلکہ عملاً ناممکن ہوتا جا رہا ہے، اُس دن میں نے اچانک ٹیلی ویژن اسکرین پر قمر الزمان کائرہ صاحب کو سنا، وہ فرمارہے تھے کہ سچ کوئی نہیں بولتا، ہر ایک کو اپنی جان کی امان چاہیے اور میں بھی ڈرتے ڈرتے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ ریاست سے برسرپیکار لوگ ہمارے آئین وقانون کو نہیں مانتے۔

کائرہ صاحب نے پانچ سال حکومت کی ہے، ان سے بہتر کون جانتا ہے کہ شمال وجنوب کی ہوائیں بڑی گرم ہوتی ہیں، ان کی حرارت ڈرون سے بھی زیادہ ہے۔ انہیں چاہیے کہ اپنے پنج سالہ حکومت کے صدقے کے طور پر آج کے حکمرانوں کو ٹھنڈے ائیر کنڈیشنڈ ماحول میں اپنا دورانیہ پورا کرنے دیں، ویسے وہ آج کل قدرے فارغ ہیں، کسی قریبی مدرسے میں چلے جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے نازک مواقع کے لیے نجات کا راستہ بتایا ہے کہ: جب پورا اور کھرا سچ بولنے میں جان کا خطرہ ہو تو صریح جھوٹ سے بچنے کے لیے کوئی ذومعنی کلمہ بول کر جان کی امان پالیا کریں، کیونکہ جان ہے تو جہان ہے، ارشادِ نبوی ﷺ ہے: صریح جھوٹ سے بچنے کے لیے تعریض کا شعار اپنانا چاہیے (یعنی ذومعنی بات کر کے حق بیان بھی کر دیں اور پھنس جائیں تو نجات کا راستہ بھی نکل آئے)۔ سب سے حقیقت پسندانہ بات قاری محمد حنیف جالندھری صاحب نے کی ہے کہ جب امریکا آپ کا جنم جنم کا ساتھی ہے، مُرَبی ہے، کبھی گلے کا ہار بن جاتا ہے اور کبھی گلے کا طوق اور پاؤں کی

زنجیر بن جاتا ہے، لہٰذا زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ اسے بھی On Board لیں یعنی جو کرنے جارہے ہیں، اس پر ان کو بھی اعتماد لیں تاکہ نجات کی کوئی راہ نکل آئے۔

امریکی سفارت کار سے ایک تقریب میں سامنا ہوا تو میں نے اُن سے پوچھا کہ ڈرون کے مسئلے پر آپ اپنی پوری بات ہمارے مشیرِ خارجہ کو نہ سمجھا سکے یا وہ نہ سمجھ سکے، ہم جیسے اردو میڈیم لوگوں سے تو اہلِ مغرب کے ساتھ تفہیم و تفہیم یعنی سمجھنے سمجھانے میں غلطی ہوسکتی ہے، لیکن ہمارے مشیرِ خارجہ جناب سرتاج عزیز تو انگلش میڈیم ہیں، تو یہ غلط فہمی انہیں کیسے ہوگئی کہ باہر آکر انہوں نے پوری قوم کو بشارت سنائی کہ اب ڈرون حملے نہیں ہوں گے اور اگلے ہی روز اُن کی پوری قوم کے سامنے سبکی ہوگئی۔ انہوں نے بتایا کہ ہم نے تو انہیں یہ بتایا تھا کہ ہم صرف اپنے مطلوب افراد کو نشانہ بناتے ہیں، آپ کے لوگوں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے اور ہمیں وہ لوگ مطلوب ہوتے ہیں جو ہمارے لوگوں کو مار چکے ہیں یا مارنے کی منصوبہ بندی کررہے ہیں، معلوم نہیں اُن کو سیدھی سی بات سمجھنے میں کیا دشواری آئی؟۔ میں نے کہا کہ کچھ لوگ جو پاکستان کو مطلوب ہوتے ہیں، وہ افغانستان میں آپ کے زیرِ سایہ رہتے ہیں یا آپ کی اُن تک رسائی ہوتی ہے، لیکن آپ نے ان کو تو کبھی نشانہ نہیں بنایا۔ انہوں نے کہا کہ ہم سے حکومتِ پاکستان نے کبھی ایسا کوئی مطالبہ کیا ہی نہیں، واللہ اعلم بالصواب۔

کاش کہ من حیثُ القوم ہم پر ایسا وقت بھی آئے کہ ہم شامِ غریباں کے ماحول سے نکلیں اور صبحِ بہاراں بھی آئے۔ قوم کو کوئی حقیقی بشارت اور راحت بھی ملے۔ ویسے چوہدری نثار علی خان نے قومی اسمبلی میں جوشِ خطابت میں حزبِ اختلاف کو ایک غیر معمولی پیشکش کردی ہے کہ آیئے! قومی اسمبلی کے سارے براہِ راست منتخب ہونے والے 272 اراکین کے نتائج کی چھان بین کراتے ہیں اور جسٹس ریٹائرڈ وجیہہ الدین احمد کے ذمے یہ کارِ خیر سپرد کردیتے ہیں۔ معلوم نہیں چوہدری صاحب نے اپنی پارٹی سے کسی ایسی کھلی پیش کش کی منظوری بھی لی تھی یا نہیں؟ یا ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کی وجہ سے

ترنگ میں آ گئے۔ مگر اندھے کو کیا چاہیے؟، دو آنکھیں۔ اپوزیشن تو ویسے ہی محرومِ اقتدار ہے، اسے اور کیا چاہیے کہ حکومت بھی گھر چلی جائے اور آزادانہ وغیر جانبدارانہ انتخاب کے نام پر ایک نیا میدان سج جائے۔ ان کے پاس گنوانے کے لیے تو کچھ نہیں یا تو لاٹری نکل آئے گی، ورنہ جہاں کھڑے ہیں وہ جگہ تو اُن سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''اچھی بات کہو، ورنہ خاموشی بہتر ہے''۔

10 دسمبر 2013ء

حلفِ وفا

ایک اخباری نمائندے کا فون آیا کہ بعض سیاسی رہنما اپنی جماعت کے عہدیداران اور کارکنان سے اپنی ذات کے ساتھ وفاداری کا حلف اٹھانے کا تقاضا کرتے ہیں، اس کی شریعت میں کس حد تک گنجائش ہے۔ میں نے عرض کی کہ مجھے عصرِ حاضر کی سیاست وقیادت کے دستور اور منشور کا تو پتا نہیں، البتہ دینِ اسلام اور شریعتِ مصطفوی ﷺ میں غیر مشروط اطاعت ووفا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مکرم ﷺ کی ذات کے ساتھ لازم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا تقاضا اُس کے اَحکام کی غیر مشروط تعمیل اور تسلیم ورضا ہے، اس میں چوں وچرا کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور (اس کے) رسول کی اطاعت کرو اور (اُن کی بھی) جو تم میں سے صاحبانِ امر ہیں، پس اگر تمہارا کسی معاملے میں باہم اختلاف ہو جائے، تو اس متنازع مسئلے کو حتمی فیصلے کے لیے اللہ اور (اس کے) رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، تمہارے لیے یہی (طرزِ عمل) بہتر ہے اور اس کا انجام سب سے اچھا ہے'' (النساء:59)۔ مزید ارشاد فرمایا: ''جس نے رسول کا حکم مانا، اُس نے (درحقیقت) اللہ ہی کا حکم مانا''۔ (النسا:80)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حتمی اور قطعی طور پر فیصلہ فرمادیا کہ صرف اللہ عزوجل اور اس کے رسولِ مکرم ﷺ کی غیر مشروط اطاعت لازم ہے اور صرف رسول اللہ کی ذاتِ حق کی معرفت کے لیے معیار ہے۔ مخلوق میں سے کوئی کتنا ہی بلند مرتبہ ہو، اس کی اطاعت

مشروط ہے اور اُس کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں سوال ہو سکتا ہے، اُس سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ یعنی کون حق پر ہے اور کس کا موقف باطل ہے؟، اِس کے حتمی فیصلے کے لیے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ سے رجوع کیا جائے گا۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

''میں تمہارے پاس دو عظیم المرتبت چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، جب تک اِن کے ساتھ مکمل طور پر وابستہ رہو گے، تم کبھی بھی گمراہ نہ ہو گے، یعنی اللہ کی کتاب اور اُس کے نبی ﷺ کی سنّت، (مؤطا امام مالک، کتاب القدر)''۔

اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: کسی بھی باطل امر میں مخلوق کی اطاعت لازم نہیں ہے، جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا سبب بنے، (صحیح مسلم: 4761)''۔

نبی کریم ﷺ کے پہلے خلیفۂ راشد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے اوّلین خطبۂ خلافت میں حکومتِ اسلامی کے دستور کی اساس یوں بیان فرمائی:

''اے لوگو! میں تم پر حاکم بنایا گیا ہوں حالانکہ (میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ) میں تم سب سے بہتر ہوں، سو اگر میں (قرآن وسنت کے جادۂ مستقیم پر) ٹھیک ٹھیک قائم رہوں، تو تم پر میری اطاعت لازم ہے اور اگر میں (اس جادۂ مستقیم سے اِنحراف کرتے ہوئے) غلط رَوِش اختیار کروں، تو تم مجھے سیدھا کر دو''۔

اور خطبے کے اختتام پر ایک بار پھر آپ نے اس اصول کا اِعادہ فرمایا:

''جب تک میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کروں، تو تم پر لازم ہے کہ میری اطاعت کرو اور اگر (خدانخواستہ) میں راہِ حق سے انحراف کروں، تو تم پر میری اطاعت (کسی بھی صورت میں) لازم نہیں ہے''۔ اسی طرزِ حکمرانی کو ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کہتے ہیں اور کوئی بھی مسلم حاکم یا سربراہ اِس منہاج (Pattern) سے مُستثنیٰ نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حدیثِ مبارک میں اس کی مزید وضاحت یوں فرمائی:

''جس نے محمد ﷺ کی اطاعت کی، اس نے (درحقیقت) اللہ ہی کی اطاعت کی اور جس نے محمد ﷺ کی نافرمانی کی، اس نے (دراصل) اللہ ہی کی نافرمانی کی، (کیونکہ) محمد ﷺ لوگوں کے درمیان حق و باطل کی معرفت کے لیے معیار اور کسوٹی ہیں''۔

(صحیح بخاری: 7281)

اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، رسولِ اکرم ﷺ کی غیر مشروط اطاعت کے اُسی جادۂ مستقیم پر چلتے ہوئے دنیا پر چھا گئے اور اپنے عہد کی واحد سپر پاور بن گئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں اس وقت کی دو سپر پاورز اسلام کے آگے سرنگوں ہو گئیں۔ سو کسی بندے کا اپنے کسی ماتحت سے اس طرح کی غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ کرنا کہ جس سے اختلاف کی گنجائش نہ ہو، اُسے چیلنج نہ کیا جاسکے، اس کا فرمان حق کی کسوٹی بن جائے، یہ ''شرک فی الرسالت'' ہے، کیونکہ غیر مشروط اطاعت صرف معصوم ہی کی ہوسکتی ہے اور وہ اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔

شریعت کی رُو سے جائز امور پر حلفِ وفاداری اور پیمانِ وفا لیا جاسکتا ہے اور ایسے حلف کی پاس داری لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے قیادت سے وفاداری اور وفاشعاری کا معیار تعلیماتِ نبوی اور اسوۂ رسول کو بنایا اور ان سے سرِ مُو انحراف نہیں کیا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (کفار کے مقابلے کے لیے) ایک لشکر بھیجا اور ان پر ایک شخص کو امیر بنایا، اُس (امیر نے) آگ جلائی اور سپاہیوں سے کہا کہ اس آگ میں داخل ہو جاؤ، بعض لوگ (اطاعت امیر کو لازم سمجھتے ہوئے) اس کے لیے تیار ہو گئے، لیکن کچھ دوسرے سپاہیوں نے کہا کہ آگ سے بچنے کے لیے تو ہم نے اسلام قبول کیا ہے، اس واقعے کو (واپسی پر) رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیان کیا گیا، تو آپ ﷺ نے اُن مجاہدین کو جو امیر کے حکم پر آگ میں داخل

ہونے کے لیے تیار ہو گئے تھے، فرمایا: اگر تم (خدانخواستہ) آگ میں داخل ہو جاتے تو قیامت تک آگ میں جلتے رہتے اور دوسرے گروہ (جنہوں نے آگ میں داخل ہونے سے انکار کیا تھا) کی تحسین فرمائی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کسی ایسے امر میں جس سے خالق کی نافرمانی لازم آئے، مخلوق (خواہ اس کا منصب کوئی بھی ہو) کی اطاعت لازم نہیں ہے، اطاعتِ امیر صرف معروف میں ہے"۔ (صحیح مسلم: 4761)

ہم تو مسلمان ہوتے ہوئے بھی اپنے دین سے ایسی جفا کر رہے ہوتے ہیں کہ دشمن بھی سن کر اور دیکھ کر اَش اَش کر اٹھے۔ علامہ اقبال نے دینِ اسلام کے ساتھ امتِ مسلمہ کی اس جفا کاری کی تصویر کشی ان اشعار میں کی ہے:

گلۂ جفائے وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کروں بتکدے میں اگر بیاں، کہے صنم بھی ہری ہری

یعنی اہلِ حرم اور دینِ اسلام کے نام لیوا وفا کا لیبل لگا کر جو جفا کر رہے ہیں، ستم ڈھا رہے ہیں، خود کو اور اسلام کو بے آبرو کر رہے ہیں، اُن کے ان کرتوتوں کو دیکھ کر بت بھی زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں گے کہ اسلام کو جتنے زخم مسلمانوں نے لگائے، اتنے زخم تو میرے پرستار کھلا دشمن ہوتے ہوئے بھی نہیں لگا سکے۔ آج ہماری صورتِ حال اس شعر کی ہو بہو تصویر ہے:

کسے خبر تھی کہ ہاتھ میں لے کر چراغِ مصطفوی
زمانے بھر میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

اگر کسی نے اپنے رہنما کی غیر مشروط وفاداری کا حلف اٹھایا ہو اور اُس کی طرف سے ایسا حکم آجائے کہ جس پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو، تو اُس پر لازم ہے کہ اس حلف کو فوراً توڑ دے اور وہ کام کرے جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا کے مطابق ہے۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

"جس نے کسی بات کی قسم کھائی، پھر اُس پر آشکارا ہوا کہ (شریعت کی نظر میں) اُس پر عمل نہ کرنے میں خیر ہے، تو اس پر لازم ہے کہ اپنی قسم کا کفارہ ادا کرے اور وہ کام کرے جو (شریعت کی رُو سے) خیر ہے"۔ (سنن ابن ماجہ: 2111)

اگر وہ کام حرام ہے تو اس کے کرنے کے بارے میں جو قسم کھائی ہے، اس کا توڑنا فرض ہے اور اگر وہ کام مکروہ تحریمی ہے، تو اُس قسم کا توڑنا واجب ہے۔

16 دسمبر 2013ء

ماہرینِ معیشت ہماری رہنمائی فرمائیں

امریکا کی مخالفت میں ہم کس حد تک جاسکتے ہیں اور کس حد تک جانا چاہیے، یہ اس وقت کا ایک اہم سوال ہے۔ امریکا کا ساتھ دینے، حامی بننے اور تزویری شراکت دار (Strategic Partner) بننے کے لیے فضا ناسازگار ہے، البتہ امریکا کی مخالفت عوامی سطح پر ایک مقبولِ عام اور پُرجوش نعرہ ہے اور اس موقف کی حمایت میں دلائل کا ایک انبار ہے، جس میں حقیقت بھی ہے اور یہ جذبات کو اپیل بھی کرتا ہے۔

اس کے برعکس قومی میڈیا میں ہمارے لبرل دانشور، اینکر پرسن اور کالم نگار نہایت اصرار اور تکرار کے ساتھ اس موقف کو بیان کرتے ہیں کہ امریکا کی مخالفت ہم برداشت نہیں کرسکتے، ہماری معیشت میں اتنی سکت نہیں ہے، بین الاقوامی تجارت کا توازن ہمارے حق میں نہیں ہے، یعنی ہماری درآمدات کی مالیت ہماری برآمدات سے بہت زیادہ ہے اور بین الاقوامی قرضوں کی ہر سال کی واجب الادا اقساط کا حجم بہت زیادہ ہے اور یہ ہماری معیشت کا وہ شعبہ ہے، جس سے ہم محض نوٹ چھاپ کر عہدہ برا نہیں ہوسکتے اور روپے کی قدر میں مسلسل گراوٹ سے اس شعبے پر دباؤ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ اس طبقے کو ہم امریکا نواز، مغرب نواز، غلامانہ ذہنیت کے حامل یا سی آئی اے وغیرہ کا ایجنٹ کہہ کر اپنی نفسیاتی تسکین تو کرسکتے ہیں، لیکن اس سے مسئلہ حل نہیں ہو پاتا۔

امریکا میں تو کوئی بھی ملک اپنے بارے میں تاثر کو بہتر بنانے اور اپنے لیے وہاں کے کانگریس اراکین، مجالس مفکرین اور ملکی فیصلوں اور پالیسیوں پر اثر انداز ہونے والے افراد

کو اپنے موقف کے حق میں نظریاتی طور پر ہموار کرنے کے لیے Lobbying کر سکتا ہے اور واشنگٹن میں باقاعدہ Lobbyist Firms موجود ہیں۔ ماضی میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے بارے میں فضا ہموار کرنے کے لیے مارک سیگل کی فرم کی خدمات حاصل کی تھیں، لیکن ہمارے ملک میں اس طرح کا کوئی قانونی نظام موجود نہیں ہے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ بیرونی ایجنسیاں مخفی طور پر افراد کی خدمات حاصل کرتی ہوں، مگر یہ باتیں ہمارے ہاں بدگمانی کی حد تک رہتی ہیں، ہم قرائن وشواہد کی بنا پر کوئی رائے قائم کرتے ہیں، مگر اس کا پایۂ ثبوت تک پہنچنا مشکل ہے۔ پھر ہمارا ہر سال کا جو بجٹ بنتا ہے، اس میں آمد وخرچ میں کم از کم 25 تا 30 فیصد کا فرق (Gap) ہوتا ہے اور اکثر اوقات مالیاتی تخمینوں میں محصولات (Revenue) کے اہداف بھی پورے نہیں ہوتے اور اخراجات کی مدات میں مقررہ حد سے تجاوز ہوتا ہے، اس لیے ہر سال قومی اسمبلی سے آئندہ سال کا بجٹ منظور کرانے کے ساتھ ساتھ گزشتہ سال کا ضمنی بجٹ بھی منظور کرایا جاتا ہے۔ لہٰذا قرضوں کی اقساط کی ادائیگی کے لیے مزید قرضے لینے پڑتے ہیں۔ ان ماہرین کا کہنا یہ ہے کہ چین وسعودی عرب سمیت کوئی دوست ملک ہمارے توازنِ ادائیگی کی کمی پورا کرنے کے لیے نقد زرِ مبادلہ دینے پر آمادہ نہیں ہے۔ چین صرف اپنی ترجیحات پر منصوبہ جاتی سرمایہ کاری کرتا ہے اور اس قرض کی ادائیگی بھی ہم پر عائد ہوتی ہے۔ تو ہمارے مالیاتی توازن کو قائم رکھنے یا خسارے سے نکلنے کے لیے صرف امریکا اور اس کے کنٹرول میں قائم مالیاتی ادارے آئی ایم ایف اور عالمی بنک وغیرہ رہ جاتے ہیں اور امریکا نے یہ لت ہمیں شروع سے لگا رکھی ہے۔ اور لبرل ماہرین کے مطابق ہمارے پاس اس کا کوئی متبادل نہیں ہے، لہٰذا جو بھی حکومت آتی ہے، اسے اُسی آستانے پر جبیں سائی کرنی ہوتی ہے۔

پروفیسر خورشید احمد معاشی امور میں بڑا ادرک رکھتے ہیں، میں نے ان کی تحریر کافی توجہ سے پڑھی، ان کی بیان کردہ باتیں درست ہیں، اپیل بھی کرتی ہیں، کیونکہ امریکا 1990-91ء سے عراق پر پہلی یلغار کے بعد عالمِ اسلام کو روندرہا ہے، جمہوریت کو مسلم

ممالک میں پنپنے نہیں دے رہا، مصر میں جمہوری طریقے سے منتخب صدر ڈاکٹر مرسی کو چلتا کیا اور سعودی عرب کو جنرل سیسی کا پشتیبان بنا دیا۔ افغانستان اور پھر عراق پر دوبارہ حملہ کر کے من پسند حکومت قائم کی اور افغانستان پر یلغار کی سب سے بھاری قیمت پاکستان کو ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ حقوقِ انسانی کی پامالی، پاکستان کی سرحدات کی تقدیس کی پامالی اور دیگر تمام حوالے درست ہیں۔

یہ بھی درست ہے کہ امریکا اور مغرب میں ایک طبقہ عالمی سطح پر امریکی پالیسیوں سے اتفاق نہیں کرتا۔ اسی بنا پر شام پر امریکا کا حملہ موقوف کرنا پڑا اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سب کچھ طے شدہ اسکرپٹ کے مطابق ہوا ہو۔ ایران کے ساتھ مفاہمت کے بعد پاکستان پر امریکا کا انحصار کم ہوگا اور اس کو افغانستان کو کنٹرول کرنے اور وسطی ایشیا تک زمینی رسائی کے لیے ایک متبادل ذریعہ مل جائے گا، مگر سوال یہ ہے کہ آیا پاکستان کے پاس امریکا کی اقتصادی غلامی سے نکلنے کے لیے بھی کوئی متبادل ہے؟۔ یہاں حال یہ ہے کہ حکومت کا خزانہ خالی ہونے کے باوجود قوم آسائشوں اور راحتوں کی طلب گار ہے اور بحیثیت مجموعی سیاست دان قوم کے سامنے سچ نہیں بول رہے، نہ ہی قوم کو حقائق سے آگاہ کر کے مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہے ہیں، ان کی اوّلین ترجیح حکومت وقت یا ایک دوسرے کو نیچا دکھانا ہوتا ہے۔ ہم بیرونی زرمبادلہ کی بھاری مقدار میک اپ کے سامان، اشیائے تعیش، جن میں گھریلو ڈیکوریشن کے سامان سے لے کر انتہائی پرتعیش (Luxurious) گاڑیاں ہیں، امراء کے بنگلوں میں بیش تر سامان آرائش وزیبائش بیرونی ممالک سے درآمد کردہ ہے۔

بین الاقوامی سیاست اور معاشی ماہرین کے پاس اگر متبادلات ہیں تو وہ حقائق اور اعداد وشمار کی روشنی میں قوم کی رہنمائی کریں تاکہ عوام کو یک گونہ اعتماد حاصل ہو اور وہ اس کے لیے تیار ہوں یہی وہ صورت ہے جس کے مطابق ہم 66 سالہ امریکی غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکنے کے قابل ہوسکیں گے، تاکہ امریکا کی مخالفت محض ایک نعرے تک محدود

نہ رہے بلکہ حقیقت کا روپ دھار سکے۔

پس جو سیاسی جماعتیں یا ماہرینِ صدقِ دل سے پاکستان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اغیار کی تہذیبی اور معاشی غلامی سے نکالنا چاہتے ہیں، ان پر لازم ہے کہ مختلف شعبوں بالخصوص اقتصادی اور بین الاقوامی ماہرینِ قانون کا ایک تحقیقی گروپ اور مجلسِ فکر بنائیں اور وہ تمام حالات کا حقیقت پسندانہ اور زمینی حقائق پر مبنی معروضی تجزیہ کریں اور پھر قوم کے سامنے ایک ٹھوس اور قابلِ عمل متبادل پیش کریں، اگر اس کے لیے قوم کی طرف سے بیش بہا قربانیاں دینا ضروری ہوں، تو پھر قوم کو اس کے لیے ذہنی اور عملی طور پر تیار کریں۔

یہ گزارشات میں نے اس لیے کی ہیں کہ ہم جیسے طالبانِ علم کو شرحِ صدر ہوسکے اور اپنے موقف کو قوی اور مُسکِت دلائل کے ساتھ پیش کرنے کا ہتھیار ہمیں مل جائے۔ لیکن یہ بھی ذہن میں رہے کہ جو انتظامی مشینری، نوکر شاہی یا اسٹیبلشمنٹ ہمارے پاس ہے، وہ اس ناقص، ناکام اور بوسیدہ نظام کو چلانے کے لیے ہے، جو استعماری حاکموں سے ہمیں ورثے میں ملا اور اس میں ہم نے جو اضافہ کیا ہے، وہ نااہلی، کرپشن اور بدانتظامی کا ہے۔ اس مشینری کے ساتھ کسی انقلابی نظام کو چلانا مشکل ہے۔ جیسے ہم ہوائی جہاز کی باڈی ہو بہو بنادیں اور اس کے آگے موٹر کار کا انجن فٹ کر کے رن وے پر دوڑائیں، تو وہ ہوائی جہاز اڑ نہیں پائے گا، کیونکہ انجن میں اڑانے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ہمارے حالات تو انقلاب کے لیے یقیناً سازگار ہیں، لیکن انقلاب ہم سے لاکھوں کوس دور ہے، کیونکہ معاشرتی اعتبار سے ہم انتشار (Polarization) کا شکار ہیں، مسلکی، علاقائی، صوبائی اور طبقاتی حتی کہ ہم بظاہر تو ایک قوم ہیں، لیکن مجموعۂ تضادات ہیں اور ایسی انقلابی قیادت بھی سامنے نہیں ہے جو ان منتشر اجزاء کو یکجا کر کے ایک باہم مربوط اور منتظم جسدِ ملی تشکیل دے سکے۔ ایرانی انقلاب کا سبب حد سے بڑھا ہوا شاہی جبر ہے، اہلِ ایران ایک زبان اور ایک غالب مسلک اور ان کے رہبر امام خمینی کی پُرعزم اور غیر متزلزل قیادت تھی، جس کے آثار ہمارے ہاں مفقود ہیں۔

17 دسمبر 2013ء

امام احمد رضا قادری محدثِ بریلی

10 شوال المکرم 1272ھ تا 25 صفر المظفر 1340ھ

(پہلی قسط)

گزشتہ سو سال میں برصغیر پاک وہند میں جس دینی شخصیت کے ساتھ مسلمانوں نے غالب تعداد میں عقیدت واتباع کا تعلق قائم کیا، وہ مجدد دین وملت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری محدث بریلی رحمہ اللہ تعالیٰ کی شخصیت ہے۔ آپ اس خطے کے سب سے ممتاز اور مایۂ ناز فقیہ تھے، آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ: ''العطایا النبویہ فی الفتاویٰ الرضویہ'' 33 ضخیم مجلدات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں شامل بعض فتاویٰ اتنے مدلل، مفصل، محقق اور وقیع ہیں کہ ایک ایک فتوے پر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی جانی چاہیے۔ دراصل یہ فقہِ حنفی کا ایک جامع انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کے علاوہ فقہِ حنفی کی فتاویٰ کی انتہائی معتبر اور مستند کتاب ''ردالمحتار علی الدرالمختار'' پر آپ نے مفصل حاشیہ لکھا اور بعض مقامات پر وقیع دلائل سے علامہ ابن عابدین شامی سے اختلاف بھی کیا، عربی زبان میں آپ کا عظیم علمی شاہکار حال ہی میں تحقیق وتخریج کے ساتھ ''جد الممتار علی ردالمحتار'' کے نام سے متحدہ عرب امارات نے سات ضخیم مجلدات میں شائع کیا ہے۔ مکمل فتاویٰ رضویہ کو بھی عربی میں منتقل کرنے کا کام جاری ہے۔ آپ کی عربی تصانیف میں ''الدولۃ المکیہ بالمادۃ الغیبیہ'' اور ''انباء الحی'' عالمی سطح پر قبولیت کا شرف حاصل کر چکی ہیں اور یہ کتب ''مکتبہ ایشک استنبول'' ترکی سے شائع ہو چکی ہیں۔ فتاویٰ رضویہ میں جو احادیث استدلال کے طور پر پیش کی گئی ہیں، ان کا

مجموعہ تخریج وتحقیق کے ساتھ ''جامع الاحادیث'' کے نام سے دس جلدوں میں طبع ہو چکا ہے، اسی طرح فتاویٰ رضویہ میں اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں قرآن سے استدلال کیا ہے، اس کا مجموعہ ''فوائدِ تفسیریہ'' کے عنوان سے مولانا حافظ محمد عبدالستار سعیدی نے تین ضخیم جلدوں میں مرتب کیا ہے اور رضا فاؤنڈیشن نے اسے شائع کیا ہے۔ اقتصادی مسئلے پر ''کفل الفقیہ الفاہم'' ان کا معرکۃ الآراء فقہی شاہکار ہے، اس میں کرنسی نوٹوں کا شرعی حکم بیان کیا گیا ہے۔ معروف ہے کہ آپ کی عربی وار دو تصانیف مع شروح وحاشیہ جات کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے۔ انوارِ رضا میں قدیم وجدید علوم پر 548 کتب کی فہرست شائع ہو چکی ہے اور باقی پر کام جاری ہے۔

برطانوی استعمار کے عہد میں ہندوستان میں جب تحریکِ موالات چلی اور ''ملت وطنی'' کا پرچم بلند کرتے ہوئے ہندو مسلم بھائی بھائی کا نعرہ لگایا جانے لگا، تو امام احمد رضا قادری محدث بریلی رحمۃ اللہ علیہ نے انتہائی مدلّل طریقے سے اس موقف کو رد کیا اور قرار دیا کہ غاصب برطانوی سامراج سے آزادی کے لیے جدوجہد بھی لازم ہے، لیکن اسلام میں ملت وقومیت کی اساس دین ہے، اس لیے ہندو مسلم بھائی بھائی نہیں ہو سکتے۔ اس نظریے کی وضاحت کے لیے ''ترکِ موالات'' کے عنوان سے انہوں نے مفصل ومدلّل فتویٰ جاری کیا۔ آگے چل کر یہی فتویٰ ''نظریہ پاکستان'' یعنی ''دوقومی نظریے'' کی بنیاد بنا اور قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں مسلم لیگ نے تحریکِ پاکستان کی بنیاد ڈالی اور 14 اگست 1947ء، 27 رمضان المبارک کو اللہ تعالیٰ نے اس خطے کے مسلمانوں کو پاکستان کی صورت میں ایک آزاد وطن عطا کیا، جو آج ہماری پہچان ہے اور تمام تر مشکلات کے باوجود دنیا کی ساتویں ایٹمی طاقت ہے۔

گزشتہ امتوں میں جب ایک نبی اور رسول وصال فرما لیتے اور کچھ زمانہ گزرنے کے بعد ان کی شریعت اور اسلام کی تعلیمات کو لوگ فراموش کر دیتے یا حق میں باطل کی آمیزش کر دیتے یا اس عہد کے اعتبار سے بدعات، خرافات اور منکرات کو دین سے جوڑ دیتے، تو

دین اور شریعت کو ہر قسم کی باطل کی آمیزش سے پاک کر کے اپنی اصل شکل پر لانے کے لیے اللہ تعالیٰ دوسرا نبی مبعوث فرماتا، جو دین کو ہر قسم کی خرافات سے پاک کر کے قوم کے سامنے پیش کرتا۔ مگر جب تاجدارِ کائنات سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری کامل اور خاتم نبی اور رسول بن کر تشریف لائے، تو آپ کے بعد کسی اور نبی کے آنے کا امکان ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر دین کی تکمیل اور نعمت کے اِتمام کا اعلان فرما دیا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سن 10 ہجری کو اپنے حجۃ الوداع کے خطبے میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھ سے دین کی تعلیمات حاصل کر لو، شاید کہ آئندہ سال میری تم سے یہاں ملاقات نہ ہو۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبلیغ دین کی ذمے داری اپنی امت کے علماء کو تفویض کرتے ہوئے فرمایا:

''آج جو لوگ یہاں پر موجود ہیں، وہ دین کا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیں، جو یہاں پر موجود نہیں ہیں، بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس کو بالواسطہ دین کی تعلیمات پہنچتی ہیں، وہ براہِ راست سننے والے سے بھی زیادہ ان کی حفاظت کرتا ہے''۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:

''اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر صدی کے سرے (یعنی ایک صدی کے اختتام اور دوسری صدی کے اوائل میں) پر ایسی شخصیت کو مبعوث فرمائے گا جو اس امت کے لیے تجدید و اِحیائے دین کا فریضہ انجام دے گا''۔

چنانچہ مختلف صدیوں میں مختلف خطوں میں مجدد آتے رہے اور اِحیائے دین کا فریضہ انجام دیتے رہے، برصغیر میں اس حوالے سے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام ہر ایک کی نوکِ زبان پر ہے۔ اسی طرح اس خطے کے علمائے اہلسنت کا اجماع ہے کہ تیرہویں صدی ہجری کے اختتام اور چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں برصغیر میں امام احمد رضا قادری نور اللہ مرقدہٗ نے تجدید و اِحیائے دین کا فریضہ انجام دیا۔

برطانوی سامراج نے برصغیر میں اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا اور ان کے ذہن میں

یہ بات پیوست تھی کہ مسلمان ہی ان سے برسرِ پیکار ہو سکتے ہیں۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مسلمانوں میں جو چیز قوتِ ایمانی اور جہد و عمل پر ابھارتی ہے اور جس کی خاطر وہ اپنی متاعِ جان کو بھی قربان کرنا سعادت سمجھتے ہیں، وہ ناموسِ اُلوہیت جل وعلا اور ناموسِ رسالت مآب ﷺ اور ناموسِ شعارِ دین ہے۔ علامہ اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

وہ فاقہ کش جو موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کر فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

علامہ اقبال کے ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ دشمنانِ دین بھی بخوبی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی ذات سے بے پناہ عشق و محبت کا جذبہ اگر نکال دیا جائے، تو پھر یہ دینی حمیت اور ملی غیرت سے عاری ہو جائیں گے اور ان کے گلے میں غلامی کا طوق ڈالنا آسان ہو جائے گا۔ ہوا یہ کہ دین کا لیبل لگا کر اس طرح کی تحریریں منصۂ شہود پر آنے لگیں کہ جن سے ناموسِ اُلوہیت جل وعلا، ناموسِ رسالت ﷺ اور ناموسِ کتاب اللہ پر زد پڑ رہی تھی، چنانچہ امام رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے شمشیرِ براں بن کر میدانِ عمل میں آئے اور دلائل سے گرفت کی، جس کے نتیجے میں یہ سلسلہ رک گیا۔ اسی طرح مسلمانوں کے دلوں سے جذبۂ جہاد کو مٹانے کے لیے قادیانیت کا بیج بویا گیا اور متنبی قادیان نے اعلان کیا کہ میں جہاد کو منسوخ کرنے کے لیے آیا ہوں، پہلے وہ عیسائی اور ہندو پنڈتوں کے خلاف مناظر کی صورت میں سامنے آیا تاکہ عام مسلمانوں کی توجہات کا مرکز بن جائے، پھر اس نے مسیحِ موعود اور مہدی آخر الزمان ہونے کا دعویٰ کیا اور پھر آگے چل کر نبوت کا دعویٰ کر دیا اور ایک مرحلے پر اپنے آپ کو افضل الانبیاء بھی قرار دیا۔ اپنے لیے جگہ بنانے کی خاطر اس نے رفعِ عیسیٰ علیہ السلام اور حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام کے مسلّمہ اجماعی عقیدے کا انکار کیا اور ان

کی وفات کا دعویٰ کر دیا۔ امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کی تمام تحریروں اور فتاویٰ کا مرکز ومحور انہی فتنوں کی سرکوبی اور سدِ باب تھا۔ امام احمد رضا قادری نے قرآن مجید کا ترجمہ بنام ''کنزالایمان'' تحریر کیا۔ اس ترجمۂ قرآن کی خصوصیات اور تقابلی جائزے پر دنیا بھر کی متعدد یونیورسٹیوں سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگریاں عطا کی گئی ہیں اور اس وقت بھی ان کی علمی وفقہی خدمات کے حوالے سے کئی یونیورسٹیوں میں پی ایچ۔ڈی کی سطح پر تحقیقی کام جاری ہے۔ (جاری ہے)

23دسمبر2013ء

امام احمد رضا قادری اور ردِّ بدعات و مُنکرات

1272ھ تا 1340ھ

(آخری قسط)

امام احمد رضا قادری نَوَّر اللہ مَرقدہٗ کثیر الجہات، جامع العلوم اور جامع الصفات شخصیت ہے۔ وہ اپنے عہد کے عظیم مُفسّر، محدِث، فقیہہ، مُتکلّم، مؤرخ اور مُصلح تھے، خانہ ساز تاریخ کی ستم ظریفی بلکہ سنگ دلی یہ ہے کہ ان پر شرک و بدعت اور فروغِ منکرات کی پھبتی کسی گئی، طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا، لیکن یہ سب اِتّہامات و اِلزامات محض مفروضوں (Perceptions) کی بنیاد پر عائد کیے گئے، نہ کوئی حوالہ دیا گیا اور نہ ہی اُن کے فتاویٰ اور تصانیف کو پڑھنے کی کوشش کی گئی، بقولِ شاعر:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

اہلسنّت و جماعت کو قبوری، قبر پرست اور قبروں کو سجدہ کرنے والے کہا جاتا رہا ہے، امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: ''مسلمان! اے مسلمان! اے شریعتِ مصطفوی کے تابعِ فرمان! جان کہ سجدہ حضرتِ عزّتِ جلّ جلالہٗ کے سوا کسی کے لیے نہیں، اس کے غیر کو سجدۂ عبادت تو یقیناً اجماعاً شرکِ مہین و کفرِ مبین اور سجدۂ تحیّۃ (تعظیمی) حرام و گناہِ کبیرہ بالیقین، اِس کے کفر ہونے میں اِختلافِ علمائے دین، ایک جماعتِ فُقہاء سے تکفیر منقول''۔ سجدۂ عبادت تو بہت دور کی بات ہے، اُنہوں نے سجدۂ تعظیمی کے حرام ہونے پر قرآن

وسنت کی نُصوص سے استدلال کر کے ''اَلزُّبْدَۃُ الزَّکِیَّہ فِی حُرْمَۃِ السَّجْدَۃِ التَّحِیَّۃ'' کے نام سے ایک باقاعدہ رسالہ لکھا۔

امام احمد رضا نے فقہِ حنفی کے مُسلّمہ فتاویٰ وائمۂ اَحناف کے حوالے سے لکھا:

''عالموں اور بزرگوں کے سامنے زمین چومنا حرام ہے اور چومنے والا اور اِس پر راضی ہونے والا دونوں گناہگار، کیونکہ یہ بت پرستی کے مُشابہ ہے''۔

مزید لکھتے ہیں: ''زمین بوسی حقیقۃً سجدہ نہیں کہ سجدے میں پیشانی رکھنا ضرور ہے، جب یہ اس وجہ سے حرام اور مُشابہِ بت پرستی ہوئی کہ صورۃً قریبِ سجود ہے، تو خود سجدہ کس درجہ سخت حرام اور بت پرستی کا مُشابہِ تام ہوگا، وَالْعِیَاذُ بِاللہِ تَعَالٰی''۔

مزید لکھتے ہیں: ''مزارات کو سجدۂ (تعظیمی) یا اس کے سامنے زمین چومنا حرام اور حدِّ رکوع تک جھکنا ممنوع''۔ اولیائے کرام کے مزارات کی بات تو چھوڑیے۔ وہ لکھتے ہیں:

''زیارتِ روضۂ انور سید اطہر صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت نہ دیوارِ کریم کو ہاتھ لگائے، نہ چومے، نہ اُس سے چمٹے، نہ طواف کرے، نہ زمین کو چومے کہ یہ سب بدعتِ قبیحہ ہیں''۔ شرحِ لُباب کے حوالے سے لکھا: ''رہا مزار کو سجدہ، تو وہ حرامِ قطعی ہے، تو زائر جاہلوں کے فعل سے دھوکا نہ کھائے، بلکہ علمائے باعمل کی پیروی کرے، مزار کو بوسے میں (علماء کا) اختلاف ہے اور چھونا، چمٹنا اِس کے مثل، اَحوَط (یعنی شریعت کا محتاط ترین حکم) منع اور عِلّت (یعنی ممانعت کا سبب) خلافِ ادب ہونا''۔

فقہی حوالے کے ساتھ مزید لکھا: ''مزار کو سجدۂ (تعظیمی) تو در کنار، کسی قبر کے سامنے اللہ تعالیٰ کو سجدہ جائز نہیں، اگر چہ قبلے کی طرف ہو (یعنی یہ بت پرستی کے مشابہ ہے)، قبرستان میں نماز مکروہ، کہ اس میں کسی قبر کی طرف رُخ ہوگا اور قبر کی طرف نماز مکروہ ہے، البتہ قبرستان میں مسجد یا نماز کی جگہ بنی ہو، تو اس میں حرج نہیں ہے۔ قبر کی اونچائی کی بابت ان سے سوال ہوا تو لکھا:

''خلافِ سنت ہے، میرے والدِ ماجد، میری والدۂ ماجدہ اور بھائی کی قبریں دیکھیے،

ایک بالشت سے اُونچی نہ ہوں گی"۔

امام احمد رضا قادری سے مزاراتِ اولیائے کرام کے طواف کی بابت سوال ہوا،تو اُنہوں نے لکھا:"بلاشبہ غیر کعبۂ معظّمہ (بشمول روضۂ رسول) کا طوافِ تعظیمی ناجائز ہے اور غیر خدا کو (تعظیماً) سجدہ ہماری شریعت میں حرام ہے اور بوسۂ قبر میں علماء کو اختلاف ہے اور محتاط ترین قول ممانعت کا ہے،خصوصاً مزاراتِ طیّبہ اولیائے کرام کہ ہمارے علماء نے تصریح فرمائی کہ کم از کم چار ہاتھ کے فاصلے پر کھڑا ہو،یہی ادب ہے،پھر تقبیل (چومنا) کیسے مُتصوّر ہوسکتا ہے۔یہ وہ ہے جس کا فتویٰ عوام کو دیا جاتا ہے اور تحقیق کا مقام دوسرا ہے۔

امام احمد رضا سے سوال ہوا کہ بعض وظائف میں آیات اور سورتوں کو مَعکوس (اُلٹ) کرکے پڑھنا کیسا ہے؟،اُنہوں نے فرمایا:"حرام اور اَشَدّ حرام،کبیرہ اور سخت کبیرہ (گناہ)،کفر کے قریب ہے،یہ تو درکنار سورتوں کی صرف ترتیب بدل کر پڑھنا،اِس کی نسبت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:کیا ایسا کرنے والا ڈرتا نہیں کہ اللہ اس کے قلب کو اُلٹ دے،چہ جائے کہ آیات کو بالکل معکوس (اُلٹ) کرکے مُہمل (بے معنیٰ) بنادینا"۔

آج کل جاہل پیر و مُرشد بنے ہوئے ہیں،دین کے علم سے بے بہرہ ہیں،اپنی جہالت کا جواز اِس طرح کی باتیں بناکر پیش کرتے ہیں کہ طریقت باطنی اور روحانی اَسرار و رُموز کا نام ہے،علماء تو صرف الفاظ اور ظاہر کو جانتے ہیں،اُن کے دل نور سے خالی ہیں،گویا طریقت اور شریعت کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیتے ہیں،امام احمد رضا قادری نے لکھا: "شریعت اصل ہے اور طریقت اُس کی فرع،شریعت مَنبع (Sourse) ہے اور طریقت اُس سے نکلا ہوا دریا،طریقت کی جدائی شریعت سے مُحال و دشوار ہے،شریعت ہی پر طریقت کا دار و مَدار ہے،شریعت ہی اصل کار اور مَحَکّ و معیار ہے،شریعت ہی وہ راہ ہے،جس سے وصول اِلَی اللہ ہے،اس کے سوا آدمی جو راہ چلے گا،اللہ تعالیٰ کی راہ سے دور پڑے گا،طریقت اس راہ کا روشن ٹکڑا ہے،اِس کا اُس سے جدا ہونا محال و نامناسب ہے۔طریقت میں جو کچھ منکشف ہوتا ہے،شریعتِ مُطہرہ ہی کے اِتباع کا صدقہ ہے،جس

حقیقت کو شریعت رَد فرمائے، وہ حقیقت نہیں، بے دینی اور زِندقہ ہے''۔

امام احمد رضا قادری سے پوچھا گیا کہ ایک شخص شریعت کا عامل نہیں ہے، اَحکامِ شریعت کا تارک ہے، اُس کا مُؤاخذہ کیا جائے تو کہتا ہے: ''اَحکامِ شریعت تو وصول اللہ کا ذریعہ ہیں اور میں تو واصل ہو چکا ہوں، یعنی منزلِ حق پر پہنچا ہوا ہوں، لہٰذا میں اب اَحکام کا مُکلّف (جواب دہ، Accountable) نہیں ہوں۔ اُنہوں نے امام الصوفیہ حضرت عبدالوہاب شعرانی اور سیدُ الطائفہ جنید بغدادی رحمہا اللہ تعالیٰ کے حوالے سے بتایا کہ: ''ہاں! واصل (پہنچا ہوا) تو ضرور ہے، مگر جہنم میں''۔

مزید لکھتے ہیں: ''صوفیائے کرام فرماتے ہیں: صوفیِ بے علم مسخرۂ شیطان اَست۔ وہ جانتا ہی نہیں شیطان اُسے اپنی باگ ڈور پر لگا لیتا ہے، حدیث میں ارشاد ہوا: ''بغیر فقہ کے عابد بننے والا ایسا ہے، جیسے چکی میں گدھا'' کہ محنتِ شاقہ کرے اور حاصل کچھ نہیں''۔

لغت میں بدعت ہر نئی چیز کو کہتے ہیں اور اصطلاحِ شرع میں ''دین میں ایسی چیز اختراع کرنا، جس کی اصل دین میں نہ پائی جائے، بدعت ہے، یعنی ہر وہ چیز جو کسی دلیلِ شرعی کے مُعارض (مُتصادم) ہو، بدعتِ شرعیہ ہے''۔

امام احمد رضا سے سوال ہوا کہ کیا فلاحِ آخرت کے لیے مُرشد ضروری ہے، اُنہوں نے جواب میں لکھا کہ یہ ضروری نہیں ہے، ایک مُرشدِ عام ہوتا ہے، فلاحِ ظاہر ہو یا فلاحِ باطن، اس مُرشد سے چارہ نہیں، جو اس سے جدا ہے، بلاشبہ کافر ہے یا گمراہ اور اس کی عبادت تباہ و برباد۔ اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے فرمایا: عوام کا رہنما: کلامِ عُلماء، علماء کا رہنما: کلامِ ائمہ، ائمہ کا رہنما: کلامِ رسول اور رسول اللہ کا رہنما: کلام اللہ عزَّ وجلّ۔ شیخِ ایصال اور مُرشدِ کامل کے لیے انہوں نے چار کڑی شرائط بیان کی ہیں، جن پر لفظاً و معنیً پورا اترنا ہر ایک کا منصب نہیں ہے۔ اس لیے اُنہوں نے بیعت کا معنی و مفہوم، بیعت کی اقسامِ ثلٰثہ یعنی بیعتِ برکت، بیعتِ ارادت اور بیعتِ منفعت اور ان کی تفصیل اور اَحکام بیان کیے ہیں، جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

ماہِ صفر المظفر کے آخری بدھ کے بارے میں لوگوں میں رائج رسومات کی بابت لکھتے ہیں: ''آخری چہار شنبہ کی کوئی اصل نہیں، نہ اس دن صحت یابی حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کوئی ثبوت ہے۔ بلکہ مرضِ اقدس جس میں وفات مبارکہ ہوئی، اس کی ابتدا اسی دن سے بتائی جاتی ہے اور ایک حدیث مرفوع میں آیا کہ ''ابتدائی اِبتلائے سیدنا ایوب علیہ الصلوٰۃ والسلام اسی دن تھی اور اسے نحس سمجھ کر مٹی کے برتن توڑ دینا گناہ اور مال کا ضائع کرنا ہے۔ بہر حال یہ سب باتیں بے اصل و بے معنی ہیں''۔

پیرزادہ علامہ سید محمد فاروق القادری زید مجدہٗ نے ''فاضلِ بریلوی اور اُمورِ بدعات'' کے عنوان سے ایک گرانقدر کتاب تالیف مرتب کی ہے، علمی و دینی ذوق رکھنے والوں کو اس کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔

24 دسمبر 2013ء

حقیقتِ افتخار

سابق چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس (ر) افتخار محمد چوہدری عدالتی فعالیت کا ایک طویل دَور گزار کر رخصت ہوئے، انہوں نے جنرل پرویز مشرف کے دَور میں عزیمت کی راہ کو اختیار کیا اور پاکستان کی تاریخ میں وکلا برادری، الیکٹرونک و پرنٹ میڈیا، بیشتر سیاسی جماعتیں اور سول سوسائٹی، سب ان کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ ایک بھرپور تحریک اور سپریم کورٹ آف پاکستان کے فیصلے کے نتیجے میں بحال ہوئے، پھر معطل ہوئے اور سیاسی واحتجاجی دباؤ کے نتیجے میں حکومتِ وقت بادلِ نخواستہ ان کو بحال کرنے پر مجبور ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے انتہائی متحرک اور فعال دَور گزارا اور ریاست کے تمام اداروں پر عدالتِ عظمیٰ کی دھاک بٹھادی۔ جسٹس (ر) افتخار محمد چوہدری کو عالمی سطح پر بھی پذیرائی ملی اور اعزازات سے نوازا گیا، کیونکہ انہوں نے ایک آمرانہ دور میں استقامت کا مظاہرہ کیا، اپنے جائز مؤقف پر ڈٹ گئے اور قدرت نے بحیثیتِ مجموعی غیر متوقع طور پر حالات کو ان کے لیے سازگار بنادیا۔ بہر حال وہ ایک بشر ہیں اور کوئی بھی بشر خطا سے معصوم نہیں ہوتا اور نہ ہی مافوق الفطرت ہوتا ہے، ہاں! البتہ یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض انسانوں کو بعض جہات سے غیر معمولی صلاحیتوں سے نواز دیتا ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عام حالات میں ایک عمل جاذبِ نظر نہیں ہوتا، لیکن مخصوص حالات میں وہ غیر معمولی اہمیت اختیار کرلیتا ہے۔ بہت سے مسائل میں انہوں نے ازخود نوٹس لیا، ان کے بعض فیصلے نتیجہ خیز رہے اور بعض کو انتظامیہ نے تاخیری حربوں سے بے اثر بنادیا۔ پارلیمنٹ اور حکومت سے

ایک طرح کی محاذ آرائی کا تصور پیدا ہوا۔ الغرض یہ حکومت اور عدلیہ کے درمیان ایک ہیجانی دور تھا، جو ان کی ریٹائرمنٹ تک جاری رہا۔ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد بالعموم اُن کی تحسین کی گئی، انہیں عزت سے نوازا گیا، لیکن میڈیا کے کچھ حلقوں اور کچھ عناصر نے اپنے دل کی بھڑاس بھی نکالی، کچھ متاثرہ فریقوں نے اپنی نفسیاتی تسکین کے موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

انہوں نے مسندِ عدل پر بیٹھے ہوئے جو شِعار اپنے لیے پسند کیا، یہ ان کا استحقاق تھا۔ انہیں ان کی عزیمت کی وجہ سے عزت ملی۔ بعض مخالفین ان کے ماضی کے حوالے بھی دیتے رہے کہ انہوں نے بھی ماضی میں پی سی او کا حلف اٹھایا تھا، تو جس فعل کا ارتکاب کسی نے خود کیا ہو، اس پر دوسرے کو ملامت کرنے اور دوسرے پی سی او حلف یافتہ ججوں کو عدلیہ سے برخاست کرنے کا کیا جواز رہ جاتا ہے؟۔ ہمارے نزدیک جب کسی نے اپنی ماضی کی غلطی کی تلافی کردی ہے، تو اسے ماضی پر ملامت کرنا درست نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''جس نے اپنے بھائی کو کسی ایسے گناہ پر عار دلائی، جس سے وہ توبہ کرچکا ہو، تو ایسا عار دلانے والا موت سے پہلے خود اس گناہ میں مبتلا ہوجائے گا''۔ (سنن ترمذی:2505)

ایک اور طویل حدیثِ مبارک میں ہے۔ ابنِ شماسہ بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت عمرو بن عاص کی مرضِ وفات کے موقع پر ان کی عیادت کے لیے گئے، تو انہوں نے اپنا اسلام قبول کرنے کا واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا:

''جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی رغبت پیدا کی، میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! اپنا دایاں ہاتھ بڑھایئے تاکہ میں آپ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کرلوں، رسول اللہ ﷺ نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عمرو کیا بات ہے؟ میں نے عرض کی: میں کچھ شرائط طے کرنا چاہتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: بولو

کیا شرط ہے؟، میں نے عرض کیا: میرے سابقہ گناہ معاف ہو جائیں گے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اسلام ماضی کے سارے گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور ہجرت تمام پچھلے گناہوں کو مٹا دیتی ہے اور حج (مبرور) پہلے کے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ عمرو بن عاص بیان کرتے ہیں کہ: اُس وقت میری نظر میں رسول اللہ ﷺ کائنات کی محبوب ترین اور عظیم ترین شخصیت تھیں، مجھ پر آپ ﷺ کی شوکت و جلالت کا عالم یہ تھا کہ میں آنکھ بھر کر آپ کے رخِ انور کو دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کر پا رہا تھا اور اگر اس وقت میری موت واقع ہو جاتی تو مجھے یقین ہے کہ میں جنتی ہوتا۔۔ آگے طویل حدیث ہے"۔ (صحیح مسلم: 221)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ماضی کی غلطیوں کی تلافی کر دی جائے، تو پھر ان پر ملامت کرنے اور عار دلانے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا، البتہ اُس کے بعد کے اعمال پر کلام ہو سکتا ہے۔ پس ہماری رائے میں جسٹس (ر) افتخار محمد چوہدری نے سلطانِ جابر کے سامنے انکار کر کے اپنی ماضی کی غلطی کی تلافی کر دی تھی، البتہ ان کے بعد کے افعال اور انداز سے اتفاق اور اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ حکومتی ذمے داران کی کرپشن اور بے اعتدالیوں پر جو انہوں نے بروقت گرفت کی، اس سے سوائے متاثرین کے، شاید ہی کسی کو اختلاف ہو۔

البتہ جسٹس افتخار محمد چوہدری نے بہت سے سول و ملٹری اسٹیبلشمنٹ کے افسرانِ اعلیٰ کے ساتھ قدرے اہانت آمیز رویہ اختیار کیا، کاش کہ ایسا نہ ہوا ہوتا۔ عدالتِ عالیہ اور عدالتِ عظمیٰ کو تو تحفظ حاصل ہوتا ہے، لیکن دوسرے کسی بھی اعلیٰ منصب کے حامل شخص کو عدالتِ عالیہ و عدالتِ عظمیٰ کے رُوبرو کوئی اس طرح کا تحفظ حاصل نہیں ہوتا، یعنی عدالت کی طرف سے سخت گیری ضرور ہونی چاہیے اور بعض اوقات یہ عدل کا ناگزیر تقاضا بھی ہوتا ہے، لیکن ہر ایک کی عزتِ نفس اور منصب کے وقار کی پاس داری کرنی چاہیے۔ بعض اوقات منصب انسان کے لیے عزت و افتخار کا باعث ہوتا ہے، لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی عظیم المرتبت شخصیت منصب کے لیے باعثِ افتخار بن جاتی ہے اور یہی حقیقت و کمالِ افتخار بلکہ دوامِ افتخار ہے۔ یہ وہ شخصیات ہیں کہ منصب سے جدا ہونے کے بعد بھی ان کی عزت و

وقار میں کمی نہیں آتی، بلکہ اضافہ ہوتا ہے اور لوگ انہیں ان کے اعلیٰ کردار کی وجہ سے یاد کرتے ہیں اور ایسے لوگ تاریخ میں امر ہو جاتے ہیں۔

اب مناسب وقت ہے کہ جسٹس (ر) افتخار محمد چوہدری بحیثیتِ چیف جسٹس آف پاکستان اپنے کردار کا جائزہ لیں اور پھر اپنے تجربات اور مثبت ومنفی پہلوؤں سے خود قوم کو آگاہ کریں، خود احتسابی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''بلکہ انسان اپنے (نیک وبد) پر خود شاہد ہے، خواہ وہ کتنے ہی عذر تراشے''۔ (القیامہ:15-14)

اب موجودہ چیف جسٹس آف پاکستان جناب تصدق حسین جیلانی کا دور ہے، انہوں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ از خود نوٹس پر تحدید ہونی چاہیے۔ بظاہر ان کے مزاج میں ٹھہراؤ ہے، اعتدال ہے اور یہ اُن کے منصب کے وقار کا تقاضا بھی ہے۔ بہتر ہے کہ وہ عدالتی فعالیت کو قائم رکھتے ہوئے توازن قائم کریں اور قدرت نے انہیں جو موقع عطا کیا ہے، اسے ماتحت عدلیہ کی اصلاح اور اسے فعال بنانے پر صرف کریں، عام آدمی کا زیادہ واسطہ ماتحت عدلیہ سے پڑتا ہے اور زیادہ خرابیاں اور کرپشن کی داستانیں بھی اسی کی طرف منسوب ہیں۔

انتظامیہ پر بھی لازم ہے کہ عدلیہ کا احترام کرے اور اُس کے احکام کو لفظاً ومعنیً نافذ کرے، ہر ایک کو جسٹس افتخار محمد چوہدری بننے پر مجبور نہ کرے۔ اسی طرح اعلیٰ عدلیہ کے قابلِ احترام ججوں کے تقرر کے بارے میں انگشت زنی ہوتی رہی ہے، بہتر ہے کہ اسے زیادہ شفاف بنایا جائے۔ اعلیٰ عدالتی مناصب کو پارلیمنٹ کے ہاتھوں کھلونا بننا بھی مناسب نہیں ہے اور ماضی میں پارلیمنٹ کی اجتماعی دانش نے بھی کچھ زیادہ شفافیت اور اعلیٰ معیار کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اُس کی نمایاں مثال نگراں سیٹ اپ، الیکشن کمیشن آف پاکستان اور چیئرمین نیب کا تقرر ہے۔ حال ہی میں وزارتِ داخلہ نے انتہائی عجلت میں بوکھلاہٹ کے عالم میں بعض معزولیاں کیں، جنہیں عدالت نے فوری طور پر بحال کر دیا۔ کیا ایسا ممکن نہیں تھا کہ سروسز رولز کے مطابق طریقۂ کار کو اختیار کیا جاتا اور یہ رسوائی نہ ہوتی۔

30 دسمبر 2013ء

کس قیامت کے یہ نامے

مجھے یہ جان کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ روزنامہ "دنیا" کے قارئین کی بڑی تعداد علم وشعور سے آراستہ ہے اور اسے ویب سائٹ پر وزٹ کرنے والوں کی بھی ملک کے اندر اور بیرونِ ملک کثیر تعداد ہے۔ نہ صرف یہ کہ ہمارے قارئینِ کرام کالموں کا مطالعہ کرتے ہیں بلکہ ای میل کے ذریعے ان پر مثبت یا منفی رائے بھی دیتے ہیں۔ "امام احمد رضا قادری اور ردِّ بدعات ومنکرات" کے عنوان پر کالم کے بارے میں تقریباً سب آراء مثبت تھیں، اس کی تحسین کی گئی اور اسے وقت کی ضرورت قرار دیا گیا، مگر ایک کرم فرما ابنِ صدیق قاضی نے منفی ردِّعمل سے نوازا، وہ لکھتے ہیں:

"اگر جو کچھ کالم میں لکھا گیا ہے، سچ ہے تو پھر ملک بھر میں موجودہ درباروں پر جو شرکیہ رسوم بڑے تزک واحتشام سے منائی جاتی ہیں، اُن کا کیا جواز ہے، کیا یہ کھلا تضاد نہیں ہے؟، کیوں سادہ لوح لوگوں کو اُلّو بناتے ہو"۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی فعل کو شرکیہ قرار دینا بہت بڑی جسارت ہے اور مطلقاً شرعی حدود وقیود کے بغیر ایسا فتویٰ صادر کرنا بہت بڑی جسارت ہے اور ایسی ہر جسارت سے ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں، آپ چھوٹتے ہی کسی کو مشرک قرار دے دیں، اس سے بڑا الزام اور اِتّہام کیا ہوسکتا ہے؟۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تین چیزیں اصلِ ایمان سے ہیں: جو لا الٰہ الا اللہ کہے (یعنی توحید ورسالت کا اقرار کرے)، اُس سے (اپنی زبان کو) روک لو اور کسی گناہ کی بناء پر اس کی تکفیر نہ کرو اور کسی

(ممنوع) عمل کی بناء پر اسے اسلام سے خارج نہ کرو"۔ (ابوداؤد: 2524)

ہم نے امام احمد رضا قادری رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ شرعی حدود و قیود کے ساتھ نقل کیا ہے کہ کوئی شخص کسی قبر یا غیر اللہ کو عبادت کی نیت سے سجدہ کرتا ہے، تو یہ شرک و کفر ہے اور اگر وہ اپنی دانست میں تعظیم سمجھ کر کر رہا ہے تو حرام ہے۔

دوسری بات یہ کہ جب علانیہ طور پر منکرات و بدعات سے براءت کر دی گئی اور یہ ایک وقیع قومی اخبار میں چھپ گئی، اس سے پہلے ٹیلی ویژن چینلز پر بھی میں ایک سے زائد بار بیان کر چکا ہوں اور حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کی ایک نشست میں، میں نے یہی کچھ بیان کیا، تو اِتمامِ حجت کے لیے یہ کافی ہے، ہم نے اپنا شرعی فریضہ ادا کر دیا۔ علما کی ذمے داری زبان اور قلم سے کلمۂ حق بیان کرنا ہے۔ جو اندازِ تکلم آپ نے میرے کالم پر اختیار کیا ہے، اس طرح تو آپ تمام علمائے حق پر طعن کر رہے ہیں کہ آپ لوگ تبلیغ دین کے حوالے سے جو کچھ بول رہے ہیں یا لکھ رہے ہیں، یہ آپ سادہ لوح لوگوں کو اُلّو بنا رہے ہیں، معاشرے میں تو اس کے برعکس ہو رہا ہے۔ منکرات کو طاقت سے روکنا اہلِ اقتدار کی ذمے داری ہے اور ہر ایک سے اس کی حیثیت کے مطابق باز پرس ہوگی۔

امام احمد رضا قادری محدّث بریلی رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ کی روشنی میں مزارات کے حوالے سے مسائل واضح طور پر بیان کر دیے گئے ہیں اور وہ یہ ہیں: مزار کے آگے سجدۂ عبادت شرک ہے اور سجدۂ تعظیمی حرام ہے، قبر کے سامنے حدِّ رکوع تک جھکنا منع ہے اور شرعی احتیاط اسی میں ہے کہ عوام کو مزار کو بوسہ دینے سے منع کیا جائے، کعبۃ اللہ کے سوا تعظیم کی نیت سے کسی بھی مزار حتیٰ کہ روضۂ رسول کا طواف بھی منع ہے، روضۂ رسول کی جالیوں کو چومنا خلافِ ادب ہے، براہِ راست یعنی کسی حائل کے بغیر قبر کے سامنے نماز پڑھنا مکروہ ہے، قبر کے اوپر بلا وجہ اگربتی، لوبان یا چراغ جلانا منع ہے، قبرستان میں لوگوں کی سہولت کے لیے روشنی کا ضروری انتظام جائز ہے، لیکن اسراف منع ہے، خواتین کا مزارات پر جانا منع

ہے، خواتین کا پیر سے پردہ واجب ہے، سوائے اس کے کہ اُن کے درمیان مَحرم کا کوئی رشتہ ہو، مزارات پر مردوزن کا مخلوط اجتماع ممنوع ہے، مزارات پر دھمال، رقص اور خلافِ شرع حرکات ممنوع ہیں، رسول اللہ ﷺ اور بزرگانِ دین کی صحیح تعظیم ان کی اطاعت میں ہے، ایصالِ ثواب جائز بلکہ مستحسن ہے، مزاراتِ مقدسہ اور قبرستان جانا پسندیدہ بات ہے، اموات کے ایصالِ ثواب کا کھانا امراء نہ کھائیں صرف فقراء کو کھلایا جائے۔

مزارات تو محکمۂ اوقاف کے کنٹرول میں ہیں اور جو اُن کے کنٹرول سے باہر ہیں، وہ سجادہ نشین حضرات کے تصرف میں ہیں اور وہی اس کے لیے جوابدہ ہیں۔ محکمۂ اوقاف اور اکثر سجادہ نشین حضرات کو صرف اپنے معاشی مفادات سے غرض ہے، جن اکابر کے نام پر وہ دادِ عیش دے رہے ہیں، ان کے مشن سے انہیں کوئی غرض نہیں ہے، سوائے معدودِ چند کے وہ شریعت کی پابندیوں سے سے بھی آزاد ہو چکے ہیں۔ جاگیرداری اور وڈیرہ شاہی کی طرز پر طریقت کے نام پر ایک مفاداتی گروہ وجود میں آچکا ہے۔ بقولِ علامہ اقبال:

میراث میں آئی انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن
ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

تصوف تو تزکیۂ باطن، عرفان اور احسان کا نام ہے، اس کے لیے کڑا معیار چاہیے۔ علم اور تقویٰ کسی کی میراث یا جاگیر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے:

"بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سے سب سے عزت والا وہ ہے، جو تقوے میں سب سے بالاتر ہو"۔ (الحجرات: 13)

تقویٰ اخلاصِ نیت، قول و فعل کی راستی اور صفائے قلب اور روحانی جلا سے حاصل ہوتا ہے۔ محض کسی بزرگ کی نسل میں ہونا یا اُن کی صلبی اولاد ہونا اُخروی نجات کا سبب نہیں بن

سکتا۔ قرآن مجید میں ہے:

''اور نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا: اے میرے رب! بے شک میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب سے بڑا حاکم ہے، (اللہ نے) فرمایا: اے نوح! وہ آپ کے اہل سے نہیں ہے، بے شک اس کے کرتوت اچھے نہیں ہیں''۔ (ہود: 46-45)

مقام غور ہے کہ جب نبی کا بیٹا اُن کے شِعار کو ترک کردے، ان کی تعلیمات کے برعکس طرزِ عمل اپنائے، تو محض نسبی رشتے کی بناء پر وہ نجات نہیں پا سکتا، تو کسی ولی کا فرزند اللہ تعالیٰ کی اس سُنّتِ جاریہ سے کیسے مستثنیٰ ہو سکتا ہے، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر مہربان ہو جائے اور اسے توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔ ایک طویل حدیثِ پاک میں ہے:

''جس کا عمل اسے سست کردے، اس کا نسب (بلند درجہ پانے میں) اس کی رفتار کو تیز نہیں کرسکتا''۔ (ترمذی: 2945)

اس کے برعکس اصحابِ کہف سے وابستگی کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کے کتے کا ذکر تقریباً نو مرتبہ فرمایا، حالانکہ کتا ایسا جانور ہے کہ اگر وہ برتن میں منہ ڈال لے تو اسے کم از کم تین بار دھونے کا حکم ہے، حفاظت یا شکار کی ضرورت کے بغیر اُس کا پالنا منع ہے، بقولِ شاعر:

پسرِ نوح با بداں بنشست، خاندانِ نبوتش گم شد
سگِ اصحابِ کہف روزے، چند پئے نیکاں گرفت، مردم شد

یعنی اصحابِ کہف کا کتا مردانِ باکمال کے ساتھ چند دن بیٹھا، تو وہ بھی نیک نام ہو گیا اور اس کے برعکس نوح علیہ السلام کے بیٹے نے بُروں کی صحبت اختیار کی تو خاندانِ نبوت کے شرف سے محروم ہو گیا کیونکہ ''آل'' اور ''اہل'' کے ایک معنی ہیں کہ: کسی کے خاندان کا فرد ہونا یا اُس کی صُلبی اولاد سے ہونا اور دوسرے معنی ہیں: کسی کا سچا پیروکار ہونا، یہاں جو پسرِ نوح سے نوح علیہ السلام کا اہل ہونے کی نفی فرمائی، اُس سے دوسرے معنی مراد ہیں۔

بزرگانِ دین اور اولیائے کرام کے مزارات، جو اُن کے صحیح روحانی جانشینوں کی نگرانی میں ہیں، وہاں روحانی تربیت کا بھی انتظام ہے اور شریعت کے ساتھ پختہ وابستگی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور مزارات کے متصل دینی ادارے بھی قائم ہیں، بعض مقامات پر خدمت خلق کے ادارے بھی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ وہاں ہے، جہاں سجادہ نشین یا اُن بزرگوں کے اَخلاف (Successors) اہلِ علم ہیں، اہلِ فکر ونظر ہیں، اہلِ درد ہیں، انہیں شریعت کا بھی پاس ہے، اُمت کا بھی درد ہے اور انسان دوستی بھی اُن کا شعار ہے۔

31 دسمبر 2013ء

جنوری2014ء

پاکستان کا انتخابی نظام اور چند گزارشات

(پہلی قسط)

بظاہر دیکھا جائے تو پاکستان کا انتخابی نظام انڈیا کے مقابلے میں کافی شفاف ہے، یعنی اس کا طریقۂ کار کھلی کتاب کی طرح ہے۔ پولنگ اسٹیشن پر پریذائیڈنگ افسر بیلٹ باکس کو تمام پولنگ ایجنٹوں کے سامنے کھول کر اندر سے خالی ڈبہ دکھاتا ہے اور پھر اسے سب کی موجودگی میں سیل (Seal) کر کے اس پر اپنے دستخط ثبت کرتا ہے اور اس سارے عمل کے شفاف ہونے کی پولنگ اسٹیشن میں موجود تمام پولنگ ایجنٹوں سے تصدیقی دستخط لیتا ہے۔ پھر پولنگ کا عمل شروع ہوتا ہے، پولنگ افسر ووٹر کا شناختی کارڈ چیک کر کے اُس کا نام پکارتا ہے اور وہ خود اور پولنگ اسٹیشن کے اندر موجود مختلف انتخابی امیدواروں کے پولنگ ایجنٹ اپنے پاس ووٹر لسٹ پر Tick کا نشان لگاتے ہیں۔ اگر کوئی پولنگ ایجنٹ ووٹر کو چیلنج کرنا چاہے کہ یہ وہ شخص نہیں ہے، جس کا نام پکارا گیا ہے، یعنی یہ جعلی ووٹر ہے، تو وہ اُسے مقررہ طریقۂ کار کے مطابق چیلنج کر سکتا ہے، چیلنج کیے ہوئے ووٹ الگ لفافے میں سیل کیے جاتے ہیں۔ یہ سارا عمل کھلی فضا میں پولنگ اسٹیشن پر موجود تمام پولنگ ایجنٹوں کے سامنے ہوتا ہے۔ صرف ووٹر ووٹ کی پرچی پر مہر پردے کے پیچھے لگاتا ہے، مگر ووٹ کی پرچی بیلٹ بکس میں سب کے سامنے ڈالتا ہے، کیونکہ از اوّل تا آخر وقت بیلٹ باکس پریذائیڈنگ افسر کے سامنے میز پر رکھا ہوتا ہے۔

پولنگ کا مقررہ وقت ختم ہونے پر پریذائیڈنگ افسر تمام پولنگ ایجنٹوں کی موجودگی

میں بیلٹ بکس کھولتا ہے اور گنتی شروع کر دیتا ہے، ووٹ کی مہر لگی ہوئی پرچی بھی سب کو دکھاتا ہے۔ پولنگ ایجنٹ کا یہ حق ہے کہ وہ پریذائیڈنگ افسر سے نتائج کی مصدقہ کاپی لے۔ لکھے ہوئے اور برتے جانے والے اس طریقہ کار میں بظاہر کوئی خرابی نہیں ہے اور یہ شفاف (Transparent) عمل ہے۔

لیکن تقریباً ہر انتخاب کے بعد دھاندلی یا انتخاب چرائے جانے کا الزام لگایا جاتا ہے، جو بالعموم ہارنے والی جماعت یا جماعتیں لگاتی ہیں اور ریٹرننگ افسر موردِ الزام قرار پاتا ہے۔ لیکن کیا اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ہر پولنگ اسٹیشن کے پریذائیڈنگ افسر سے حاصل کی ہوئی نتائج کی مصدّقہ نقول حاصل کر کے اسے چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ مگر یہ صرف اُس صورت میں ہوسکتا ہے کہ ہر امیدوار کے پاس پولنگ ایجنٹوں کی دو مکمل ٹیمیں ہوں، ضرورت کے موقع پر ایک ٹیم یا ایک ایجنٹ دوسرے کو نماز پڑھنے، طبعی حاجات یا کھانے وغیرہ کے لیے فارغ (Relieve) کر سکے۔ پھر یہ پولنگ ایجنٹ وہ ہوں جو مقامی ووٹر کو جانتے ہوں، یعنی اسی حلقے سے تعلق رکھتے ہوں اور اسی طرح خواتین پولنگ اسٹیشن پر خواتین پولنگ ایجنٹ بھی مقامی حلقے کی رہائشی ہوں، جو مقامی باشندوں کو جانتی ہوں۔ مزید یہ کہ اُن میں اتنی جرأت و ہمت ہو کہ غلط کو غلط کہہ سکیں اور چیلنج کر سکیں، غالباً چیلنج ووٹ کی کچھ معمولی فیس بھی ہوتی ہے۔

اب ہوتا یہ ہے کہ انتخابی امیدواروں اور جماعتوں کے پاس اتنی بڑی تعداد میں تربیت یافتہ پولنگ ایجنٹ نہیں ہوتے، حالانکہ پولنگ اسٹیشن پر ہونے والی دھاندلی پر نظر رکھنے اور اسے چیلنج کرنے کا وہی مؤثر ابتدائی مرحلہ ہوتا ہے۔ بہت سے امیدواروں کے پولنگ ایجنٹ بعض مقامات پر ہوتے ہی نہیں ہیں اور اگر ہوتے ہیں تو مقامی رہائشی لوگ نہیں ہوتے، اس صورت میں وہ صرف تماش بین یا مُبصّر (Observer) کا کردار ہی ادا کر سکتے ہیں۔ پس اصل کمزوری بنیادی اکائی میں ہوتی ہے، پھر ناتجربہ کاری کا عنصر سب سے اہم ہوتا ہے، پولنگ ایجنٹ کو اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے کہ اُس اسٹیشن سے باہر اس

کا امیدوار جیت رہا ہے یا ہار رہا ہے۔ بہت سے ناتجربہ کار پولنگ ایجنٹ جیت یا ہار کا سن کر جشن منانے یا سوگ منانے چل پڑتے ہیں اور اپنا مورچہ خالی چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کی تربیت یہ ہونی چاہیے کہ ان کا ہار جیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، انہیں تو صرف اپنے اسٹیشن کی چوکس ہو کر نگرانی کرنی ہے اور پریذائیڈنگ آفیسر سے مصدقہ نتیجہ لے کر جانا ہے اور نتیجے پر اپنے دستخط بھی ثبت کرنے ہیں کہ پوری گنتی کا کام میرے سامنے شفاف طریقے سے انجام کو پہنچا اور یہی چیز پریذائیڈنگ افسر کے بھی مفاد میں ہے۔

بعض اوقات سیاسی جماعتیں کھیل ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر پولنگ کے دوران ہی الیکشن کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیتی ہیں، اس کا انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ ان کے فریقِ مخالف ہی کو فائدہ پہنچتا ہے کہ پورا پولنگ اسٹیشن یک طرفہ طور پر اُن کے کنٹرول میں چلا جاتا ہے، جعلی ووٹر کو چیک کرنے والا اور چیلنج کرنے والا کوئی نہیں رہتا، تو فریقِ مخالف کی وہ جیت جو چند سو یا چند ہزار کی برتری سے ہوتی، لاکھوں کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔ سسٹم میں موجود رہتے ہوئے وہ بہت سی بے قاعدگیوں کو چیلنج کر سکتے ہیں، ریکارڈ پر لا سکتے ہیں، ایسے میں الیکشن کمیشن بھی ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

اس کے برعکس انڈیا جو آبادی کے لحاظ سے ہم سے پانچ گنا بڑا ملک ہے، وہاں عام انتخابات متعدد مراحل میں ہوتے ہیں، تمام مراحل میں پولنگ ختم ہونے پر مہر بند بیلٹ باکس الیکشن کمیشن یا ریٹرننگ افسر کی تحویل میں چلے جاتے ہیں، وہی ان کی نقل و حمل کا انتظام کرتے ہیں، گنتی بروقت اس لیے نہیں ہوتی کہ نتائج اگلے مرحلے پر اثر انداز نہ ہوں اور کسی سیاسی پارٹی کو نقصان نہ پہنچے۔ آخری مرحلے کی تکمیل پر گنتی شروع ہوتی ہے اور نتائج کا اعلان شروع ہوتا ہے۔ اگر ہمارے ہاں ایسا ہو تو شور مچ جائے کہ بیلٹ بکس چرا لیے گئے، بدل دیے گئے، جعلی ووٹوں سے بھرے ہوئے اضافی بیلٹ بکس ملا دیے گئے، وغیرہ۔ لیکن وہاں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا، پس معلوم ہوا کہ اصل چیز نظام کا اعتبار اور ساکھ ہوتی ہے اور یہی چیز ہمارے ہاں مفقود ہے۔

منصفانہ انتخابات کے لیے ریڑھ کی ہڈی سیاسی جماعتوں کا منظم ہونا ہے اور نچلی سطح تک ان کا تنظیمی نیٹ ورک ہے، جو ہمارے ہاں بالکل نہیں ہے۔ انتخابات دو عناصر سے جیتے جاتے ہیں، ایک پارٹی کی عوامی مقبولیت اور دوسرا انتخابی نظام کے مکمل طریقۂ کار کو جاننا اور اس کے لیے پولنگ کے عملے اور سیاسی جماعتوں کے پولنگ ایجنٹوں کی تربیت از حد ضروری ہے اور ہمارے ہاں یہ دوسرا عنصر مفقود ہے۔

پھر ہمارے ہاں عدالتی فعالیت کے گزشتہ دور میں یہ باور کرلیا کہ ہر قومی و ملّی مرض کی دوا اور درد کا درماں اعلیٰ عدالتوں کے حاضر یا ریٹائرڈ جج صاحبان ہیں۔ پس سارا نگراں سیٹ اپ اور الیکشن کمیشن آف پاکستان اِن معزز جج صاحبان کے حوالے کردیا گیا، جو ایک مذاق بن کر رہ گیا۔ صرف پنجاب کے نگران چیف منسٹر نجم سیٹھی عدلیہ سے باہر کے تھے اور وہیں تھوڑی بہت حرکت اور فعالیت نظر آئی، بیوروکریسی کے بڑے پیمانے پر تبادلے ہوئے، وغیرہ۔ باقی سب جگہ کے حصے میں لطائف اور شکایات ہی آئیں۔

پس معلوم ہوا کہ منصفانہ اور شفاف انتخابات ایک خالص انتظامی مسئلہ ہے اور اس کے لیے ایک پراعتماد پرعزم، توانا اور قابل منتظم کی ضرورت ہے، جو بروقت متاثرہ مقام پر پہنچ سکے، بروقت فیصلے کرکے احکامات دے سکے اور اُن پر عمل درآمد پر کڑی نظر رکھ سکے۔ اُس کی دیانت وامانت شک وشبہے سے بالاتر ہو اور اس کا اعتبار اور ساکھ بھی ہو۔ ہندوستان میں ایک جج نہیں بلکہ غیر جانبدار اور سخت گیر منتظم چیف الیکشن کمشنر نے وہاں کے قومی انتخابات کی ساکھ قائم کی اور وہ بجاطور پر اس پر فخر کرتے ہیں کہ انڈیا دنیا کی سب سے بڑی اور مثالی جمہوریت ہے۔ چیف الیکشن کمشنر کو وسیع انتظامی اور مالی اخراجات بھی درکار ہوتے ہیں اور اس کے پاس انتخابی نظام پر مامور عملے کے خلاف تعزیری اور تادیبی کارروائی کے اختیارات بھی ہونے چاہییں۔

گزشتہ انتخابات میں جسٹس (ر) فخر الدین جی ابراہیم کو سب سے معتبر اور غیر جانبدار گردان کر اتفاقِ رائے سے چیف الیکشن کمشنر مقرر کیا گیا تھا اور ابتدا میں اُن کی سابقہ شہرت

کے حوالے سے اُن پر کسی نے انگلی نہیں اٹھائی اور نہ ہی کسی قسم کے تحفظات کا اظہار کیا گیا۔ مگر آج حال یہ ہے کہ وہ مستعفی ہونے کے بعد منظر سے غائب ہیں اور اپنی سابق نیک نامی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

نوٹ: ہندوستان میں 2014ء کے عام انتخابات ایک ماہ سے زیادہ عرصے پر محیط رہے اور 9 مراحل میں مکمل ہوئے۔ ووٹرز کی کل تعداد پچاسی کروڑ سے متجاوز بتائی گئی ہے۔

6 جنوری 2014ء

پاکستان کا انتخابی نظام اور چند گزارشات

(آخری قسط)

ہم من حیث القوم بھی اخلاقی پستی کا شکار ہیں۔ اسلام کا حکم یہ ہے کہ ہم دوسروں کے بارے میں حُسنِ ظن رکھیں تاوقتیکہ قرائن وشواہد سے اس کے برعکس ثابت نہ ہو، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اے اہلِ ایمان بہت سے گمانوں سے بچو، بے شک بعض گمان گناہ (کا سبب) ہوتے ہیں''۔ (الحجرات:12)۔ اور رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ''بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے''۔ (صحیح:5143)

سو بدقسمتی سے ہمارے ہاں ہر ایک دوسرے کی نظر میں ناقابلِ اعتماد اور بددیانت ہے اور اس عمومی بدگمانی کے عِلَل واسباب بھی ہمارے اندر موجود ہیں، لیکن ہمیں اس اخلاقی زوال سے نکلنے کی تدبیر بھی کرنی ہوگی اور کسی حد تک ایک دوسرے پر اعتماد بھی کرنا ہوگا، ہم ''دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے'' کا مصداق بن چکے ہیں۔

جناب عمران خان نے قومی انتخابات پر عدمِ اعتماد کا اظہار کیا ہے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے کہا کہ ہم نے جمہوریت کے تسلسل کو قائم رکھنے کی خاطر انتخابی نتائج قبول کر لیے ہیں، ان کی یہ بات قابلِ تحسین ہے، مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ہم نے دھاندلی کو قبول نہیں کیا۔ بظاہر انتخابی نتائج قبول کرنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اُس کو خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کرلیا ہے۔ نادرا کی چیکنگ کا معاملہ بھی اب مشتبہ قرار پایا ہے، تو پھر کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم آگے کا سوچیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ پارلیمنٹ میں قابلِ ذکر جماعتوں کے پارلیمانی لیڈرز سر

جوڑ کر بیٹھیں اور اس مسئلے کا حل نکالیں۔ اٹھارہویں ترمیم میں پارلیمنٹ کی اجتماعی دانش نے الیکشن کمیشن کی تشکیل کا جو حل نکالا، وہ ناکام ثابت ہوا اور ڈیڈ لاک کا سبب بنا، اس حوالے سے جو پارلیمانی کمیٹی بنائی گئی، وہ بھی اتفاقِ رائے تک نہ پہنچ سکی۔ یہ امر بھی ذہن میں رہے کہ عام طور پر ایسا اتفاقِ رائے کسی کمزور شخصیت ہی پر ہوتا ہے، جو کسی کو ناراض کرنے کی متحمل نہ ہوسکے۔

اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کے تقرر کے طریقۂ کار پر بھی پارلیمانی کمیٹی مطمئن نہیں ہے، اس لیے کہ آئین وقانون کی تعبیر وتشریح اور اس کی تطبیق کا منصب عدالتِ عظمیٰ کے پاس ہے، لہٰذا بالآخر عدالتِ عظمیٰ کا فیصلہ ہی حرفِ آخر ثابت ہوا اور پارلیمانی کمیٹی یا پارلیمنٹ کے ارکان نے اسے اپنی بے توقیری پر محمول کیا، یا دبے لفظوں میں پارلیمنٹ کا حق غصب کرنے کے مترادف قرار دیا اور یہ کہ پارلیمانی کمیٹی اور صدر کا کام محض ربر اسٹیمپ رہ جاتا ہے۔ سو اس امر کا جائزہ لینا چاہیے کہ دنیا کے دیگر ممالک میں کیا طریقۂ کار رائج ہے اور یہ کہ آیا ہم میں اتنی جمہوری بلوغت آگئی ہے کہ ہم اپنے ذاتی مفاد یا جماعتی مفاد کے حصار سے نکل کر ملک وملت کے دیرپا مفاد کو ترجیح دے سکتے ہیں۔ ایک دوسرے پر تنقید تو آسان ہے، مگر تنقیح کے بعد مسئلے کا حل نکالنا دشوار ہے اور کسی بھی قوم یا ملک کی قیادت کا اصل امتحان اسی میں ہوتا ہے۔

عمران خان نے بلدیاتی یعنی مقامی انتخابات میں صوبہ خیبر پختون خوا میں بائیومیٹرک سسٹم کے تجربہ کرنے کا اعلان کیا ہے، اگر یہ تجربہ کامیاب ہوجاتا ہے تو اسے آئندہ پورے ملک میں روبہ عمل لایا جاسکتا ہے۔ یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ دُور دراز کے وہ مقامات جہاں بجلی نہیں ہے یا لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے اچانک بجلی چلی جاتی ہے، وہاں یہ سسٹم کام کرے گا، اس کے لیے ضروری ٹیکنیک ومشنری کی فراہمی اور انتخابی عملے کی تربیت کا انتظام صوبائی حکومت کی ذمے داری ہوگی یا الیکشن کمیشن کی، اس کے لیے اُس مشین میں اُس حلقے کے ووٹروں کا ڈیٹا کون Feed کرے گا، آیا الیکشن کمیشن یا نادرا کے پاس اتنے مختصر وقت

میں یہ مہارت دستیاب ہے؟، جب کہ ہمارے ہاں حال یہ ہے کہ الیکشن کمیشن نے کہا ہے کہ جنوری کی مجوزہ تاریخ پر انتخابات کے انعقاد کے لیے مطلوبہ تعداد میں بیلٹ پیپرز کی طباعت ناممکن ہے اور ترسیل کا مرحلہ تو بعد میں آئے گا۔

ایک اہم مسئلہ ہمارے ہاں آئے روز کے احتجاج اور دھرنوں کی سیاست ہے، جس کے نتیجے میں معاشی سرگرمیاں متاثر ہوتی ہیں اور لوگوں کے روزمرہ کے معمولات میں خلل واقع ہوتا ہے، تعلیمی اور کاروباری ادارے بند ہوجاتے ہیں۔ بعض جماعتوں کے پاس انتخابی طاقت تو نہیں ہوتی، لیکن احتجاجی سیاست کی استعداد زیادہ ہوتی ہے، اُن کے کارکن متحرک اور نظریاتی ہیں اور مختصر نوٹس پر بھی جمع ہوجاتے ہیں اور آج کل تو ہمارے الیکٹرونک میڈیا کو ہر وقت ہلا گلا چاہیے، اس پر بحث شروع ہوجاتی ہے کہ تعداد کتنی تھی، دعوے، چیلنج اور تردید کا ایک سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آپ ملک بھر سے یا دُور دراز علاقوں سے وسائل کے بل پر ایک بڑا جلسہ تو کرسکتے ہیں یا ایک بڑی ریلی تو نکال سکتے ہیں، خواہ تعداد ہزاروں میں ہو یا لاکھوں میں، لیکن اس کے بل پر آپ الیکشن نہیں جیت سکتے۔ ہمارے ہاں پارلیمانی نظام ہے، انتخابات نچلی سطح سے لے کر صوبائی اور قومی اسمبلیوں تک حلقہ جاتی بنیاد پر ہوتے ہیں، لہٰذا الیکشن جیتنے کے لیے آپ کے پاس متعلقہ حلقۂ انتخاب میں الیکشن کے دن کل ڈالے گئے ووٹوں کی اکثریت چاہیے، ورنہ اکیلے جماعۃ الدعوہ کے حافظ سعید بھی ایک بڑی ریلی نکال سکتے ہیں۔ سندھ میں الیکشن سے پہلے قوم پرستوں اور بعض دیگر جماعتوں کے اتحاد کی بڑی بڑی ریلیاں نکلیں اور بعض مقامات پر جلسے بھی ہوئے، مگر انتخابات میں وہ ناکام رہے۔

اب آتے ہیں انتخابی دھاندلی کی طرف، جس کا الزام ہمارے ہاں تقریباً ہر انتخاب پر لگتا رہا ہے۔ ایک "اصطلاح قبل از انتخابات دھاندلی" کی استعمال ہوتی ہے۔ اس کی مثال 2002ء کے انتخابات ہیں کہ جنرل احتشام ضمیر Probables اور Electables کو ہنکا کر قائد لیگ کے کیمپ میں لے آئے اور اس کے لیے ترغیب و ترہیب اور

Carrot & Stick کا اصول اپنایا، یعنی ڈراوا اور لالچ، جس پر جو حربہ کام کر جائے۔ پیپلز پارٹی کے 20 کے قریب جیتے ہوئے ارکان کو بھی توڑا گیا، مگر میر ظفر اللہ جمالی کو صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے وزیر اعظم منتخب کرایا جاسکا، جب کہ فوجی حکومت قائم تھی۔ ایک مثال جنرل حمید گل کے ذریعے پیپلز پارٹی کے خلاف مختلف سیاسی جماعتوں کو یکجا کر کے اسلامی جمہوری اتحاد (IJI) کا قیام تھا۔ ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ ممکنہ قابلِ انتخاب لوگوں کو ہمارے حساس ادارے غیبی اشارے سے کسی خاص جماعت کے کیمپ میں دھکیل دیتے ہیں۔ جمہوری دور میں کسی منظم اور ادارہ جاتی دھاندلی کے امکانات تو بظاہر کم ہیں، خدشات وشبہات کی بات الگ ہے، لیکن مقامی سطح پر دھاندلی کے امکانات کو کلی طور پر خارج ازامکان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بعض اوقات کسی خاص علاقے میں کسی امیدوار یا جماعت کا اثر زیادہ ہوتا ہے یا اس کی دہشت ہوتی ہے اور انتخابی عملہ مقامی سرکاری ملازمین پر مشتمل ہوتا ہے اور وہ کسی فرد یا گروہ کے جبر کی مزاحمت نہیں کر سکتے اور کوئی خاص علاقہ یا پولنگ اسٹیشن ایک طرح سے ہائی جیک ہو جاتا ہے، اس کے لیے مجموعی طور پر پورے نظام کا مؤثر ہونا اور قانون کی حکمرانی ضروری ہے، اسی طرح مقامی عملے کا تحفظ بھی ضروری ہے، لیکن برسرِ زمین ایسی صورتِ حال موجود نہیں ہے۔ یہاں تو حال یہ ہے کہ گواہ سامنے آکے جابر یا دہشت گرد کے خلاف گواہی نہیں دے سکتا، جج فیصلہ نہیں کر سکتا، قانون نافذ کرنے والے اداروں کے عُمّال بھی سہمے رہتے ہیں۔ اسی بناء پر تحفظ پاکستان آرڈی ننس جاری کیا گیا ہے، مگر پارلیمنٹ سے منظوری کے بعد اُس کا قانون بن جانا دشوار ہے۔

ہمارے ان مسائل کا حل یہ ہے کہ ایسے سابق تجربہ کار بیورو کریٹس، آئینی وقانونی ماہرین اور اہلِ فکر ونظر پر مشتمل ایک غیر سرکاری فورم یا مجلس مفکرین (Think Tank) قائم ہو جو ہمارے ان اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کے لیے ٹھوس اور قابلِ عمل تجاویز دیں اور پارلیمنٹ اور قانون ساز اداروں کی رہنمائی کریں اور پارلیمنٹ بھی ان تجاویز کو سنجیدگی لے، کیونکہ منتخب اراکین کے پاس عوام کی طرف سے نمائندگی کا حق تو ہوتا ہے، لیکن چند

مستثنیات کو چھوڑ کر یہ حقِ نمائندگی کسی دانش یا قابلیت کی بنیاد پر تفویض نہیں ہوتی، اس کے اسباب اور ہوتے ہیں، جن کا آئے دن میڈیا میں تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ شاید اس طرح ہم من حیث القوم ایک دوسرے کے بارے میں بدگمانی اور اپنے نظام پر بے اعتمادی کی فضا سے نکل سکیں، اللہ کرے ایسا ہو جائے۔

7 جنوری 2014ء

میلادالنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شرعی حیثیت

(قسط اوّل)

''میلاد'' کے معنی ہیں: ''پیدائش کا وقت'' اور ''مولِد'' کے معنی ہیں: ''پیدائش کی جگہ یا وقت''، دراصل یہ ظرف کا صیغہ ہے اور ظرف زمانی بھی ہوتا ہے اور مکانی بھی، یعنی کسی واقعے کے رونما ہونے کا زمانہ یا مقام، یعنی زمانۂ ولادت یا مقامِ ولادت۔ میلادالنبی ﷺ کے معنی ہیں: ''نبی کریم ﷺ کی ولادتِ باسعادت کے احوال بیان کرنا''۔ حدیثِ پاک کی مستند کتاب ''سننِ ترمذی'' میں ہے: ''بَابُ مَاجَاءَ فِي مِيلَادِ النَّبِيِّ ﷺ''، ''یعنی میلادالنبی ﷺ کا بیان''۔ اس باب کے تحت امام ابوعیسیٰ ترمذی اپنی سند کے ساتھ قیس بن مخرمہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: میں اور رسول اللہ ﷺ ''عام الفیل'' میں پیدا ہوئے اور حضرت عثمان نے قُباث بن اَشیَم سے پوچھا: عمر میں آپ بڑے ہیں یا رسول اللہ ﷺ؟ تو انہوں نے کہا: (مرتبے میں تو یقیناً) رسول اللہ ﷺ مجھ سے بڑے ہیں، البتہ میری ولادت اُن سے پہلے ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ عام الفیل میں پیدا ہوئے''۔ (سنن ترمذی: 3619)، اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے زمانۂ ولادت بیان کرنے کو ''میلادالنبی ﷺ'' کا عنوان دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''(حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:) اور ان پر سلام ہو جس دن وہ پیدا ہوئے اور جس دن ان کی وفات ہوگی اور جس دن وہ زندہ اٹھائے جائیں گے''۔ (مریم: 15)۔ ''(حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:) اور مجھ پر سلام ہو جس دن

میں پیدا کیا گیا اور جس دن میری وفات ہوگی اور جس دن میں (دوبارہ) زندہ اٹھایا جاؤں گا"۔(مریم:33)

ان دونوں آیاتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام کی ولادت کے دن اُن پر سلام بھیجنا سنتِ الٰہیہ ہے اور خود سُنّتِ انبیاء بھی ہے۔اور یہ مسلَّمہ اصول ہے کہ سابق انبیائے کرام کے حوالے سے جو امور قرآن مجید میں بطورِ فضیلت بیان فرمائے گئے ہیں اور اُن کی ممانعت نہیں فرمائی گئی، وہ ہماری شریعت میں بھی جائز ہیں۔

مسلمانوں کے میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منانے کا مقصد اس کائنات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تشکّر کا اظہار کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ولادتِ باسعادت کے احوال، آپ کے نسبِ پاک اور فضائل کا بیان کرنا ہے اور یہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے: ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوموار کے روزے کی بابت پوچھا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس دن میری ولادت ہوئی اور اسی دن میری بعثت (اعلانِ نبوت) ہوئی یا مجھ پر (پہلی بار) وحی نازل ہوئی"۔

(صحیح مسلم:2745)

اس حدیثِ پاک سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ولادتِ باسعادت کے شکرانے کے طور پر سوموار کے دن نفلی روزہ رکھا کرتے تھے اور ولادتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تشکّر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے۔اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری لکھتے ہیں: "اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ جس جگہ اور جس زمانے میں کوئی مبارک و مسعود واقعہ ہوا ہو، تو اس کی وجہ سے اس زمان و مکان کو شرف و برکت مل جاتی ہے۔(مرقاۃ المفاتیح، جلد:4،ص:475)۔سنن ترمذی:746 اور سنن ابوداؤد:2452 اور سنن نسائی: 2419 میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوموار کے نفلی روزے کا بیان ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے نسبِ پاک کا بیان بھی ثابت ہے۔"واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمارہے تھے: اللہ تعالیٰ نے

اولادِ اسماعیل میں سے کنانہ کو چن لیا اور کنانہ کی اولاد سے قریش کو چن لیا اور قریش میں سے بنو ہاشم کو چن لیا اور بنو ہاشم میں سے مجھے چن لیا"۔ (صحیح مسلم: 2276)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے اپنے والدِ ماجد حضرت عبداللہ سے بائیسویں پشت پر حضرت عدنان تک اپنا نسب بیان فرمایا اور فرمایا: جب بھی لوگوں کے دو گروہ ہوئے، اللہ تعالیٰ مجھے ان میں سے بہتر گروہ میں رکھا، میں (جائز) ماں باپ سے پیدا کیا گیا ہوں، مجھے زمانۂ جاہلیت کی بدکاری سے کوئی چیز نہیں پہنچی۔ میں نکاح سے پیدا کیا گیا ہوں، بدکاری سے پیدا نہیں کیا گیا، حضرت آدم وحوا سے لے کر نسب کی پاک دامنی کا یہ سلسلہ میرے والدین تک قائم رہا، میں بطورِ شخصیت کے تم سب سے بہتر ہوں اور بطور باپ کے تم سب سے بہتر ہوں"۔

(دلائل النبوۃ، جلد: 1، ص: 175-174)

آپ ﷺ سے روایت کردہ احادیث کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کا نورِ نبوت اور نسب حضرت آدم وحوا علیہما السلام سے لے کر حضرت عبداللہ وآمنہ تک مسلسل پاک پشتوں سے پاکیزہ ارحام میں منتقل ہوتا رہا اور آپ کے تمام آباء اور امہات میں عہدِ اسلام کے طریقۂ نکاح کے مطابق رشتۂ ازدواج قائم ہوا، لہٰذا آپ کا پورا سلسلۂ نسب طیب وطاہر اور کائنات میں سب سے اعلیٰ ہے۔ بیہقی کی "دلائل النبوۃ" اور محمد بن یوسف صالحی کی "سُبُلُ الھدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد" اور دیگر کتبِ سیرت میں یہ احادیث موجود ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہیں اور اس کی بے شمار نعمتوں میں سے واحد نعمت ہے کہ جس کا اس نے بطورِ خاص اہلِ ایمان پر احسان بھی جتلایا ہے، ارشاد ہوا: "یقیناً اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان پر احسان فرمایا کہ ان کے درمیان انہی میں سے رسولِ عظیم کو مبعوث فرمایا، جو ان پر آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں اور ان کے (قلوب واذہان) کا تزکیہ کرتے ہیں اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں، اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے"۔ (آلِ عمران: 164)، اور اللہ تعالیٰ کا یہ بھی حکم ہے:

''اور اپنے رب کی نعمت کا خوب چرچا کرو''۔ (الضحیٰ:11)

قرآنِ مجید میں عید کا ذکر:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی: اے ہمارے رب! ہم پر آسمان سے کھانے کا خوان نازل فرما، (تاکہ) وہ دن ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے عید ہو جائے اور تیری طرف سے (قدرت کی) نشانی ہو جائے اور ہمیں رزق عطا فرما اور تو سب سے بہتر رزق عطا فرمانے والا ہے''۔ (المائدہ:114)

اس آیتِ مبارکہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ''خوانِ نعمت'' کے نزول کے دن کو یومِ عید قرار دیا اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ان کی اس دعا کا ذکر فرمایا۔ پس معلوم ہوا کہ نزولِ نعمت یا حصولِ نعمت کے موقع کو عید سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ سعودی عرب میں ملک عبدالعزیز کی بادشاہت کے قیام کے دن کو ''عیدُ الوطنی'' کہا جاتا ہے اور سعودی عرب کے علماء سمیت کسی نے بھی اسے بدعت سے تعبیر نہیں کیا۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ وہ تو دنیاوی معاملہ ہے، جبکہ میلاد النبی ﷺ کو دین کا شِعار سمجھ کر کیا جاتا ہے، اس لیے اس کی مخالفت کی جاتی ہے۔ ہم شروع میں بیان کر آئے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی ولادتِ مبارکہ اور بعثت کے دن کا تشکر روزہ رکھ کر مناتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کا فعل شِعارِ دین ہی قرار پائے گا، کیونکہ نعمت کا تعلق بھی دین سے ہے۔ اسی طرح حدیثِ پاک میں ہے:

''جب نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ یہود یومِ عاشورا کا روزہ رکھتے ہیں، تو آپ ﷺ نے اس کی وجہ پوچھی؟، صحابہ نے عرض کی! یہ نیک دن ہے، اس دن اللہ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمنوں سے نجات عطا فرمائی تھی، تو موسیٰ علیہ السلام نے (اس کے شکرانے کے طور پر) روزہ رکھا۔ (نبی کریم ﷺ نے) فرمایا: میرا موسیٰ سے تعلق تمہاری بہ نسبت زیادہ ہے، پس آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور (صحابۂ کرام کو بھی) روزہ رکھنے کا حکم دیا''۔ (صحیح بخاری:2004)

دوسری احادیثِ مبارکہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہود کی مشابہت سے بچنے

کے لیے صحابہ کرام کو دس محرم کے ساتھ ایک دن پہلے (یعنی نو محرم) یا ایک دن بعد (یعنی گیارہ محرم) کو ملا کر دو دن کا نفلی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا، اس سے یہ منشائے رسالت معلوم ہوا کہ اگر کوئی کام فی نفسہٖ شریعت کی نظر میں پسندیدہ ہے اور کسی جہت سے اس میں مشابہت کا عنصر پایا جاتا ہے، تو محض مشابہت کی وجہ سے اس پسندیدہ کام کو ترک نہیں کیا جائے گا بلکہ مشابہتِ صُوری سے بچنے کے لیے کوئی بہتر حکمتِ عملی اختیار کی جائے گی۔

13 جنوری 2014ء

میلاد النبی ﷺ کی شرعی حیثیت

(آخری قسط)

شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم، جلد: 3، ص: 169 تا 190 میں میلاد النبی ﷺ کے موضوع پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ انہوں نے احناف کے مسلّمہ اکابر علامہ ابن عابدین شامی کی "شرحُ المَولِدِ لِابنِ حَجر بحوالہ: جواہر البحار، جلد: 3، ص: 340" اور ملا علی قاری کی "المَورِدُ الرَّوِی فِی المَولِدِ النَّبَوِی، ص: 8-7" کے حوالے سے ثابت کیا کہ یہ اکابرِ اُمّت بھی میلاد النبی ﷺ کے جواز کے قائل تھے۔

برصغیر کی مسلّمہ دینی و علمی شخصیت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی "الدُّرُّالثَّمِینُ فِی مُبَشَّرَاۃِ النَّبِیِّ الاَمِینِ" میں لکھتے ہیں:

"میلاد کا اہتمام میرے والدِ گرامی (شاہ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ میں یومِ میلاد کے موقع پر کھانا پکوایا کرتا تھا۔ اتفاق سے ایک سال کوئی چیز میسر نہ آسکی کہ کھانا پکواؤں، صرف بھنے ہوئے چنے موجود تھے، چنانچہ یہی چنے میں نے لوگوں میں تقسیم کیے۔ خواب میں دیکھا کہ آنحضرت ﷺ تشریف فرما ہیں، یہی چنے آپ کے سامنے رکھے ہیں اور آپ نہایت خوش اور مسرور دکھائی دے رہے ہیں"۔ (رسائلِ شاہ ولی اللہ دہلوی: 254)، یعنی میلاد کا یہ اہتمام رسول اللہ ﷺ کی نظر میں محبوب تھا۔

شیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب نجدی "مختصر سیرۃ الرسول" میں لکھتے ہیں:

"ثُوَیبہ ابولہب کی باندی تھی، جب نبی کریم ﷺ کی ولادت ہوئی، تو اس نے اپنے

آقا کو بھتیجے کی ولادت کی خوشخبری سنائی، اس خوشی میں ابولہب نے انگلی کے اشارے سے اُسے آزاد کر دیا، بعد میں ثُوَیبہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ بھی پلایا۔ ابولہب کی وفات کے بعد کسی نے اسے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوا؟۔ اس نے بتایا: تم سے جدا ہونے کے بعد عذاب میں مبتلا ہوں، مگر ہر پیر کے دن انگلی سے ٹھنڈک ملتی ہے۔ پس مقامِ غور ہے کہ جب ابولہب جیسے دشمنِ رسول کافر کو ولادتِ محمد بن عبداللہ کی خوشی منانے پر جہنم میں راحت مل سکتی ہے، تو ایک مسلمان کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی خوشی منانے پر بے پایاں اجر کیوں نہیں ملے گا؟ یہ عبارت کا خلاصہ ہے"۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری نے بھی قدرِ اختصار کے ساتھ اسی واقعہ کو بیان کیا ہے"۔ (صحیح بخاری:5101)

علامہ سعیدی نے علمائے دیوبند کے شیخِ طریقت حاجی امداداللہ مہاجر مکی کا یہ قول نقل کیا:

"اور مَشرَب فقیر کا یہ ہے کہ محفلِ مَولِد میں شریک ہوتا ہوں، بلکہ ذریعۂ برکات سمجھ کر ہر سال منعقد کرتا ہوں اور قیام میں لطف ولذت پاتا ہوں"۔ (فیصلہ ہفت مسئلہ:05)

وہ مزید لکھتے ہیں: "ہمارے علماء مَولِد شریف میں بہت تنازعہ کرتے ہیں، تاہم علما جواز کی طرف بھی گئے ہیں، جب صورت جواز کی موجود ہے، پھر کیوں ایسا تشدُّد کرتے ہیں اور ہمارے واسطے اِتّباعِ حرمین کافی ہے، البتہ وقت قیام کے، اعتقادِ تولُّد کا نہ کرنا چاہیے، اگر احتمالِ تشریف آوری کیا جاوے، مُضائقہ (حرج) نہیں، کیونکہ عالم خَلق مقید بہ زمان ومکان ہے، لیکن عالَم اَمر دونوں سے پاک ہے، پس قدم رنجا فرمانا ذاتِ بابرکات کا بعید نہیں"۔ وہ مزید لکھتے ہیں: "مولد شریف تمام اہلِ حرمین کرتے ہیں، اسی قدر ہمارے واسطے حجت کافی ہے اور حضرتِ رسالت پناہ کا ذکر کیسے مذموم ہوسکتا ہے؟، البتہ جو زیادتیاں لوگوں نے اختراع کی ہیں، نہ چاہئیں اور قیام کے بارے میں کچھ نہیں کہتا، ہاں مجھ کو ایک کیفیت، قیام میں حاصل ہوتی ہے"۔ وہ مزید لکھتے ہیں: "اگر کسی عمل میں غیر مشروع عوارض (خارجی امور) لاحق ہوں، تو اُن عوارض کو دُور کرنا چاہیے، نہ یہ کہ اصل عمل سے انکار کر دیا جائے، ایسے امور سے انکار کرنا خیرِ کثیر سے باز رکھنا ہے، جیسے قیام مولد شریف،

اگر بوجہ آنے نام آنحضرت کے کوئی شخص تعظیماً قیام کرے تو اس میں کیا خرابی ہے؟، جب کوئی آتا ہے تو لوگ اس کی تعظیم کے واسطے کھڑے ہو جاتے ہیں، اگر سردارِ عالم و عالمیاں (رُوحی فداہٗ) کے اسمِ گرامی کی تعظیم کی گئی تو کیا گناہ ہوا''۔ (شمائم امدادیہ:47,50,68)

علمائے دیو بند کے مُسلّمہ پیشوا علامہ اشرف علی تھانوی نے اس آخری جملے پر حاشیے میں لکھا ہے: ''البتہ اصرار کرنا کہ تارکین سے نفرت کرنا زیادتی ہے''۔ (امداد المشتاق:68)

اس عبارت سے ہمیں اتفاق ہے، کیونکہ کسی مستحب یا پسندیدہ امر کو ترک کرنے پر ملامت کرنا اسے واجب قرار دینا ہے اور یہ درست نہیں ہے۔ اس حاشیے پر علامہ غلام رسول سعیدی نے یہ اضافہ کیا ہے:

''اور میں کہتا ہوں کہ اس سے بھی بڑی زیادتی یہ ہے کہ محفلِ میلاد کو ''بدعتِ سیئہ'' قرار دیا جائے اور میلاد شریف کرنے والوں سے نفرت کی جائے اور انہیں اہلِ بدعت کے نام سے پکارا جائے''۔

ہمارا موقف بھی یہی ہے کہ فی نفسہٖ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جائز بلکہ مستحسن ہے، لیکن میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عنوان سے قائم مجالس اور جلوسوں کو ہر قسم کی بدعات، منکرات اور خرافات سے پاک ہونا چاہیے تاکہ چند لوگوں کی بے اعتدالیوں کی بنا پر ایک مستحسن امر کے خلاف منفی پروپیگنڈے کا جواز نہ مل سکے۔

مشہور اہلحدیث عالم علامہ وحید الزمان لکھتے ہیں:

''اِس حدیث (یعنی رسول اللہ کا پیر کا روزہ رکھنے) سے ایک جماعتِ علماء نے آپ کی ولادت کی خوشی یعنی مجلسِ میلاد کرنے کا جواز ثابت کیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اگر اس مجلس میں آپ کی ولادت کے مقاصد اور دنیا کی رہنمائی کے لیے آپ کی ضرورت اور امورِ رسالت کی حقیقت کو بالکل صحیح طریقہ پر اس لیے بیان کیا جائے کہ لوگوں میں اِس حقیقت کا چرچا ہو اور سننے والے یہ ارادہ کر کے سُنیں کہ ہم کو اپنی زندگیاں اُسوۂ رسول کے مطابق گزارنا ہیں اور ایسی مجالس میں کوئی بدعت نہ ہو، تو مبارک ہیں ایسی مجلسیں، اور حق کے طالب ہیں

ان میں حصہ لینے والے، بہرحال یہ ضرور ہے کہ یہ مجلسیں عہدِ صحابہ میں نہ تھیں"۔

(لغات الحدیث، جلد:3، ص:119)

یہ بات درست ہے کہ موجودہ ہیئت پر جو مجالسِ میلاد النبی ﷺ منعقد ہوتی ہیں یا جلوس کا شعار ہے، یہ جدید دور کی معروف اَقدار ہیں اور دین کے بہت سے شعبوں میں ہم نے دورِ جدید کے شِعار اور اَقدار کو اپنایا ہے، مثلاً: مُصحفِ مبارک میں سورتوں کے نام، آیات کی علامات، اِعراب لگانا وغیرہ۔ کتبِ احادیث بھی دوسری صدی ہجری میں یا اس کے بعد مرتب ہوئیں۔ قرآن وحدیث کو سمجھنے کے لیے تمام معاون علوم بعد میں ایجاد اور مُدوَّن ہوئے، عالی شان مساجد اور مدارس قائم ہوئے، دینی لٹریچر کی جدید انداز میں نشر واشاعت کا انتظام ہوا۔ اور کسی نظریے سے وابستگی کے اظہار کے لیے یا کسی غلط بات کے استرداد اور اس پر احتجاج ریکارڈ کرانے کے لیے جلوس نکالنے کی روش قائم ہوئی۔ تقریباً تمام مکاتبِ فکر نے دینی مقاصد کے لیے جلوس نکالے، مثلاً: شوکتِ اسلام، نفاذِ شریعت، ناموسِ رسالت اور عظمتِ صحابہ وغیرہ کے نام پر جلوس نکالے جاتے رہے ہیں اور یہ تمام سرگرمیاں دین اور مقاصدِ دین سے تعلق رکھتی ہیں اور انہیں اس دور میں قبولِ عام مل چکا ہے۔ اسی طرح دینی جماعتوں کا قیام، تبلیغی اجتماعات کا انعقاد، افتتاحِ بخاری یا ختمِ بخاری کی تقریبات، مدارس کے سالانہ جلسے یا پچاس سالہ اور ڈیڑھ سو سالہ جشن، سیرت النبی ﷺ کے جلسوں کا انعقاد، انٹرنیٹ کا درسِ قرآن اور دین کے ابلاغ کے لیے استعمال وغیرہ۔ مقامِ حیرت ہے کہ اس طرح کی تمام سرگرمیوں پر کبھی کسی نے کوئی فتویٰ صادر نہیں کیا، تو صرف محافل وجلوسِ میلاد النبی ﷺ کو ہدفِ تنقید بنانا یا بدعت قرار دینا انتہائی زیادتی ہے۔

میلاد النبی ﷺ کو بدعت قرار دینے والوں کا کام آسان ہے کہ وہ فتویٰ دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہوجاتے ہیں، لیکن میرا دردِ اس سے سوا ہے۔ میری خواہش ہے کہ ان مجالس کو دینی تعلیم وتربیت کا مؤثر ذریعہ بنانا چاہیے اور محبتِ رسول اللہ ﷺ کا ثمر اطاعت واتباعِ نبوی کی صورت میں ظاہر ہونا چاہیے۔ پیشہ ور واعظین، موضوع روایات

بیان کر کے لوگوں کی عقیدت کو اپنی دنیا سنوارنے کے لیے ابھارتے ہیں اور اِسے روحانی سرور کا ذریعہ بنالیا گیا ہے۔ خیر کا کام اِس انداز سے ہونا چاہیے کہ اُس کے مثبت نتائج برآمد ہوں، لاؤڈ اسپیکر کا استعمال بقدرِ ضرورت اور مناسب وقت تک ہو، یہ نہ ہو کہ لاؤڈ اسپیکر کے شور سے لوگوں میں بیزاری اور نفرت پیدا کی جائے، کسی اور کی غلط رَوِش کو اپنے لیے جواز نہ بنایا جائے۔ چراغاں کے لیے بجلی کا استعمال قانون کے دائرے میں ہونا چاہیے، ناجائز طریقے اختیار کر کے اُسے سعادت یا باعثِ اجر سمجھنا غیر شرعی فعل ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اے ایمان والو! (اللہ کی راہ میں) اپنی پاکیزہ کمائی میں سے اور اُن چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالی ہیں، اور ناقص چیزیں خرچ کرنے کا اِرادہ نہ کرو، جن کو تم خود بھی چشم پوشی کیے بغیر (خوشدلی سے) نہ لو''۔ (بقرہ:267) مالِ حرام کو حرام سمجھتے ہوئے اللہ کی راہ میں صدقہ کرنا اور اس پر اجر کی امید کرنا، ایمان کے منافی ہے۔

14 جنوری 2014ء

۞

بوکھلاہٹیں

حکومت کا مادّہ(Origin) حکم اور حکمت ہے۔ حکم کے معنی ہیں: ''اقتدار، Writ'' اور حکمت کے معنی ہیں: ''بصیرت اور دانش''۔ صحیح اور کامیاب حکومت وہی ہے جو اِن دونوں معانی کی عملی تصویر اور تعبیر ہو۔ اگر حکومت ہے مگر اس حکومت کا تحکم (Writ) نہیں ہے، تو وہ حکمرانی کے وقار پر ایک دھبا ہے اور اگر اس حکمرانی میں دانش اور بصیرت نہیں ہے، تو وہ حکومت بے فیض ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''ہم نے مدنی دَور میں اور اس کے بعد حکومت کی تو ہمیں معلوم ہوا کہ رعایا کی فلاح کس میں ہے اور مکی دَور میں ہمیں محکومیت کا تجربہ ہوا، تو ہمیں معلوم ہوا کہ حاکم کن خوبیوں کا حامل ہونا چاہیے''۔ یعنی ان دونوں اَدوار کے عملی تجربے نے ہمیں حکمرانی کا جوہر عطا کیا۔

لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے حکمران نہ تو دنیا کے تجربے سے استفادہ کرتے ہیں، نہ ہی تاریخِ عالَم کا مطالعہ کرتے ہیں اور خود اپنے تجربات سے بھی سیکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہماری دو بڑی سیاسی جماعتیں پاکستان مسلم لیگ (ن) اور پاکستان پیپلز پارٹی عروج وزوال کے مختلف اَدوار سے گزری ہیں۔ 1999ء سے 2008ء تک ان دونوں جماعتوں کی قیادت نے جلاوطنی کا دَور بھی گزارا ہے، ابتلا وآزمائش کے دور سے بھی گزریں، لیکن ایسی کوئی علامت نظر نہیں آتی کہ انہوں نے اپنی ابتلاء اور زوال سے بھی کچھ سبق سیکھا ہو، یہ ہمارا قومی المیہ ہے۔

بجا طور پر یہ توقع کی جارہی تھی کہ مسلم لیگ (ن) پوری تیاری کے ساتھ اقتدار

سنبھالے گی اور جن بے تدبیریوں اور بے احتیاطی کے سبب پیپلز پارٹی کی حکومت تضحیک کا نشانہ بنتی رہی، سوچے سمجھے بغیر انہوں نے اعلیٰ مناصب پر میرٹ کو نظر انداز کر کے تقرریاں کیں، تو عدالتِ عظمیٰ نے اُن کو کالعدم قرار دیا اور بدعنوانیوں کی داستانیں بھی زبانِ زدِ خاص و عام ہوئیں۔ لیکن صد افسوس کہ کچھ یہی صورتِ حال موجودہ حکومت کی بھی ہے۔

نادرا کے چیئرمین کی معزولی و بحالی اور پھر استعفیٰ، پیمرا کے چیئرمین کی معزولی و بحالی اور پھر استعفیٰ، اکاؤنٹینٹ جنرل آف پاکستان کی برطرفی و بحالی اور پاکستان کرکٹ بورڈ کے معاملات اِس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ کیا رولز آف بزنس ہمارے حکمرانوں کو معلوم نہیں تھے اور اعلیٰ عدلیہ کے جارحانہ رویے کا انہوں نے مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ پیپلز پارٹی نے تو اِس طرح کے اندازِ حکمرانی کو اپنا شعار بنا لیا تھا اور شاید انہیں پے در پے ناکامیوں پر کوئی پچھتاوا بھی نہ تھا، لیکن کیا موجودہ حکومت کے لیے فکری پختگی کو اپنانا دشوار تھا۔ ابوالعباس المبرد کی ''الکامل'' عربی لغت، ادب اور تاریخ کی ایک معرکۃ الآراء کتاب ہے اور اسے عربی کلاسیکل ادب کی چار نمایاں کتابوں میں شمار کیا گیا ہے، اس میں ایک قول ہے:

''کسی بھی حتمی فیصلے اور اقدام سے پہلے خوب سوچ بچار کرو، ہم ہر ایسی رائے سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں، جس پر بعد میں نادم ہونا پڑے''۔

بوکھلاہٹ پر مبنی اقدامات سے حکمرانوں کی دانش کے بارے میں اچھا تاثر قائم نہیں ہوتا، بطورِ خاص اس تناظر میں کہ ہمارا الیکٹرانک میڈیا سیاستدانوں بالخصوص حکمرانوں کی بوکھلاہٹوں کی تلاش میں رہتا ہے، کیونکہ انہیں اپنی اسکرین کی رونقیں قائم رکھنے سے غرض ہوتی ہے، حکمرانوں کی توقیر ان کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہماری سیاسی جماعتوں کا ایک دوسرے کی تقلید کے حوالے سے شعار بھی تقریباً وہی ہے، جو رسول اللہ ﷺ نے بنی اسرائیل کے حوالے سے اُمتِ مسلمہ کا بیان فرمایا:

''تم پچھلی اُمتوں کے غلط روش کی پوری پوری پیروی کرو گے حتیٰ کہ اگر وہ کسی گوہ کے سوراخ میں گھسے تھے، تو تم بھی ایسا ہی کرو گے، ہم (صحابہ کرام) نے عرض کی: یارسول اللہ!

کیا گزشتہ امتوں سے آپ کی مراد یہود ونصاریٰ ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تو اور کون؟''۔(سُنن ترمذی:7320)

چوہدری نثار علی خان کو مسلم لیگ (ن) کا ایک سلجھا ہوا، پختہ کار اور سنجیدہ سیاست دان سمجھا جاتا تھا اور وفاق کی سطح پر اپنی جماعت میں وزیرِ اعظم کے بعد ان کو سب سے سینئر اور مؤثر ترین رہنما سمجھا جا رہا تھا، مگر انہوں نے بھی مایوس کیا۔ اسلام آباد اور پوری قوم کی نبض کو ایک مخبوط الحواس شخص سکندر حیات نے دسیوں گھنٹے ساکت وجامد رکھا اور الیکٹرانک میڈیا نے بھی ایک نان ایشو کو سب سے اہم مسئلہ بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس واقعے نے پوری دنیا پر عیاں کر دیا کہ وزیرِ داخلہ بروقت قوتِ فیصلہ سے عاری ہیں، پھر اس کے بارے میں اُنہوں نے تجسُّس پر مبنی بیان دیا، لیکن اس کے بعد کچھ برآمد نہ ہوا۔

کچھ یہی صورتِ حال ریاست سے متصادم عناصر سے مذاکرات کی ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ مذاکرات ہو رہے ہیں یا نہیں ہو رہے، اگر ہو رہے ہیں تو کس سے ہو رہے ہیں اور کن اصولوں پر ہو رہے ہیں، ہر چیز ایک چیستان اور مُعَمّا (Puzzle) بنی ہوئی ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ مذاکرات شروع ہوا ہی چاہتے تھے کہ معطل ہو گئے، کبھی کہا جاتا ہے کہ اب بھی پس پردہ اس پر کام ہو رہا ہے، الغرض حکومت کبھی ایک جانب لپکتی ہے اور کبھی دوسری جانب، کبھی مولانا فضل الرحمن کو مدد کے لیے پکارا جاتا ہے اور کبھی مولانا سمیع الحق کو اور اب تو وزیرِ اعظم نے عمران خان اور سید منور حسن کو بھی مدد کے لیے پکارا ہے۔ سید منور حسن نے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ یہ حکومت کی جانب سے اپنی ناکامی کا اعلان ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس حوالے سے حکومت کی سوچ اور سمت واضح کیوں نہیں ہے؟۔ پس بہتر یہ ہے کہ وزیرِ اعظم جناب محمد نواز شریف، جناب آصف علی زرداری یا سید خورشید احمد شاہ صاحب، جناب عمران خان، مولانا فضل الرحمن، مولانا سمیع الحق، سید منور حسن صاحب، چیف آف آرمی اسٹاف اور ڈی جی آئی ایس آئی بند کمرے میں بیٹھیں اور اس مسئلے کے تمام مثبت اور منفی پہلوؤں پر غور کریں، ایک حکمتِ عملی ترتیب دیں اور اس پر علانیہ پیش قدمی

کریں۔ ان میں سے باقی تمام جماعتیں تو کسی نہ کسی حیثیت میں ہمارے نظامِ حکومت کا حصہ ہیں، یعنی سسٹم میں ''IN'' ہیں، مولانا سمیع الحق حکومتی نظام سے تو باہر ہیں، مگر بجا طور پر اُن کا دعویٰ ہے کہ شورش زدہ علاقے اور ریاست سے متصادم گروہوں میں وہ کسی نہ کسی طرح ''I N'' ہیں۔ اگر انہیں کامیابی نصیب ہوجاتی ہے، تو یہ تمام زُعماء اپنی حکمتِ عملی کی کامیابی کا کریڈٹ لے سکتے ہیں اور ناکامی کی صورت میں اُس کی ذمے داری بھی قبول کریں اور نتائج کا بھی مل کر سامنا کریں۔

صورتِ حال یہ ہے کہ مذاکرات کی حامی جماعتیں یا عناصر بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ریاست سے متصادم تمام عناصر کا مذاکرات یا مصالحت پر آمادہ ہونا عملاً ناممکن ہے، کیونکہ ان کی مُربّی (Sponsor) داخلی اور خارجی قوتوں کے اپنے اپنے ایجنڈے ہیں۔ لہٰذا دبے لفظوں میں اب یہ سب تسلیم کرنے لگے ہیں کہ وہ عناصر جو کسی بھی صورت میں مذاکرات اور مصالحت پر آمادہ نہ ہوں، تو ان سے جنگ ہی آخری چارۂ کار ہوگا۔

یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو زُعماء کہتے ہیں کہ جنگ مسئلے کا حل نہیں ہے، وہ آخری مرحلے پر اِس ناگزیر جنگ پر کیسے متفق ہوں گے، خواہ یہ جنگ ایک مُتحارب گروپ کے خلاف ہو یا کئی گروپوں کے خلاف۔ اور اس صورت میں باقی مُتحارب گروپ ریاست کے ساتھ کھڑے ہوں گے یا تحویلِ قبلہ کرلیں گے۔ اور جو مُتحارب عناصر مذاکرات یا مصالحت پر آمادہ ہوں گے، تو ان کے مطالبات کی بھی ایک طویل فہرست ہوگی، مثلاً اُن کے تمام قیدیوں کو غیر مشروط رہائی، اُن کے لیے عام معافی کا اعلان اور وزیرستان اور قبائلی علاقے سے پاکستانی افواج کا اِنخلا، یعنی اُس علاقے پر ریاستی عملداری سے دستبرداری اور ان کو مطلوبہ معاوضے ادا کرنا، اس کے بعد نفاذِ شریعت کا مسئلہ آئے گا۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ مسئلہ جس سنجیدگی کا متقاضی ہے، ابھی تک اُس سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا، حکومت صرف وقت گزاری سے کام لے رہی ہے، جسے پنجاب کے محاورے میں ''ڈنگ ٹپاؤ'' کہتے ہیں، حالانکہ یہ ریاست کی یکجہتی، سالمیت، استحکام اور بقا کا مسئلہ ہے۔

20، جنوری 2014ء

قومی سیرت کانفرنس کا موضوع

ماضی کی روایات کے مطابق اس سال بھی بارہ ربیع الاوّل (یعنی میلاد النبی ﷺ کے مبارک دن) کو ایوانِ صدر اسلام آباد میں صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان جناب ممنون حسین کی صدارت میں قومی سیرت کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانفرنس کا موضوع تھا: ''سرکاری مناصب اور ذرائع کا صحیح استعمال''۔ یہ موضوع بلاشبہ حسبِ حال تھا اور ہماری قومی ضرورت بھی، بشرطیکہ ہم سیرت النبی ﷺ سے زبانی دعووں سے ایک قدم آگے بڑھ کر رہنمائی بھی حاصل کرنے پر آمادہ ہوں۔ مجھے بھی اس مبارک مجلس میں حاضری اور اظہارِ خیال کا موقع ملا۔

ریاستی اور حکومتی مناصب امانت ہوتے ہیں اور اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''بے شک اللہ تم کو یہ حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے (صحیح) حق داروں کے سپرد کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو بے شک اللہ تمہیں کیسی عمدہ نصیحت فرماتا ہے''۔ (النساء:58)

امانت ایک وسیع المعنی کلمہ ہے اور یہ فرد سے لے کر ریاست تک ہر شعبے پر محیط ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشاداتِ مبارکہ ہیں:

(۱) ''جو امانت دار نہیں، وہ صاحبِ ایمان نہیں اور جسے اپنے عہد کا پاس نہیں اس کا کوئی دین نہیں''۔ (مسند احمد:12383)

(۲) منافق کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''جب اسے امین بنایا جائے تو خیانت کرتا ہے''۔ (بخاری:33)

(۳) ''جس سے مشورہ مانگا جائے، وہ امین ہوتا ہے (یعنی مشورہ دیتے ہوئے دھوکا نہیں دینا چاہیے)''۔(ترمذی:2822)

(۴) مجلس میں کہی ہوئی بات امانت ہوتی ہے، (یعنی مجلس میں کسی سے بات سنی ہو تو اس کی اجازت کے بغیر اسے اِفشا کرنا خیانت ہے)، (ابوداؤد:4836)''۔

(۵) ''خیانت اور امانت ایک جگہ جمع نہیں ہوتے (یعنی دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں''۔ (مسند احمد:8593)

لیکن سب سے اہم امانت ریاستی اور حکومتی منصب ہے اور اسے نااہلوں کے سپرد نہیں کرنا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ سے سوال ہوا: قیامت کب آئے گی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب امانت ضائع کردی جائے گی''، سائل نے دریافت کیا: ''امانت کیسے ضائع ہوجاتی ہے؟''، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب قوم کی زمامِ اقتدار نااہلوں کے سپرد کردی جائے، تو پھر قیامت کا انتظار کرو''۔(بخاری:59)

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ قومی معاملات کی باگ ڈور یعنی ریاستی اور حکومتی مناصب امانت ہیں اور لازم ہے کہ یہ امانت ان کے سپرد کی جائے جو اس امانت کی حفاظت کے اہل ہیں، ورنہ قیامت صغریٰ کا منظر برپا ہوگا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے شاہِ مصر سے کہا تھا: ''مجھے اس ملک کے خزانوں پر حاکم بنادیں بے شک میں حفاظت کرنے والا، علم والا ہوں''۔(یوسف:55)

یعنی میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کس سے لیا جائے اور کس کو دیا جائے اور قومی خزانوں کی حفاظت کرنا بھی جانتا ہوں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹیوں نے اپنے باپ سے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا:

''بے شک وہ بہترین شخص جسے کسی کام پر مقرر کیا جائے، وہ طاقت ور اور امانت دار ہونا چاہیے''۔(القصص:26)

پس قومی اور ملی منصب جسے تفویض کیا جائے اسے ان چار خوبیوں کا حامل ہونا چاہیے،

یعنی اسے حفیظ، علیم، قوی اور امین ہونا چاہیے۔ علامہ اقبال نے کہا ہے:

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں، تو بنتا ہے مسلمان

معلوم ہوا کہ نظامِ ریاست وحکومت کی استواری میں بنیادی اینٹ یہ ہے کہ مناصب ان کو سپرد کیے جائیں جو ان سے عہدہ براء ہونے کے اہل ہوں، امانت دار ہوں، خائن نہ ہوں اور صاحبِ جرأت واستقامت ہوں، اگر خشتِ اوّل ہی غلط رکھ دی جائے تو نظامِ ریاست وحکومت کی عمارت کتنی ہی بلند وبالا کیوں نہ ہو جائے، اس میں ہمیشہ کجی ہی رہے گی اور کسی بھی وقت دھڑام سے گر جائے گی:

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

اس کے بعد ریاستی اور حکومتی اختیارات اور وسائل کے استعمال کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کے بارے میں شِعارِ رسول یہ ہے، ابوحمید ساعدی بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اِبْنُ الْاُتْبِیَّہ (ایک روایت میں اِبْنُ اللُّتْبِیَّہ ہے) کو بنو سُلیم کے صدقات کی وصول یابی پر مقرر فرمایا۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور حساب پیش کیا اور کہا: ''یہ صدقات کا مال ہے اور یہ مال مجھے ہدیہ کیا گیا ہے''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم سچے ہو تو تم اپنے ماں باپ کے گھر میں کیوں نہ بیٹھے رہے کہ تمہارے پاس یہ تحائف آتے''۔ پھر رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے، آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور حمد وصلوٰۃ کے بعد کہا: ''میں تم میں سے کسی شخص کو کسی کام پر مقرر کرتا ہوں، تو وہ آکر مجھ سے کہتا ہے: ''یہ آپ کا مال ہے اور یہ مجھے ہدیہ کیا گیا ہے، تو وہ اگر سچا ہے تو کیوں نہ اپنے ماں باپ کے گھر میں بیٹھا رہا کہ اس کے پاس یہ تحائف آتے، اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی اس مال میں سے ناحق کوئی چیز نہیں لے گا، ورنہ وہ (قیامت کے دن) اس مال کو اٹھائے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حاضر ہوگا، مجھے نہیں معلوم کہ کوئی شخص اللہ کے پاس اونٹ کو لے کر آئے گا جو بلبلا رہا ہوگا یا

گائے لے کر آئے گا جو ڈکرا رہی ہوگی یا بکری لے کر آئے جو ممنارہی ہوگی، پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند فرمائے یہاں تک کہ آپ کی دونوں بغلوں کی سفیدی نظر آئی اور آپ نے فرمایا: کیا میں نے اللہ کا پیغام (ٹھیک ٹھیک) پہنچا نہیں دیا؟''۔(بخاری:7197)

ایک اور حدیث میں نبی کریم ﷺ خطبے کے لیے کھڑے ہوئے آپ نے مالی امور میں خیانت کا ذکر کیا اور اسے بڑا جرم قرار دیتے ہوئے فرمایا: ''میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ اپنی گردن پر (خیانت سے حاصل کی ہوئی) بکری اٹھائے ہوئے ہو اور وہ ممنارہی ہو یا گھوڑا ہو جو ہنہنا رہا ہو یا (خیانت سے حاصل کیا ہوا) سونا، چاندی یا کپڑوں کا گٹھا ہو اور وہ مجھ سے کہے: یارسول اللہ! میری مدد کیجیے اور مجھے یہ کہنا پڑے کہ میں تمہارے کام نہیں آسکتا''۔(بخاری:3073)

ایک اور حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اے لوگو! تم میں سے جس کو ہم کسی (مالیاتی) ذمے داری پر مامور کریں اور وہ (صدقات کے مال میں سے) ایک سوئی یا اس سے بھی کم تر چیز ہم سے چھپائے گا، تو یہ خیانت ہے اور اسے لے کر اسے قیامت کے دن آنا ہوگا''۔(المصنّف لابن ابی شیبہ:34220)

حضرت عمر فاروق بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو خیانت کرے، اس کے ساز وسامان کو جلادو''۔(المصنّف:34228)

آج کل ہمارے ہاں ایسے ایسے ماہر وکلاء ہیں جو سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''تم میرے پاس اپنے مقدمات لے کر آتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے حریف کے مقابل اپنے موقف کو زیادہ موثر دلائل سے پیش کرے اور (بفرضِ محال) میں مقدمے میں پیش کردہ شواہد کی روشنی میں اس کے حق میں فیصلہ دے دوں، سو جس شخص کو میں اس کے بھائی (فریقِ مخالف) کے حق میں سے کوئی ایسی چیز دے دوں (جس کا وہ حق دار نہیں ہے)، تو وہ اسے نہ لے، اس لیے (اسے جان لینا چاہیے) کہ میں اسے آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں''۔(مسلم:4470)

رسول اللہ ﷺ کو تو اللہ تعالیٰ حقائقِ اشیاء پر مطلع فرما دیتا تھا، لیکن ہر حاکم یا قاضی کا یہ مقام نہیں ہے، اس لیے اگر کسی عدالت سے کسی کے حق میں کوئی فیصلہ آ جائے اور اس کے نتیجے میں اسے ایسی چیز مل جائے، جس کا درحقیقت وہ حق دار نہیں ہے، تو حاکم کا فیصلہ ظاہراً اور قانوناً تو نافذ ہو جاتا ہے، لیکن وہ حقیقت کو تبدیل نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت میں حقائق پر فیصلہ ہوگا۔

اس حدیثِ مبارک کا منشا یہ ہے کہ لوگ اس دنیا کی حکومت اور نظامِ عدل کو حرفِ آخر نہ سمجھیں، بلکہ ان کا ایمان اور یقین ہونا چاہیے کہ ایک عدالت قیامت کے دن بھی سجے گی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی عدالت ہوگی، وہاں کوئی چرب زبانی، باطل دلائل اور شواہد کی فراوانی، کوئی حیلہ اور مکر و تدبیر اللہ تعالیٰ کے حقیقی احتساب اور حتمی اور قطعی عدل اور تعزیر و تعذیب سے بچا نہیں سکے گا، کاش! کہ ہمیں یہ قطعی حقیقت اس دنیا میں سمجھ میں آ جائے اور ہمیں آخرت کے عذاب سے نجات مل جائے۔

21 جنوری 2014ء

میڈیا مالکان کی خدمت میں چند عاجزانہ گزارشات

الحمدللہ ہمارا میڈیا آزاد ہے اور ہماری دعا ہے کہ آزاد رہے، لیکن بہت زیادہ آزاد ہے، البتہ جہاں آزاد میڈیا کے بھی پر جلتے ہیں، وہ نازک اور حساس مقامات انہیں بھی معلوم ہیں اور ہمیں بھی۔ تاہم ہر آزادی کی کچھ نہ کچھ حدود ہوتی ہیں اور سب سے بہتر شعار یہ ہے کہ ذمے دار لوگ اپنی حدود کا خود تعین کریں، لہٰذا کوئی نہ کوئی ضابطۂ اخلاق ہونا چاہیے۔ آزاد الیکٹرونک میڈیا کی رونقیں اگرچہ ان کے پروگراموں کے میزبان حضرات، ڈائریکٹر، پروڈیوسر، ہیڈ آفس اور میدانِ عمل میں موجود ان کے کارکنان کی محنتوں کا ثمر ہوتی ہیں، لیکن بہرحال اس کی باگ ڈور مالکان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ مالکان کی اوّلین ترجیح کاروباری مسابقت ہے، کیونکہ یہ بہرحال ایک پھیلتا ہوا کاروبار ہے۔ میڈیا کے پاس ایک طرح کی Nuisance Value یعنی صلاحیتِ انتشار یا پریشانی میں مبتلا کرنے یا سکون سلب کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس لیے کوئی طبقہ خواہ وہ حاکمِ وقت ہی کیوں نہ ہو، میڈیا سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا اور نہ ہی میڈیا سے جھگڑا مول لیتا ہے، سوائے اس کے کہ اس کے لیے گریز کا کوئی راستہ نہ رہے۔ اس طرح کی بے قابو آزادی ایک افتخار بھی ہے اور امتحان بھی۔ امتحان صرف اس صورت میں ہے کہ کوئی طبقہ یا فرد اپنے آپ کو قوم و ملک اور دین وملت کے حوالے سے بعض اصولوں، نظریات اور اقدار کا پابند سمجھے، یہ پابندی ایک طرح سے خود عائد کردہ (Self Imposed) ہوتی ہے اور اس کی پابندی کرتے ہوئے انسان ایک روحانی راحت و مسرت بھی محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنی دینی، ملّی، قومی اور ملکی

ذمے داریوں سے عہدہ برا ہوا۔ ہر قوم کی طرح ہماری کچھ تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی اقدار بھی ہیں، لہٰذا ان کی پاس داری بھی لازم ہے۔

بلاشبہ یہ کھلے پن کا دور ہے اور حقائق کو پردۂ خفا میں مستور رکھنا کسی کے لیے عملاً ممکن نہیں رہا۔ لیکن ہمارے میڈیا مالکان کو باہم مل کر کوئی کم از کم تہذیبی اور اخلاقی معیار ضرور وضع کرنا چاہیے اور اسے ملحوظ بھی رکھنا چاہیے۔ ہماری نوجوان نسل کو ہیڈ لائن یا ترجیحی خبر کے طور پر کیا یہ بتانا ضروری ہے کہ انڈیا کی فلاں فلم کا ٹائٹل سونگ ہٹ ہو گیا ہے، انڈین اداکاروں کی برسی اور سالگرہ، وزن کی کمی اور بیشی اور مقبولیت کے گراف کے بارے میں لمحہ بہ لمحہ خبریں دینا کیا ضروری ہے؟۔ اسی طرح رپورٹنگ کے نام پر بے حیائی کے ایسے مناظر دکھانا، جس میں اخلاقیات کی ساری حدیں پامال ہو جائیں، کیا ضروری ہے؟۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

(۱) ''بے شک جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی کی بات پھیلے، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور (تمہارے افعال کا انجام) اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''۔ (النور:19)

(۲) ''اور جب وہ کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے ان کاموں پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور ہمیں اللہ نے ان کاموں کا حکم دیا ہے، آپ کے لیے بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہو، جن کا تمہیں علم نہیں ہے''۔ (الاعراف:28)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(۱) ''حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے''۔ (بخاری:09)

(۲) ''جب تم میں حیا نہ رہے، تو پھر جو چاہو کرتے پھرو (کیونکہ حیا ہی نفسِ انسانی کا ایسا وصف ہے، جو اخلاقیات کی حدوں کو پامال کرنے سے روکتا ہے)''۔ (بخاری:6120)

(۳) حیا اور کم گوئی ایمان کی دو شاخیں ہیں، فحش کلامی اور کثرتِ کلام نفاق کی دو شاخیں

ہیں۔(ترمذی:2027)

(۴) ''نبی کریم ﷺ گالی دینے والے، فحش کلامی کرنے والے، لعنت کرنے والے اور فحاشی کرنے والے کو پسند نہیں فرماتے تھے''۔(سنن دارمی)

اسی طرح موت کے مناظر کو کس حد تک دکھانا چاہیے اور اگر میت کے ہیئت بم بلاسٹ یا آگ میں جل جانے کی وجہ سے مسخ ہوگئی ہے، تو شریعت کا حکم میت کے عیوب پر پردہ ڈالنا ہے، اسی طرح اگر ڈاکٹر نے پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھ دیا ہے کہ سر، سینے اور جسم کی ساری ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں اور محض کسی ایک جزوِ بدن سے اسے پہچانا گیا۔ کیا یہ تمام تفصیلات ٹیلی ویژن پر بتانا ضروری ہیں اور کیا اس سے میت کے لواحقین اور متعلقین کے ذہنوں میں یہ خدشات پیدا نہیں ہوں گے کہ تابوت میں کیا ہے، ہم نے کس کا جنازہ پڑھا اور کس کی تدفین کی؟۔ لہٰذا دوسروں کے انسانی جذبات کا خیال رکھنا چاہیے۔ ایک مخبوط الحواس شخص سکندر حیات کے ڈراموں کو مسابقت کی فضاء میں گھنٹوں دکھایا گیا، بلکہ بعض چینلز نے تین تین کیمرے فٹ کرر کھے تھے کہ بیک وقت کوئی بھی پہلو ناظرین کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو، کیا بیس کروڑ پاکستانی اور بیرونِ ملک پاکستانیوں کی نبض کو اتنے عرصے تک ساکت و جامد رکھنا ضروری تھا؟۔

امریکا اور مغربی ممالک جہاں سے ہم نے میڈیا اور صحافت کی آزادی کی روایات لیں، وہاں بھی اِکّا دُکّا دہشت گردی کے واقعات ہوجاتے ہیں، لیکن گھنٹوں اور دنوں تک سانسیں روک کر اس طرح کی کوریج نہیں دی جاتی، انہیں اپنی قومی ترجیحات بھی معلوم ہیں اور آزادی کی حدود بھی معلوم ہیں، لیکن شاید ہمیں اس فکری پختگی تک پہنچنے میں یقیناً کچھ وقت لگے گا۔

طنز و مزاح ہمارے بلکہ دنیا کے ہر ادب کی ایک مقبول صنف ہے اور اب الیکٹرونک میڈیا اسے بہت مہارت کے ساتھ استعمال کر رہا ہے، شخصیات کے تھری ڈی کارٹون بھی عجلت میں بن جاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ مناسب نہیں کہ تحقیر، تذلیل، اہانت اور طنز و مزاح میں

فرق ملحوظ رکھا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی چند مواقع پر مزاح فرمایا، لیکن نہایت لطیف اور حسین پیرایۂ اظہار کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا، مثلاً:

(۱) ''ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ مجھے سواری کے لیے جانور عطا فرما دیجیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تجھے اونٹ کے بچے پر سوار کرتا ہوں''، سائل نے عرض کی: یارسول اللہ! میں اونٹنی کے بچے کا کیا کروں گا؟، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر اونٹ کسی اونٹنی کا بچہ ہی تو ہوتا ہے''۔ (شمائل ترمذی:246)

(۲) ''ایک بوڑھی خاتون نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئیں اور عرض کی یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ وہ مجھے جنت میں داخل فرمادے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس خاتون کا نام لے کر) فرمایا: اے اُمِ فلاں! جنت میں کوئی بڑھیا داخل نہیں ہوگی، راوی بیان کرتے ہیں کہ یہ سن کر وہ خاتون روتے ہوئے لوٹنے لگیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِسے بتاؤ کہ بڑھاپے کی حالت میں وہ جنت میں داخل نہیں ہوگی (بلکہ اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو دوبارہ جوان بنادے گا)، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''ہم نے ان عورتوں کو اِس طرح بنایا ہے کہ وہ ہمیشہ کنواریاں ہی رہتی ہیں، (الواقعہ:35 تا 37)''۔ (شمائل ترمذی:246)

قرآن مجید مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کا حقارت آمیز انداز میں تمسخر اڑانے، ایک دوسرے کی عیب جوئی کرنے، ایک دوسرے کو توہین آمیز ناموں سے پکارنے، ایک دوسرے کے بارے میں بدگمانی کرنے، دوسروں کے پوشیدہ احوال کا سراغ لگانے اور غیبت کرنے سے منع فرمایا اور غیبت کے گھناؤنے پن کو ایک عبرت ناک مثال کے ذریعے بیان فرمایا، اسی طرح دوسروں کی (صورت وسیرت کے بارے میں الفاظ، اشارات وکنایات، تحریر کے ذریعے) عیب جوئی کرنے اور طعن وتشنیع کرنے والوں کو سخت وعید فرمائی۔

لہٰذا میڈیا مالکان سے ہم عاجزانہ گزارش کرتے ہیں کہ رضاکارانہ طور پر باہمی اتفاقِ رائے سے کوئی نہ کوئی حدود مقرر کریں، جو قانونی بندھن کے ذریعے نافذ نہ ہوں بلکہ

اخلاقی بندھن کے ذریعے نافذ ہوں، یعنی ہر ادارے کا سربراہ اپنے آپ کو قانون کے سامنے جوابدہ سمجھنے کے بجائے اپنے ضمیر اور اللہ تعالیٰ کی عدالت میں جوابدہ سمجھے، کیونکہ ہم آئے دن کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ چھوٹے اور بڑے کے لیے، غریب اور امیر کے لیے باوسائل اور بے وسیلہ کے لیے قانون کی تنفیذ کے معیارات بدل جاتے ہیں، قانون کو فریب دیا جاسکتا ہے، قانون کو خریدا جاسکتا ہے، دولت، جبر، رسوخ، دہشت اور اقتدار کی طاقت سے قانون کو بے بس بنایا جاسکتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی ذات قادرِ مطلق ہے، اس پر کسی کا زور اور فریب نہیں چلتا۔

27 جنوری 2014ء

قومی اتفاقِ رائے کی ضرورت

بجا طور پر یہ کہا جا رہا ہے کہ موجودہ مشکلات کے دور سے نکلنے کے لیے ہمیں وسیع پیمانے پر قومی اتفاقِ رائے کی ضرورت ہے اور اگر یہ گرانقدر گوہرِ مقصود ہمیں مل جائے تو موجودہ وقت میں یہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ لیکن قرنِ اوّل سے یہ بحث چلی آ رہی ہے کہ آیا مکمل اتفاقِ رائے یا اجماعِ کُلّی (Total Consensus) ممکن ہے؟۔ یہ عقلاً تو ناممکن نہیں ہے، لیکن عادتاً اس کا حصول ممکن نہیں رہتا۔ اسی لیے متقدمین نے ہر عہد کے اہل الرائے کے ''اجماعِ کلی'' کو کافی قرار دیا ہے۔ ہماری سیاست بھی منقسم ہے اور دہشت گردی سے نکلنے کے لیے کسی ایک حکمتِ عملی پر اتفاقِ رائے بھی نہیں ہے۔ ماضی میں ہماری سیاست اور صحافت میں دائیں بائیں کی تقسیم تھی، اب یہ تقسیم موجود نہیں ہے، کیونکہ جب بائیں بازو کا قبلہ ہی نہیں رہا تو اب وہ کس کی طرف رخ کر کے اقتدا کریں۔ عالمی سیاست پر تا حال امریکا کی اجارہ داری ہے۔ ہمارے ہاں صحافت میں کچھ لوگ لبرل کہلاتے ہیں اور دوسروں کو آپ قدامت پسند یا مذہبی رجحانات کا حامل کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے انتشار اور تفریق بہر حال موجود ہے۔

اگر مکمل اتفاقِ رائے پر اہم پالیسی امور کو موقوف کر دیا جائے تو ایک طرح سے تعطّل پیدا ہو جائے گا اور قومی پالیسی بے عملی اور جمود کا شکار ہو جائے گی اور ہم بحیثیتِ قوم قوتِ فیصلہ سے محروم ہو کر حالات کے رحم و کرم پر رہ جائیں گے۔ ہمارے ہاں سیاست گروہی مفادات تک محدود رہتی ہے اور بد قسمتی سے ہماری سیاسی قیادتیں اپنے اپنے محدود گروہی مفادات

سے بلند تر ہو کر قومی ترجیحات کو اختیار کرنے میں ہچکچاتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ باہمی منافقت اور مقابل سیاسی حریف کو نیچا دکھانے یا ناکام دیکھنے میں ہم اپنی کامیابی سمجھتے ہیں، خواہ اس روش سے ملک کو کتنا ہی نقصان پہنچے۔

لہٰذا مکمل اتفاقِ رائے کی تخیلاتی منزل (Utopia) کے سحر میں مبتلا رہنے کے بجائے پہلے مرحلے میں باہمی اعتماد سازی کو ترجیح دینی چاہیے۔ خواہ کتنی ہی کل جماعتی کانفرنسیں منعقد کر لی جائیں براہِ راست ذمے داری برسرِ اقتدار حکمران ہی کو قبول کرنی ہوتی ہے، دوسرے اگر اس قدر تعاون کر لیں کہ حکومتِ وقت کو کمزور نہ کریں تاکہ ملک اس مشکل سے سرخرو ہو کر نکل جائے تو اسے بھی غنیمت سمجھنا چاہیے۔ سیاسی محاذ آرائی کا راستہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ یہ اتنا حساس اور نازک مرحلہ ہے کہ مذہبی رہنما بھی دوٹوک بات نہیں کرتے، محتاط انداز میں بات کرتے ہیں، نجی مجالس میں ریاست سے متصادم عناصر کے موقف اور اقدامات کو غلط قرار دیں گے، مگر برسرِ عام ذو معنیٰ بات کریں گے۔ سب جانتے ہیں کہ مذاکرات ایک انتہائی پیچیدہ مُہم ہے، جس کا نہ سر ہے نہ پاؤں، کس سے کریں اور کس سے نہ کریں، کون آمادہ ہے اور کون نہیں ہے، جو مذاکرات پر آمادہ نہیں ہیں اُن سے کیسے نمٹا جائے گا، آپ کے پاس دینے کو کیا ہے اور اس سودا کاری میں حاصل کیا ہوگا، کسی کے پاس واضح جواب نہیں ہے، بس ہم ایک تاریک گلی کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔

مولانا فضل الرحمن مسلّمہ طور پر ایک زیرک سیاست دان ہیں، انہوں نے اس حقیقت کا ادراک کر لیا ہے کہ مروّجہ سیاست میں اقتدار میں شامل رہنا اپنے سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہے۔ جناب آصف علی زرداری کو بھی اُن کی اسی قدر خیرات پر اکتفا کرنی پڑی اور اب جناب نواز شریف کے حصے میں یہی تعاون آیا ہے۔ لہٰذا وہ حکومتی مناصب اور مفادات سے بھی مستفید ہوتے ہیں اور حکومتی پالیسیوں کی ذمے داری بھی اپنے سر نہیں لیتے۔ بلکہ نہایت صفائی کے ساتھ دامن جھاڑ کر نکل جاتے ہیں، البتہ ان میں اتنی

وضع داری ضرور ہے کہ حکومت کے لیے مسائل پیدا نہیں کرتے اور شاید اس قدر حمایت کو بھی حکومت غنیمت سمجھتی ہے۔ موجودہ صورتِ حال کے بارے میں مذہبی سیاسی جماعتیں اور علماء کے مؤثر طبقات بھی مصلحت کا شکار ہیں یا وہ ایسا کرنے پر مجبور ہیں، کیونکہ ریاست سب کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام ہے۔ میں نے مولانا سمیع الحق کا کچھ عرصہ قبل یہ بیان پڑھا تھا کہ احسان اللہ احسان جو طالبان کے ترجمان کے طور پر میڈیا سے روابط قائم کیے ہوئے ہے، درحقیقت اس نام کا کوئی شخص موجود نہیں ہے۔ لیکن بعد میں احسان اللہ احسان، شاہد اللہ شاہد اور حال ہی میں اعظم طارق نے میڈیا سے روابط قائم کر کے اپنا موجود ہونا ثابت کیا ہے۔

صورتِ حال یہ ہے کہ صوبہ خیبر پختونخوا اور قبائلی علاقوں کے بیشتر رہنما و زعماء عملاً علاقہ بدر ہیں، باوسائل لوگ اسلام آباد منتقل ہو چکے ہیں اور کچھ نے دیگر مقامات پر رہائش اختیار کرلی ہے۔ پاکستان میں دہشت گردی کے واقعات میں کافی پھیلاؤ آگیا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ عناصر اب ملک میں ہر جگہ موجود ہیں اور کوئی مقام یا فرد ان کی رسائی سے باہر نہیں ہے۔ یہ مقامِ حیرت ہے کہ منوں کے حساب سے بارودی مواد اور انتہائی حساس جدید ترین آتشیں اسلحہ، جاسوسی کی ٹیکنیک اور پیشہ وارانہ مہارت اور پیغام رسانی کا جدید ترین نظام جو حساس اداروں کی گرفت سے ماورا ہو کر کام کرے، ان عناصر کو کیسے حاصل ہوا اور اس کی گہرائی اور گیرائی کا دائرہ اتنا وسیع کیسے ہوا کہ وہ جب چاہیں اور جہاں چاہیں اپنے ہدف کا تعین بھی کر سکتے ہیں اور اسے نشانہ بھی بنا سکتے ہیں، یہ پوری قوم کے لیے لمحۂ فکریہ ہے، اس صورت میں جب کہ ہماری مسلح افواج اگر جدید ترین نہیں تو جدید تر ضرور ہیں۔

جناب عمران خان شاید خود بھی کنفیوزڈ ہیں اور میڈیا بھی ان کی پالیسی، ترجیحات اور دانش کے بارے میں سوال اٹھا رہا ہے۔ ان کا وزیر اعظم نواز شریف سے سیاسی اختلاف اور رقابت بجا، لیکن یہ پاکستان کی سلامتی کی قیمت پر نہیں ہونی چاہیے اور وزیر اعظم، چیف

آف آرمی اسٹاف اور ڈی جی آئی ایس آئی کے ساتھ ان کی ایک مشترکہ میٹنگ بھی ہونی چاہیے، کیونکہ دستیاب حقائق کی روشنی میں قومی سلامتی کے کسی کم از کم ایجنڈے پر اتفاقِ رائے ضروری ہے اور اس کے لیے وزیرِ اعظم کو خود پیش قدمی کرنی چاہیے۔

ہمیں نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ قومی تاریخ کے اس نازک موڑ پر داخلی سلامتی کے ذمے دارانہ منصب پر فائز ہونے کے بعد وزیرِ داخلہ جناب چوہدری نثار علی خان نے کسی اعلیٰ دانش یا اہلیت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ قائدِ حزبِ اختلاف کی حیثیت سے ان کا جوہرِ خطابت مسلّم، مگر اب ملک کو ایک صاحبِ بصیرت اور قوتِ فیصلہ کے حامل وزیرِ داخلہ کی شدید ضرورت ہے۔ وزیرِ داخلہ نے اس حساس مسئلے پر صرف ایک مکتبۂ فکر کے علما پر اعتماد کیا اور انہی کو اعتماد میں لیا اور دیگر مکاتبِ فکر کے علماء کو انہوں نے قابلِ اعتماد نہیں سمجھا، یا یہ خاموش پیغام دیا کہ ریاست وحکومت کی نظر میں وہی علماء قابلِ اعتماد ہیں، جن کے مخصوص طبقات کے ساتھ روابط ہیں۔ ہماری نظر میں یہ ان علماء کا بیک وقت مثبت پہلو بھی ہے اور منفی بھی، کیونکہ اس سے پہلے مدارس کی تنظیمات بھی برملا یہ اعلان کرتی تھیں کہ مدارس کا کسی انتہا پسند تحریک، گروہ یا طبقے سے کوئی تعلق نہیں ہے، مدارس کا کام صرف دینی تعلیم کا فروغ اور نشر واشاعت ہے۔ مدارس کے سربراہان کی طرف اس حوالے سے انگلی اٹھائی جائے اور نہ ہی اُن سے کوئی جواب طلبی کی جائے؛ مگر اب یہ امر تو طے ہوگیا کہ ریاست وحکومت اور ان علماء نے ان عناصر سے روابط کو بھی تسلیم کیا اور ان پر اپنے اثر انداز ہونے کی صلاحیت کو بھی ایک کریڈٹ کے طور پر لیا ہے۔

اس وقت پاکستان مسائلستان بنا ہوا ہے، مہنگائی کا عفریت، بجلی کا بحران، بے روزگاری میں روزمرہ اضافہ الغرض مسائل کا انبار ہے۔ لیکن سب سے اہم مسئلہ ملک کی داخلی اور خارجی سلامتی کا ہے، جب لوگوں کی جان، مال اور آبرو کو خطرات لاحق ہوں اور کوئی اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھے تو باقی سارے مسائل پس پشت چلے جاتے ہیں اور ہماری مسلح

افواج اگر مستقل طور پر داخلی خلفشار کو قابو پانے میں مصروف رہیں۔ تو ملکی سرحدات پر اُن کی دفاعی صلاحیت یقیناً متاثر ہوگی۔ فی الوقت ہماری اَفواج کا تربیتی نظام بیرونی جارحیت کے خلاف ہے اور اگر داخلی فساد ایک حد سے تجاوز کر جائے تو پھر مسلح افواج کو اسے کنٹرول کرنے کے لیے اپنے پورے تربیتی نظام پر نظرِ ثانی کرنی ہوگی یا متبادل فورس اور نظام وضع کرنا ہوگا اور ہمارے محدود وسائل کے اندر رہتے ہوئے مشکلات پیدا ہوں گی۔

24 جنوری 2014ء

امریکا میں مسلمانوں کے احوال

(قسط اوّل)

اُمتِ مسلمہ کا اصولی موقف اور دعویٰ تو یہی ہے، جسے علامہ اقبال نے اپنے پُرتاثیر کلام میں منظوم کیا ہے کہ:

بتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ ایرانی رہے باقی، نہ تورانی، نہ افغانی

مولانا جامی نے بھی بہ اندازِ دگر یہی پیغام دیا:

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

لیکن عہدِ حاضر میں یہ اکیڈمک یا ٹیکسٹ بک تصورِ اسلام بن کر رہ گیا ہے۔ آج کا مسلمان عملاً ایک ملت اور اُمت کے تصور میں ڈھل نہیں سکا، نہ بتانِ رنگ وخوں کو توڑ سکا، نہ نسبی تفاخر کے حصار سے نکل سکا، بلکہ اس نے کئی اور بت تراش لیے۔ غالب نے کہا تھا:

ع: ''کردیا کافر ان اَصنامِ خیالی نے مجھے''

اور فارسی شاعر نے کلمہ گو مسلمان کی تصویر کشی یوں کی:

ع: ''بر زبان تسبیح ودر دِل گاؤ خر''

لہٰذا اُمتِ مسلمہ کا حال قابلِ رحم ہے۔ میں چند روز کے لیے دینی پروگراموں میں شریک ہونے امریکا آیا ہوا ہوں۔ میں جب بھی آتا ہوں میرا ایک پروگرام ٹینیسی اسٹیٹ کے شہر

جانسن سٹی میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر خالد اعوان نے ورجینیا اسٹیٹ میں ایک علمی حلقہ بنایا ہوا ہے، اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کے علاوہ وہ پورا وقت دینی اور علمی کاموں پر صرف کرتے ہیں اور ہر ہفتے ایک وقیع علمی نشست منعقد ہوتی ہے۔ انہوں نے تقریباً تمام مکاتبِ فکر کے علماء کی اُردو میں دستیاب تفاسیر وشروحِ حدیث کو نہ صرف لائبریری کی زینت بنا رکھا ہے بلکہ تمام تر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ان کا مطالعہ بھی کر رکھا ہے، بحیثیتِ مجموعی وہ ہمارے شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی سے بہت متاثر ہیں، انہوں نے تفسیر تبیان القرآن، شرح صحیح مسلم اور نعمۃ الباری شرح بخاری کا تفصیلی مطالعہ کیا ہوا ہے۔ ٹینیسی اسٹیٹ میں ڈاکٹر شہرام ملک جواں عمر ہیں، دین دار ہیں اور اہلِ دین سے محبت کرتے ہیں۔ یہاں پاکستانی کمیونٹی محدود ہے، مگر تقریباً تمام حضرات پروفیشنل ڈاکٹر، آئی ٹی اسپیشلسٹ، پروفیسرز یا سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے سے وابستہ ہیں، اکثر حضرات میاں بیوی دونوں پروفیشنل ہیں، یہی صورتِ حال ہندوستانی مسلمانوں کی ہے۔

ڈاکٹر شہرام ملک اور اُن کی بیگم بہت مہمان نواز بھی ہیں اور اپنے گھر پر نشست کا اہتمام کرتے ہیں اور ورجینیا اور ٹینیسی دونوں ریاستوں سے اپنے ہائی پروفیشنل دوستوں کو ان کی فیملی سمیت بلاتے ہیں اور رات کا بیشتر حصہ خطاب کے بعد سوال وجواب کی نشست ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو اسلام اور پاکستان کے ساتھ قلبی لگاؤ ہے، عربی کا مقولہ ہے کہ اشیاء کی حقیقت یا اہمیت کا صحیح ادراک ان کے اضداد (Opposites) کو جاننے، برتنے اور تقابل (Comparison) کے بعد ہوتا ہے۔ اس کا مجھے ان لوگوں کے ساتھ طویل نشستیں کرنے سے بخوبی اندازہ ہوا اور مجھے خود بھی ان حضرات کی مجالس سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ لوگ سو ڈیڑھ سو میل بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ فاصلہ طے کر کے آتے ہیں۔ درحقیقت یہ وہ لوگ ہیں جو مسلم "By Chance" کی موروثی روش سے ارتقاء کر کے مسلم "By Option" کی منزل کو پالیتے ہیں یعنی محض موروثی اور روایتی مسلمان نہیں ہیں بلکہ انہوں نے شعوری طور پر اسلام کو قبول کیا ہے اور ایسے لوگ ہی

دراصل اسلام کا اثاثہ ہوتے ہیں۔

امریکا اور کینیڈا پر مشتمل براعظم کو نارتھ امریکا کہتے ہیں، یہ دونوں ممالک رقبے کے لحاظ سے بہت وسیع ہیں، کینیڈا کا رقبہ امریکا سے بھی بڑا ہے۔ جیسا کہ تمام باشعور قارئین جانتے ہیں کہ آج کی دنیا تین اکائیوں میں منقسم ہے، یعنی ترقی یافتہ ممالک، ترقی پذیر ممالک اور پسماندہ ممالک۔ پسماندہ ممالک کو تیسری دنیا کہا جاتا ہے، دوسری دنیا ترقی پذیر ممالک پر اور پہلی دنیا ترقی یافتہ ممالک پر مشتمل ہے، جن کو کبھی G-8 اور کبھی G-18 کا نام دیا جاتا ہے، معاشی ترقی کے اعتبار سے یہ تین الگ الگ کلب ہیں۔ لیکن یہاں آکر یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ سائنس اور سپر ٹیکنالوجی کے اعتبار سے امریکا اور ترقی یافتہ ممالک میں بھی فاصلہ (Gap) بہت ہے۔

اصل قیادت امریکا ہی کے پاس ہے، جیسے معروف کہاوت ہے کہ شیر جب شکار کرکے خود سیر ہوجاتا ہے، تو اُس کا پس خوردہ جنگل کے دوسرے جانور آکر کھاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح امریکا جب سائنس، ٹیکنالوجی اور جدید علوم میں ارتقا کے سفر میں اگلی منزل پر قدم رکھتا ہے، تو اس کا سائنٹیفک اور ٹیکنالوجیکل پس خوردہ بتدریج دوسری اقوام کے حصے میں آتا ہے۔ یعنی علمی، فنی اور سائنسی میدان میں اس کا اثاثہ جب اس کے لیے اَزکاررفتہ (Out Dated) ہوجاتا ہے، تو کوڑے دان میں پھینکنے کے بجائے وہ اسے سونے کے بھاؤ یا من پسند قیمت اور شرائط پر دوسروں پر فروخت کرتا ہے۔

یہ حقائق بیان کرنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ لوگ امریکا کی خدائی پر ایمان لے آئیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوجائیں۔ بلکہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ مقام اس نے ذہانت وقابلیت، وسائل کے حصول، ان کے صحیح استعمال، مسلسل محنت اور جانفشانی سے حاصل کیا ہے۔ اس میں حکمت وتدبیر، بہتر منصوبہ بندی، اپنی قوم اور وطن سے وفا اور دور بینی ودُور اندیشی بنیادی عناصر ہیں۔ ماضیِ قریب کی سپر پاورز نے امریکا پر احسان کرکے اس کے لیے جگہ خالی نہیں کی بلکہ امریکا نے طاقت وحکمت سے انہیں پیچھے دھکیل کر

قیادت پر قبضہ کیا ہے اور تا حال اس کے لیے مستقبلِ دیدہ (Near Future) میں کوئی بڑا چیلنج نظر نہیں آرہا۔ یقیناً اَخلاقی اور بعض دیگر شعبوں میں امریکا کی کمزوریاں اور منفی پہلو بھی بہت ہیں، جن کی نشاندہی ہمارے دانشور کرتے رہتے ہیں، مگر بعض حقائق بادلِ نخواستہ تسلیم کرنا پڑتے ہیں۔

امتِ مسلمہ کے لیے ان رفعتوں کو حاصل کرنے میں رکاوٹ ہم خود ہیں، قدرت کی طرف سے کسی کے آگے جابرانہ رکاوٹیں (Barriers) نہیں ہیں۔ یہ مقابلے اور مسابقت کی دنیا ہے اور انسانی تاریخ کے ہر دور میں اُس عہد کی فرعونی اور نمرودی قوتوں کا سکۂ رائج الوقت یا شِعار Survival of the Fittest ہی رہا ہے، یعنی باعزت وباوقار اور قابلِ افتخار حیثیت میں جینے کا حق اُسی کو حاصل ہے، جو مادّی طاقت کے بل پر اپنے آپ کو اس کا اہلِ ثابت کرے۔ صرف انبیائے کرام اور رسلِ عظام علیہم السلام اور بطورِ خاص خاتم النبیین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کا استثنا ہے کہ آپ نے مادّی غلبے اور فتح مبین کے بعد بھی طاقت کو الہامی ہدایت اور اَخلاقی برتری کے تابع رکھا اور اپنی عظمت کے آگے گردنوں کو سرنگوں کر کے اپنی اَنا کی تسکین کا سامان نہیں کیا۔ بلکہ اپنے تراشے ہوئے بتوں کے آگے سجدہ ریز انسانوں کو سربلند کر کے معبودِ مطلق کے آگے سربہ سجود کر دیا اور لوگوں کے دل آپ کی عظمت کے آگے خود سراپا عقیدت ومحبت بن گئے اور کسی نے سچ کہا ہے کہ:

ع: ''جو دلوں کو فتح کر لے، وہی فاتحِ زمانہ''

مادّی برتری پر زوال آتا رہا ہے اور آتا رہے گا، لیکن اَخلاقی برتری کو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ پذیرائی (Acceptability) ملتی رہی ہے اور ملتی رہے گی۔ آج نمرود کا نام لیوا کوئی نہیں ہے، جب کہ ابراہیم علیہ السلام کا نام ومقام آج پہلے سے بھی زیادہ سربلند ہے۔ آج ابوجہل کا ہمنوا کوئی نہیں ہے، لیکن رحمۃ للعالمین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے نام پر جان فدا کرنے والے کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ آج کوئی بھی سرِ عام افتخار کے ساتھ اپنے آپ کو یزید اور یزیدیت کی طرف منسوب نہیں کرتا، مگر امام حسین رضی اللہ عنہ کے نام لیوا ان

سے نسبت اور ان کی ذات سے عقیدت ومحبت کو اپنے لیے سب سے بڑا افتخار سمجھتے ہیں۔

لیکن یہ بھی سنتِ الٰہیہ ہے کہ امامت (Leadership) دینی ہو یا دنیاوی، اِس منصب پر فائز ہونے کے لیے اپنی اہلیت کو ثابت کرنا ہوگا اور قوموں کے عروج وزوال کا جو میرٹ اور معیار ہے، اس پر پورا اُترنا ہوگا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اے اہلِ ایمان! تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے گا، تو عنقریب اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ لینے کے لیے ایک ایسی (اہلیت کی حامل) قوم کو لائے گا، جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اُس سے محبت کریں گے اور جو مومنوں کے لیے (اپنے دل میں) نرمی رکھیں گے اور کافروں کے مقابلے میں سخت ہوں گے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور (دین کے معاملے میں) کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہیں کریں گے، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا اور خوب علم والا ہے''۔(المائدہ:45)۔(جاری ہے)

31 جنوری 2014ء

فروری 2014ء

امریکا میں مسلمانوں کے احوال

(آخری قسط)

امریکا میں اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اپنی پہلی تنظیم مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن 1963ء میں قائم کی اور اس کی پہلی کانفرنس یونیورسٹی آف اِلونائے میں منعقد ہوئی۔ 1982ء میں اس تنظیم نے ''اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکا (ISNA)'' کے نام سے اپنی تشکیل نو کی اور ''اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن'' اور ''ایسوسی ایشن آف مسلم سوشل سائنٹسٹس اینڈ انجینئرز'' بھی اس میں ضم ہوگئیں۔ 2001ء تک ڈاکٹر مزمل صدیقی اس کے صدر تھے اور اب وہ غالباً اس کی ''فتویٰ کونسل آف نارتھ امریکا'' کے سربراہ ہیں اور اب محمد ماجد اس کے صدر ہیں، جن کی دوسری مدتِ صدارت 2014ء میں مکمل ہوگی اور صفا زرزور اس کے سیکریٹری جنرل ہیں۔ سعودی عرب میں جب سے دولت کی فراوانی ہوئی ہے، وہ اس طرح کی تنظیموں کو دل کھول کر مالی وسائل فراہم کرتا ہے تاکہ اُس کے مذہبی نظریات ان تنظیموں پر غالب رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تنظیم اپنی وحدت قائم نہ رکھ سکی اور اس کے بطن سے ''اسلامک کونسل آف نارتھ امریکا (ICNA)'' وجود میں آئی، اگرچہ ان دونوں گروپوں میں کوئی بڑا نظریاتی فرق نہیں ہے۔

امریکا میں مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد ہے، مگر یہاں کی سول سوسائٹی میں ان کا وزن اور سیاسی وسماجی اثر ورسوخ ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق نہیں ہے اور اُس کا سبب وہی تقسیم در تقسیم کا عمل ہے۔ چنانچہ ہوتا یہی ہے کہ ایسی تنظیموں میں قیادت کے

منصب پر فائز لوگ اپنی حیثیت کو امریکی اسٹیبلشمنٹ میں اپنا ذاتی اثر ورسوخ بڑھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور مسلمانوں کا اجتماعی مفاد پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ اس کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ لبرل، روشن خیال اور نظریاتی اعتبار سے ہر طرح کے ماحول میں ڈھل جانے والا (Adjustable) ثابت کریں اور ISNA کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

امریکا میں ایک گروپ LGBT ہے، یعنی Bysexual, Gays, Lizbian اور Transgender کا مخفف ہے یعنی ہم جنس پرست عورتیں اور مرد، دونوں طرح کا ابلیسی ذوق رکھنے والے اور اپنی مرضی سے جنس (Sex) تبدیل کرنے والے مرد اور عورتیں۔ قومِ لوط نے گناہ اور غیر فطری عمل پر شرمسار ہونے کے بجائے اسے افتخار بنادیا اور اس جرم کی پاداش میں ان پر اللہ کا عذاب آیا، اُن کی بستی تہ وبالا کردی گئی، آسمان سے اُن پر سنگ باری ہوئی اور ان کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹادیا گیا۔ اُردن میں سدوم کی تباہ شدہ بستی آج بھی انسانیت کے لیے درسِ عبرت ہے۔

یہ گروپ کافی عرصے سے ایک مہم چلا رہا تھا اور ان کی اس مہم کے نتیجے میں آخر کار ENDA یعنی اِس طبقے کے لیے ملازمتوں میں عدمِ امتیاز کا قانون 2013ء میں امریکی سینٹ سے پاس ہوگیا۔ اس قانون پر امریکی سینٹ کی کمیٹی برائے صحت، تعلیم، لیبر اور ثقافت (HELC) میں کئی عشروں سے کام ہو رہا تھا اور حقوقِ انسانی کی مہم (HRC) کے نام سے ایک NGO اس پر کام کررہی تھی۔ 1995ء سے کانگریس اس قانون کی مزاحمت کرتی چلی آرہی تھی، مگر بالآخر یہ قانون سینٹ سے پاس ہوگیا۔

اس پس منظر کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ساتھ دوسرے مذہبی گروپوں کے ساتھ اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکا نے بھی اس کی حمایت کی۔ HRC کی ڈائریکٹر شرون گروو نے لکھا: ''LGBT کے نظریات کے حامل مسلمانوں کو ISNA جیسی تنظیموں کی آواز کو سننا چاہیے تاکہ انہیں پتا چلے کہ بحیثیت مسلمان اُن کے ہم جنس پرستی کے نظریات کو تسلیم

کیا جا چکا ہے"۔

اور HRC کے منیجر مائیکل تومایان نے لکھا:

"آج مسلمان LGBT کمیونٹی کا اہم جُز یعنی Cornerstone ہیں"۔

یہ کارنامہ ISNA نے خاموشی سے انجام دیا تھا، مگر HRC نے اپنی ویب سائٹ پر ڈال کر یہ راز طشت از بام کر دیا اور اس نے باشعور اور اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ اسی طرح ISNA رویتِ ہلال کے مسئلے پر بھی امریکی مسلمانوں کی تقسیم در تقسیم کا باعث بنی اور اس سال ان کا رمضان المبارک اور عید کے موقع پر سعودی عرب سے بھی اختلاف رونما ہوا۔

ڈاکٹر خالد اعوان نے اس پر انگریزی میں ایک انتہائی مفصل اور مدلّل مقالہ لکھا، یہ ایک وقیع علمی دستاویز ہے۔ اِس مقالے میں اُنہوں نے قرآن، حدیث اور فقہ سے مُفصّل دلائل دیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے بائبل یعنی عہد نامۂ قدیم اور عہد نامۂ جدید سے بھی حوالے دیے ہیں کہ زِنا، عملِ قومِ لوط اور اِس طرح کے اَخلاقی جرائم کا ارتکاب کرنے والے سزائے موت کے حقدار ہیں۔ ڈاکٹر خالد اعوان نے بہت محنت کی ہے اور امریکا میں ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کی ایک گرانقدر علمی کاوش ہے۔ مگر مجھے حیرت ہوئی کہ نیویارک وغیرہ میں ہمارے عام علماء اس سے بے خبر تھے، حالانکہ انہیں علمی میدان میں مسلمانوں کی مثبت انداز سے رہنمائی کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر خالد اعوان نے ISNA کو "ابلیسی سوسائٹی آف نارتھ امریکا" قرار دیا اور ان کے اس اقدام کو دینِ اسلام سے انحراف اور بغاوت قرار دیا۔ ENDA ایکٹ کی منظوری نہ تو مسلمانوں کی حمایت پر موقوف تھی اور نہ ہی مسلمانوں کو اس پر رائے دینا ضروری تھا۔ چنانچہ "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کے مصداق ISNA کے صدر نے اپنا موقف تارِ عنکبوت کی طرح انتہائی بودے انداز میں بیان کیا:

ISNA نے ENDA کی حمایت میں خط کیوں لکھا؟۔ ISNA نے خود (یعنی کسی

کے پوچھے بغیر) ایک سوال اٹھایا کہ:

''آیا ایک مستاجر (Employer) کو یہ حق حاصل ہے کہ ایک اجیر (Employee) کو کارکردگی کے علاوہ کسی اور وجہ سے ملازمت سے برطرف کر سکے؟ یعنی کیا ایک ملازم کو اس کے مذہبی یا ثقافتی معمولات کی بنا پر ملازمت سے نکالا جا سکتا ہے، جیسے حجاب کا استعمال یا جنسی بے راہ روی''۔

حجاب کی بنا پر تو فرانس، ہالینڈ اور سوئٹزرلینڈ وغیرہ میں امتیازی قوانین بن چکے ہیں۔ ISNA کے صدر نے ہم جنس پرستی کو مذہبی تعلیمات اور اقدار کے برابر درجہ دیا اور اسے ثقافتی عمل کا نام دیا۔ ISNA کے صدر ماجد نے لکھا:

''ہم نے خود سے سوال کیا کہ کیا ہم مذہبی و اخلاقی اقدار اور حقوق انسانی کے درمیان کوئی خطِ امتیاز کھینچ سکتے ہیں؟''۔

وہ ہم جنس پرستی کو کبھی Cultural Practice (ثقافتی عمل) اور کبھی Lifestyle (شعارِ زندگی) سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ لفظوں کے ہیر پھیر سے کام لے کر قرار دیتے ہیں کہ ہم کسی کے طرزِ زندگی یعنی Life Style سے اختلاف کا حق تو رکھتے ہیں، لیکن اس کے لیے اپنا من پسند طرزِ زندگی یعنی ہم جنس پرستی کو اختیار کرنے کے حق کی حمایت کریں گے۔

یہی وہ طرز استدلال ہے جس کے تحت امریکا اور اہلِ مغرب ''اظہارِ رائے کی آزادی'' کے عنوان کے تحت اہانتِ رسول اور اہانتِ مذہب کا شعار اختیار کرنے والوں کو تحفظ دیتے ہیں اور اسے ان کا بنیادی حق قرار دیتے ہیں۔ الغرض ان امور میں اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکا کا اصولی موقف اہلِ مغرب اور امریکا کے ساتھ ہے۔

یہ ''ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ'' یا ''آ بیل مجھے مار'' والی بات ہے، کیونکہ اپنے دستور اور منشور کے اعتبار سے ISNA پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات اور اسلام کے قطعی احکام سے متصادم کسی بات کے حق میں یا خلاف رائے دیں۔ یعنی اگر ان میں اظہارِ حق کی جرأت نہیں ہے تو باطل کی حمایت کی مذموم جسارت تو نہیں کرنی چاہیے، لیکن بدقسمتی کی بات

ہے کہ ISNA کے صدر نے امریکی اسٹیبلشمنٹ میں اپنی ذاتی پذیرائی اور مقبولیت کا دائرہ بڑھانے کے لیے انتہائی عیاری کے ساتھ ISNA کے پلیٹ فارم کو استعمال کیا اور اس طرح حقوقِ انسانی کی مہم چلانے والوں (HRC) نے ہم جنس پرستی کو اسلام میں قابلِ قبول قرار دیا۔

ہر سال ISNA کی بہت بڑی کانفرنس ہوتی ہے، سفید فام نومسلم حمزہ یوسف مسلم نوجوانوں میں انتہائی مقبول مقرر ہیں اور انہوں نے کیلی فورنیا اسٹیٹ میں ''زیتونا'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے۔ ISNA کی گزشتہ سالانہ کانفرنس میں وہ اہم مقرر کے طور پر مدعو تھے اور ہر سال انہیں بلایا جاتا ہے۔ ISNA کی انہی پالیسیوں کی وجہ سے وہ اسٹیج پر آئے، اپنا موقف بیان کیا، کلمۂ شہادت پڑھا اور احتجاجاً کانفرنس سے چلے گئے اور کہا کہ آئندہ میں ISNA کی کانفرنس میں نہیں آؤں گا۔ ISNA والوں نے ان کا موقف اور تقریر اپنی ویب سائٹ پر بھی نہیں ڈالی۔

علمائے اہلسنّت میں سے ٹیمز زیور اسلامک سنٹر نیوجرسی کے خطیب علامہ مقصود احمد قادری نسبتاً بہتر انداز میں کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، کیونکہ وہ اردو کے علاوہ انگریزی اور عربی میں بھی اظہارِ خیال پر قدرت رکھتے ہیں اور آج کل نئی نسل کے لیے ایسے علماء کی شدید ضرورت ہے اور جہاں اس طرح کے علماء موجود ہوں، وہ مساجد اور اسلامی مراکز عرب وعجم کے مسلمانوں کے لیے ایک مخلوط اسلامی سوسائٹی تشکیل دینے میں مُمِد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔

اسی طرح اسلامک سنٹر آف گریٹر ہیوسٹن کے تحت بہت خوبصورت ''جامع مسجد النور'' قائم ہے، جسے ہمارے کراچی کے تعلیم یافتہ لوگ چلا رہے ہیں اور وہاں ایک اسلامی مدرسہ بھی قائم کر لیا ہے، اختر عبداللہ صاحب، ڈاکٹر سلیم گوپلانی صاحب اور ظفر ہاشمی صاحب اور ان کے ساتھ ایک اچھی ٹیم اس مرکز میں کام کر رہی ہے، جہاں امریکا میں پلے بڑھے طلبہ دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

3 فروری 2014ء

اپنے اندر جھانکنے کی ضرورت!

امریکا میں ہزاروں سال سے جو قوم امن وامان کے ساتھ آباد تھی، اسے Native American یا اصل امریکی کہا جاتا ہے۔ کرسٹوفر کولمبس نے جب امریکا دریافت کیا، تو انہیں انڈین کا نام دیا، جو بعد میں Red Indian بن گیا، کیونکہ جب یہ لوگ لڑتے تھے تو چہروں پر سرخ رنگ لگا لیتے تھے۔ جب اہلِ یورپ نے امریکا کا رخ کیا اور طاقت ور پوزیشن میں آ گئے، تو انہوں نے ان Native American کا قتلِ عام شروع کیا، جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ لوگ بنیادی طور پر فطرت پرست اور ارواح پرست تھے، یہ لوگ کسی نہ کسی انداز میں ایک برتر اور عظیم تر ہستی کے قائل تھے۔ ان میں سے قتل وغارت گری کے بعد جو لوگ بچ گئے، انہیں عیسائی مذہب اختیار کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ آج یہ اصل امریکن سمٹ کر چھوٹی چھوٹی بستیوں (Reservations) میں رہ رہے ہیں۔ امریکا میں ان Reservations کی کل تعداد تقریباً 310 ہے، جو کہ کل امریکی رقبے کا تقریباً دو فیصد ہے، یعنی اپنے ہی قدیم آبائی وطن میں اُن کا حصہ فقط دو فیصد ہے۔

پھر جب امریکا میں زرعی ترقی کا دور شروع ہوا تو براعظم افریقا سے افریقیوں کو بحری جہازوں میں بھر کر بطورِ غلام لایا گیا۔ اِن افریقی غلاموں کی اکثریت کا مذہب اسلام تھا، اِن غلاموں کو بھی زبردستی عیسائی بنا دیا گیا۔ شاید سیاہ فام امریکیوں میں نسبتاً تیزی سے اسلام کے پھیلنے کا ایک فطری سبب یہ بھی ہے۔ انسانوں کی غلامی کا یہ سلسلہ سترہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک چلتا رہا۔ آخرِ کار 1860ء میں آزادی کی تحریک برپا ہوئی اور

اُس کے نتیجے میں امریکا میں سیاہ فام لوگوں کی غلامی کا دور اختتام کو پہنچا، لیکن اس سے پہلے بڑے پیمانے پر قتل اور غارت گری ہوئی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق 1864ء میں عہدِ غلامی کے اختتام سے پہلے امریکا میں غلاموں کی تعداد تقریباً چار ملین تھی۔

امریکا میں عورتیں بھی حقوق سے محروم تھیں، شادی کے بعد ان کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنی جائیداد پر حقِ ملکیت کا دعویٰ کریں۔ شادی ہوتے ہی تمام مالکانہ حقوق شوہر کو منتقل ہو جاتے۔ قانونی طور پر خاندانی امور میں بھی عورت کو رائے دینے کا حق حاصل نہیں تھا۔ امریکا میں 1848ء میں "حقوقِ نسواں" کی تحریک شروع ہوئی اور عورتوں نے اپنے لیے حقوق کا مطالبہ شروع کیا اور ایک طویل جدوجہد کے نتیجے میں آخرِ کار امریکی آئین کی انیسویں ترمیم کے نتیجے میں 1920ء میں خواتین کو ووٹ کا حق ملا، اس کے باوجود تا حال امریکا میں کوئی خاتون صدر منتخب نہیں ہو سکی۔

سو یہ امریکا کا وہ "حسین اور روشن چہرہ" ہے جو آج عالَمِ انسانیت کو حقوقِ انسانیت، حقوقِ نسواں، حقوقِ اَطفال، حقِ آزادیِ اظہار، آزادیِ مذہب، تحمّل و برداشت، روشن خیالی اور جدیدیّت کا درس دے رہا ہے اور اِن اقدار کا پیامبر اور محافظ بنا ہوا ہے، اسی کیفیت کو ہٹلر نے اِن الفاظ میں بیان کیا تھا "Brotus you too"، (بروٹس تم بھی؟)"۔

لیکن آج کے امریکا کا ایک اور رخ بھی ہے، جس سے ہم کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ امریکا اپنی آبادی کی غالب ترین اکثریت کے اعتبار سے بنیادی طور پر تارکینِ وطن (Immigrants) کا ملک ہے، جو شرق و غرب، شمال و جنوب الغرض دنیا کے گوشے گوشے سے آ کر یہاں آباد ہیں اور امریکی قومیت کے حامل ہیں۔ امریکا کی مجموعی آبادی میں ایک محتاط اندازے کے مطابق سفید فام تقریباً 4 . 2 7 فیصد، افریقن امریکن 12.6 فیصد، Native American یا Alaska Native 0.9 فیصد، ایشین امریکن 8 . 4 فیصد، Hispanic یا لاطینی امریکن سولہ فیصد سے متجاوز ہیں، انہیں Spanish کہا جاتا ہے اور غیر Hispanic یا غیر لاطینی امریکن تقریباً تراسی فیصد سے

متجاوز ہیں۔

اس پسِ منظر کو بتانے کا مقصد یہ ہے کہ امریکن قوم زبان، نسلی پس منظر اور رنگت کے اعتبار سے منتشر اور متفرق اجزائے ترکیبی کا مجموعہ ہے۔ مذہبی تفاوت کا عالم یہ ہے کہ صرف پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے 313 ذیلی مکاتبِ فکر (Denominations) ہیں۔ لیکن اس کے باوجود امریکن ایک متحد و منظم قوم ہیں۔ بے انتہا وسیع رقبے، قدرتی حُسن و جمال اور قدرتی وسائل کے اعتبار سے امریکا ایک نہایت حسین اور پُرکشش ملک ہے، آبادی تقریباً اکتیس کروڑ ہے۔ لیکن نہ کہیں لسانی تصادم، نہ مذہبی محاذ آرائی، نہ رنگت اور قومیت کی بنا پر تصادم، نہ طبقاتی آویزش، بس پوری قوم ترقی کی شاہراہ پر سپر سانک رفتار سے دوڑ رہی ہے۔ اور عالمی سیاست و معیشت، جدید سائنس و ٹیکنالوجی، علومِ جدیدہ میں ایجاد و اختراع کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں ہے۔ عالمی وسائلِ معیشت کا بہت بڑا حصہ امریکا کے قبضے میں ہے، سمندروں اور فضاؤں پر اُس کی حکمرانی ہے اور یہ سب کچھ سائنس اور سپر ٹیکنالوجی کی بدولت ہے۔ ساری دنیا سے ذہانت و قابلیت کا بہاؤ (Brain Drain) اسی کی طرف ہے۔ جدید علوم کا جوہرِ قابل (Talent) اور عالی دماغ لوگ جہاں کہیں بھی ہوں، وہ امریکا کی طرف کھچے چلے آتے ہیں، امریکا اُن کا خریدار ہے اور اُن کی ذہانت و قابلیت سے استفادے کا گر بھی اسے آتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں اگر اتفاق سے کوئی جوہرِ قابل پیدا بھی ہو جائے، تو وہ بین الاقوامی مارکیٹ میں قابلِ فروخت جنس بن جاتا ہے۔ وہ اپنے وطن میں خود کو غیر محفوظ، بے توقیر، بے قدر اور بے مصرف سمجھتا ہے، ہماری پوری قوم اور قیادت کو سوچنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہے اور یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا؟۔

میں امریکا کے دو ہفتے کے سفر سے واپسی پر دورانِ پرواز یہ سطور قلمبند کر رہا ہوں، میں چاہتا تو آپ کو امریکا کے اخلاقی زوال کی طرف متوجہ کرتا، خاندانوں کے تتر بتر ہونے کے مناظر بیان کرتا، اُن کی لامذہبیت اور اخلاق باختگی کے قصے آپ کو سناتا، جس سے ہمیں ایک گونہ طمانیت نصیب ہوتی ہے۔ لیکن طفل تسلیوں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، آنکھوں میں

محض خود فریبی اور خوش فہمی کے خواب سجانے سے قومیں سربلند و سرفراز نہیں ہوتیں، عمل کے میدان میں اپنا مقام بنانا پڑتا ہے۔

مجھے یہاں کے اہلِ نظر نے بتایا کہ یہ لوگ اپنے اسکولوں اور ابتدائی نظامِ تعلیم میں اپنے ملک و قوم پر تفاخر اور حبُّ الوطنی کا جذبہ اپنی نوخیز نسل کے ذہنوں میں راسخ کرتے ہیں اور یہ کہ وہ کون سی خصوصیات ہیں، جن کی بنا پر امریکا دنیا پر حکمرانی کر رہا ہے۔ کبھی کبھی میں CNN وغیرہ سنتا اور دیکھتا ہوں کہ امریکن دانشور کہہ رہے ہوتے ہیں کہ آخر کوئی تو سبب ہے کہ ہر ایک امریکا آنے کے لیے مضطرب و بے قرار ہے، ان کے بقول اس کا سبب عدل و مساوات پر مبنی اُن کا نظام ہے۔

اس کے برعکس ہم تتر بتر ہیں، انتشار در انتشار اور تفریق در تفریق کے مہلک قومی مرض میں مبتلا ہیں، باہم برسرِ پیکار ہیں۔ قتل و غارت کا کریڈٹ لیتے ہوئے ہمارا ضمیر بالکل ہمیں ملامت نہیں کرتا بلکہ اس کو ہم اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔ دینِ اسلام ہی ہمیں مضبوطی سے جوڑے رکھنے کا واحد ذریعہ تھا، یہ ایک Binding Force تھی، وہ بھی ہمیں جوڑ نہ سکی، یہ حال اردو زبان کا ہے جو ہمارے لیے رابطے کا موثر ذریعہ ہے۔ میں بار بار عرض کرتا ہوں کہ ہمیں اپنے اندر جھانکنے کی ضرورت ہے۔ اپنی کمزوریوں کا جائزہ لے کر اُن پر قابو پانے کی ضرورت ہے، کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم ایک لمحے کے لیے رکیں، اپنی پستی اور زوال کے سفر کو بریک لگائیں اور یوٹرن لے کر، ایک ملک اور ایک قوم بن کر دوبارہ عزت و سرفرازی کا سفر شروع کریں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ مومنوں کے دل اللہ کے ذکر کے لیے اور جو حق اس نے نازل کیا ہے، اس کے لیے نرم ہو جائیں“۔ (الحدید:16)

ہماری سیاسی جماعتیں اور قیادتیں قوم کی تقسیم در تقسیم کے اس عمل کو ملک تک ہی محدود نہیں رکھتیں بلکہ ضروری سمجھتی ہیں کہ ہر جماعت کی ایک ذیلی شاخ یا تائید و حمایت کا حلقہ امریکا، برطانیہ، یورپ، مشرقِ وسطیٰ، مشرقِ بعید الغرض بیرونِ ملک بھی ہر جگہ موجود ہو۔

ضرورت اس امر کی تھی کہ پاکستانی تارکینِ وطن کسی ایک پلیٹ فارم پر منظم ہوتے تاکہ اُن ملکوں کی داخلی سیاست میں ان کا ایک حلقۂ اثر پیدا ہو، انہیں اہمیت دی جائے اور وہاں کے ذہن ساز طبقات (Opinion Makers)، مجالسِ مفکرین (Think Tanks) اور ارکان کانگریس پر وہ اثر انداز ہوں اور پاکستان کے حق میں فضا کو ہموار کرسکیں۔ جس طرح انڈیا کے بااثر لوگ امریکا اور برطانیہ میں اپنی قوم وملک کے لیے نسبتاً بہتر طور پر اور مؤثر انداز میں یہ کردار ادا کر رہے ہیں۔ پاکستان کی طرف جب کبھی امریکی حکومت کا تھوڑا بہت جھکاؤ ہوتا ہے، وہ By Choice یا By Option نہیں بلکہ حالات کے جبر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ تعلق دیرپا نہیں ہوتا بلکہ ضرورت کی حد تک ہوتا ہے اور ضرورت ختم ہونے پر وہ آنکھیں پھیر لیتے ہیں اور ہم اُن کی بےوفائی کے شکوے کرتے رہتے ہیں۔

14 فروری 2014ء

مذاکرات کا کوہِ گراں

ہزاروں خدشات اور اندیشوں کے باوجود مذاکرات کا اونٹ آخر کسی کروٹ بیٹھ ہی گیا اور اچھا ہی ہوا۔ تسلسل کے ساتھ یہ سوال بھی کیا جا رہا تھا کہ دونوں کمیٹیاں کس حد تک بااختیار ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی سوال دونوں کمیٹیوں نے بھی ایک دوسرے کے بارے میں اٹھایا۔ اس سوال کا درست جواب یہ ہے کہ دونوں کمیٹیاں بااختیار نہیں ہیں اور یہ بات ہر ایک کے لیے قابلِ فہم اور قابلِ قبول ہونی چاہیے، صرف اعتراض برائے اعتراض سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہاں! یہ بات درست ہے کہ دونوں کمیٹیاں اپنے اپنے فریق کے لیے قابلِ اعتماد ہیں۔ طالبان کی کمیٹی کے پروفیسر ابراہیم تو واضح طور پر کہہ چکے ہیں کہ ہمیں آپ Facilitator یا Mediator کہہ سکتے ہیں، یعنی فریقین کو سہولت فراہم کرنے والے اور رابطہ کار اور یہ لوگ بجا طور پر اس کے اہل ہیں۔ طالبان نے اپنی ترجمانی کرنے اور اپنا مقدمہ لڑنے کے لیے جن لوگوں کا انتخاب کیا ہے، وہ کسی کو پسند ہوں یا ناپسند، یہ ان کے لیے بہترین چناؤ ہے۔ حکومتی امن کمیٹی بھی سنجیدہ اور سلجھے ہوئے لوگوں پر مشتمل ہے۔ سو فریقین نے Soft Face سامنے رکھا ہے۔ پہلے اجلاس کے اعلامیے کی زبان و بیان سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ فیصلہ کرنے اور اسے لفظاً و معنیً نافذ کرنے کے مراکز کہیں اور ہیں اور فیصلہ کن مراحل میں حقیقی سودے بازی کہیں اور ہوگی۔ یعنی دونوں کمیٹیوں کا بے اختیار، بے ضرر اور بے خوف و خطر ہونا اور بظاہر ایک درجہ قابلِ احترام ہونا ہی اُن کی اصل اخلاقی قوت ہے، جس کے ذریعے وہ فریقین کو کسی مشترکہ ایجنڈے یا معاہدے کے

قریب لا سکتے ہیں۔

سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ ابتدائی ملاقات میں راہ و رسم آسان ہوتی ہے۔ فریقین خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں، لوگوں کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ امید کی کوئی نہ کوئی کرن اور خیر مستور کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ اصل مشکل ورکنگ سیشن سے شروع ہوتی ہے اور یقیناً یہ مراحل نہایت پیچیدہ، خم دار اور تناؤ کے حامل ہوں گے اور مذاکراتی کمیٹیوں سے بالا بالا کچھ اور حلقے بھی اس میں شریک کار ہوں گے۔ طالبان کمیٹی نے کہہ دیا ہے کہ ہماری ملاقات وزیر اعظم، چیف آف آرمی اسٹاف اور ڈی جی آئی ایس آئی یعنی اصل مُقتدِرہ سے کرائی جائے۔ ہماری رائے میں طالبان کمیٹی کا یہ مطالبہ جائز تو ہے، لیکن قبل از وقت ہے۔ دونوں کمیٹیوں کا اصل کام فریقین کے لیے ایک ورکنگ پیپر یا عبوری دستاویز کی تیاری ہے، جس میں گرین اور ریڈ ایریا کے درمیان ایک Grey Area کی نشاندہی ہو، جس پر آخری مراحل میں فریقین کے درمیان سودے بازی ہوتی ہے اور "کچھ لو اور کچھ دو" کی بنیاد پر معاملات طے ہوتے ہیں۔

یہ کہنا کہ کس کے پاس کتنا اختیار ہے، بہت مشکل سوال ہے، ایسا حتمی قطعی اور لامحدود اختیار تو کسی ایک فرد کے پاس نہیں ہوسکتا۔ وزیر اعظم کو بھی اپنے سینئر رفقاء سے مشاورت کرنی ہوتی ہے، قومی سلامتی کے اداروں اور حساس اداروں کو بھی اعتماد میں لینا ہوتا ہے اور قومی اسمبلی میں قائدِ حزبِ اختلاف اور اہم اپوزیشن رہنماؤں سے بھی بامعنی مشاورت ناگزیر ہے تاکہ تمام اہم فریق اس ممکنہ معاہدے کے اسٹیک ہولڈرز اور ضامن (Guarantor) بنیں اور نتائج کی ذمے داری بھی قبول کریں۔

سب سے اہم سوال یہ ہوگا کہ طالبان کا ضامن کون بنے گا، یہ طالبان کمیٹی کے بس کی بات بھی نہیں ہے۔ یہ بات درست ہے کہ دونوں کمیٹیوں کے ارکان کے درمیان باہمی احترام کا ایک رشتہ موجود ہے اور کوئی بڑا نظریاتی اور فکری بُعد بھی نہیں ہے۔ اس لیے عرفان صدیقی صاحب کا یہ کہنا کہ مذاکرات کے دوران ایسا لگا کہ ہم دونوں ایک ہی کمیٹی

ہیں، کسی حد تک درست ہے۔ حکومتی کمیٹی کی بے اختیاری اس سے عیاں ہوئی کہ وزیر داخلہ چوہدری نثار علی خان مولانا سمیع الحق اور اپنی کمیٹی کے ساتھ مستقل رابطے میں رہے، حالانکہ ابھی تو شروعات کے لیے ایک ترجیحی فہرست مرتب ہونی تھی۔ لہٰذا ہماری رائے میں یہ بہتر ہوگا کہ چوہدری نثار علی خان مذاکرات میں خود حکومتی ٹیم کی قیادت کریں تاکہ پسِ پردہ ڈور ہلانے کے بجائے اپنی دانش اور اختیارات سے کام لیتے ہوئے معمولی رکاوٹوں کو موقع پر ہی خود دور کریں۔

ہم جیسے بے ضرر لوگوں کا کام یہ ہے کہ نہایت خلوص کے ساتھ ان مذاکرات کی کامیابی کے لیے دعا کریں کہ اللہ کرے یہ مذاکرات اخلاص پر مبنی ہوں، مثبت، تعمیری اور نتیجہ خیز ہوں، کیونکہ ملک میں خوں ریزی بہت ہو چکی، بے شمار لوگ ظلماً اور ناحق قتل کیے گئے، تباہ شدہ املاک کا آج تک صحیح تخمینہ معلوم ہی نہیں ہے، ان میں انتہائی قیمتی دفاعی تنصیبات بھی شامل ہیں۔ اہلِ پاکستان کا امن و سکون درہم برہم ہو گیا اور آج پورا ملک ایک غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار ہے۔

جب مذاکرات کا ڈول ڈالا جا رہا تھا تو کچھ افراد اور تنظیموں کے Ticker ٹیلی ویژن اسکرین پر نظر آجاتے تھے کہ دہشت گردوں سے مذاکرات کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اب جب کہ مذاکرات شروع ہو چکے ہیں، یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان حضرات نے حکومت کو مذاکرات کی اجازت دے دی ہے یا ان سے بالا ہی بالا تمام مراحل سر ہو گئے، ان حضرات کو ہمارا عاجزانہ مشورہ ہے کہ بولنے سے پہلے تول لیا کریں تاکہ بعد میں ندامت نہ ہو۔

حکومت کا مسئلہ یہ ہے کہ اس نے مذاکرات کی غیر مشروط پیشکش کی ہے، جب کہ طالبان نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کھلے رکھے ہیں۔ چونکہ حکومت یک طرفہ طور پر دست بستہ ہو گئی ہے، لہٰذا آخر میں خدانخواستہ کسی ممکنہ ناکامی کی صورت میں ملامت اُسی کے حصے میں آئے گی۔ طالبان کے مطالبات تو حکومت کے سوا ہر ایک کو معلوم ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) چونکہ اُن کے دعوے کے مطابق حکومت جارح ہے، لہٰذا جنگ بندی میں یک طرفہ طور پر پہل وہ کرے۔

(۲) پاکستانی جیلوں میں پابندِ سلاسل ان کے تمام قیدیوں کی غیر مشروط رہائی اور ان پر قائم مقدمات سے حکومت کی دست برداری۔

(۳) ان کے جانی و مالی نقصانات کی اُن کے تخمینوں کے مطابق ادائیگی۔

(۴) قبائلی علاقوں سے فوج کا انخلا۔

(۵) اور شریعت کا نفاذ۔

اگر چہ حکومتی کمیٹی نے معاملات کو شورش زدہ علاقوں تک محدود رکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے، لیکن طالبان کا ایجنڈا تو پورے پاکستان میں شریعت کا نفاذ ہے۔

مولانا عبدالعزیز نے آنے والے حالات کی ایک جھلک نہایت ہوشیاری سے دکھادی ہے، کوئی اپنی آنکھیں بند رکھنے پر مُصِر ہو تو اس کی مرضی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''درحقیقت بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ عقل و بصیرت پر پردے پڑ جاتے ہیں''۔ (الحج:46)

اگر طالبان اور ان کی کمیٹی نے اپنے ابتدائی مطالبات اور اہداف یک طرفہ طور پر حاصل کر لیے اور پھر کسی مرحلے پر مذاکرات میں تعطّل (Deadlock) پیدا ہو گیا یا معاملہ Point of No Return یعنی جدائی کے مرحلے میں پہنچ گیا تو حکومت کے ہاتھ خالی ہوں گے اور اس کے پاس کفِ افسوس ملنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا اور پھر میڈیا کے لبرل عناصر اپنی اپنی چھری کانٹے تیز کر کے اس کی خوب خبر لیں گے۔

تحریک طالبان پاکستان سے پابندی اٹھانا ایک تکنیکی مسئلہ ہے اور اس کے مُضمرات پر ماہرینِ قانون ہی روشنی ڈال سکتے ہیں۔ لیکن عملی صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے ہاں بعض جماعتوں یا گروہوں کو ممنوع قرار دینے یا ان پر پابندی (Ban) لگانے یا اُن کو کالعدم (Defunct) قرار دینے سے عملی منظر نامے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ کیونکہ

ہمارے ہاں یہ پابندی اسم پر لگتی ہے، مُسمّٰی (Named Person) پر نہیں لگتی، لہٰذا بے نام طریقے سے یا متبادل ناموں کے ساتھ کام جاری رہتا ہے۔ افراد میدانِ عمل میں موجود رہتے ہیں اور اُن کی سرگرمیاں بھی جاری وساری رہتی ہیں اور حساس اداروں کے ساتھ روابط بھی کسی نہ کسی صورت میں قائم رہتے ہیں۔ جب کہ امریکا افراد کو دہشت گردوں کی فہرست میں شامل کرتا ہے، اُن کے اثاثے منجمد کرتا ہے اور بعض صورتوں میں اُن کے سر کی قیمت (Head Money) مقرر کرتا ہے۔

مولانا عبدالعزیز کا یہ تبصرہ تو برمحل ہے کہ جن پارلیمنٹیرین کو سورۂ اخلاص نہیں آتی، وہ قرآن وسنت کو کیا سمجھیں گے اور اُس کے مطابق قانون سازی کیا کریں گے اور وہ قانونِ شریعت کس پر نافذ کریں گے اور کس منہ سے کریں گے:

ع: بات سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

الغرض مذاکرات کا کوہِ گراں سر کرنا ہے اور مذاکرات میں شامل فریقین نے ملک وقوم کو امن کی سوغات دینی ہے اور عافیت وسلامتی کی خیرات بانٹنی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے صدقِ دل سے دعا کریں کہ یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوجائے اور ہم جیتے جاگتے کھلی آنکھوں سے اس کی تعبیر دیکھیں اور قوم امن کی نعمتوں میں پھلے اور پھولے۔ یہ ہمالیہ سر کرنا مشکل ضرور ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہوجائے تو ناممکن ہرگز نہیں ہے۔

17 فروری 2014ء

نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحیثیتِ مُقنّن وشارعِ مجاز

تحریکِ طالبان پاکستان کے برقرار یا مُعطّل ترجمان مولانا عبدالعزیز نے ٹیلی ویژن پر ارشاد فرمایا: ''بات یہ ہے کہ قرآن وسنت آسمانی قانون ہے، آسمانی قانون کے ہوتے ہوئے اس انگریز کے قانون کی ہمیں اجازت نہیں۔۔ انگریز تو انگریز، مسلمان قانون نہیں بنا سکتا، بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ''شارح'' قرار دیا گیا ہے، آپ بھی قانون نہیں بنا سکتے، قانون صرف اور صرف کائنات کے خالق ومالک اللہ کا چل سکتا ہے''۔ میں نے براہِ راست یہ پروگرام نہ دیکھا، نہ سنا، تاہم اس پر مسلمانوں کے دل مضطرب ہوئے، ان کے جذبۂ عقیدت کو ٹھیس پہنچی اور سب نے دکھ کا اظہار کیا۔

ایک دین کا درد رکھنے والے اور حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرشار صاحبِ نظر محمد شمیم خان صاحب نے نیٹ سے مولانا عبدالعزیز کے مندرجہ بالا کلمات نقل کر کے مجھے ارسال کیے اور خواہش ظاہر کی کہ میں اس پر شریعت کی روشنی میں اپنا موقف بیان کروں۔ شریعت کی من پسند تعبیر وتشریح اور اس پر عمل درآمد کے دل دہلا دینے والے مناظر تو مختلف ویب سائٹس اور نیٹ پر عرصے سے موجود ہیں۔ مگر اب بات اس سے بھی آگے بڑھ کر مقامِ رسالت، شانِ رسالت اور منصبِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چیلنج کرنے پر آ گئی ہے۔ لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ عام مسلمانوں کی تشفی کے لیے چند کلمات تحریر کروں۔

سچ بات یہ ہے کہ مولانا کا منصبِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہ بیان نہایت بے باکی اور ناپاک جسارت پر مبنی ہے، ان کا یہ تبصرہ سن کر دل رنجیدہ ہوا اور خدشہ لاحق ہوا

کہ اگر دین کے معاملے میں بے باکی کی روش اسی طرح عام ہوئی اور اس پر کوئی روک ٹوک عائد نہ کی گئی، تو ملک کا امن وامان تو پہلے ہی غارت ہے، دین وایمان بھی ایسے لوگوں کی دست برد سے محفوظ نہیں رہے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس امر میں غلام احمد پرویز یا منکرینِ حدیث کے سوا کبھی کسی کا کوئی اختلاف نہیں رہا کہ رسول ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف شارعِ مجاز (Authorized Lawgiver)، مُقنّن (Legislature) اور واجب الاتباع اور واجب الاطاعت ہیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت کی بھلائی کی التجا کی اور عرض کی:

"(اے پروردگار!) ہمارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی لکھ دے (یعنی مقدر فرما دے)، بے شک ہم نے تیری طرف رجوع کیا، (تو تعالیٰ نے) فرمایا: میں جسے چاہوں گا، اسے میرا عذاب پہنچے گا اور میری رحمت ہر چیز پر محیط ہے، (تم نے جو کچھ مانگا ہے) میں عنقریب یہ (اعزاز) اُن (خوش نصیبوں) کے لیے لکھ دوں گا، جو (ہمیشہ) تقویٰ اختیار کرتے ہیں، (باقاعدگی سے) زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں، (درحقیقت یہ) وہ لوگ ہیں جو اُس رسول نبی امی کی (ہمیشہ) پیروی کریں گے، جس کو وہ (پہلے سے) اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، (جن کا منصب یہ ہے کہ) وہ انہیں نیکی کا حکم دے گا اور برائی سے روکے گا اور جو ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دے گا اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دے گا اور جو اُن کے بوجھ اتارے گا اور ان کے گردنوں میں پڑے ہوئے (جاہلیت کے) طوق بھی اتارے گا، سو جو لوگ اس پر ایمان لائے اور ان کی تعظیم کی اور اُن کی نصرت وحمایت کی اور اس نور (ہدایت قرآن) کی پیروی کی جو اُس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، (درحقیقت) وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔

(اعراف: 157-156)

اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں اپنے رسولِ مکرم سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ

امر ونا ھی اور مُحلّل (حلال قرار دینے والا) اور مُحرِّم (حرام قرار دینے والا) فرمایا ہے اور قانون ساز (Legislature) وہی تو ہوتا ہے، جو کسی چیز کو حلال قرار دینے یا حرام وممنوع (Unlawful & Prohibited) قرار دینے کا ایسا اختیار رکھتا ہو، جسے کوئی چیلنج نہ کرسکے اور کسی کے پاس انکار کی گنجائش نہ ہو۔ بس قرآن کی رُو سے یہی منصبِ رسالت اور شانِ رسالت ہے۔ اِس کے بعد کسی کا یہ کہنا کہ: ''بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی شارح قرار دیا گیا ہے، آپ بھی قانون نہیں بناسکتے''۔ دراصل یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کی ہوئی قانون سازی کی اس مطلق اتھارٹی کو چیلنج کرنا ہے یا اس کا صریح انکار ہے اور کسی مومنِ صادق سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ مولانا عبدالعزیز نے یہ کلمات شعوری طور پر کہے ہیں یا سبقتِ لسانی سے ان کی زبان سے ادا ہوئے، بہر حال انہیں اسی فورم پر ان سے رجوع کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قانون بنانے کا یہ اختیار مطلقاً عطا کیا ہے، اس میں کوئی قید یا شرط نہیں ہے، نہ ہی کوئی If یا But یا Proviso ہے، یعنی اگر، مگر اور شرطیکہ کی قید نہیں ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کی طرح اپنے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کو بھی غیر مشروط اور لازم قرار دیتے ہوئے فرمایا: ''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اس رسول کی اور ان کی جو تم میں صاحبانِ امر ہیں، پس اگر تمہارا اُن صاحبانِ امر سے کسی معاملے کے (حق یا باطل ہونے کے) بارے میں تنازع پیدا ہوجائے، تو (حتمی اور قطعی فیصلے کے لیے) اس معاملے کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو، یہی (شِعار) بہتر اور انجام کے اعتبار سے احسن ہے''۔ (النساء:59)

اس آیتِ مبارکہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کو غیر مشروط طور پر لازم قرار دیا، جبکہ کسی بھی بڑے سے بڑے صاحبِ اختیار یا حاکمِ اعلیٰ یا مُقنّنہ (یعنی پارلیمنٹ) کی اطاعت کو غیر مشروط طور پر لازم قرار نہیں دیا۔ اس کو فیصلے کو چیلنج کیا جاسکتا ہے اور قرآن وسنت کے خلاف ہونے کی صورت میں رد کیا جاسکتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا: ''اور جس نے رسول کی اطاعت کی، اُس نے درحقیقت اللہ ہی کی اطاعت کی اور جس نے (اطاعتِ رسول سے) روگردانی کی، تو (اے رسولِ مکرم!) ہم نے آپ کو اس پرنگہبان بنا کر نہیں بھیجا''۔ (النساء:80)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ہمارے پاس معلوم پیمانہ صرف اطاعتِ رسول ہی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا:

''اور (اے مومنو!) جو حکم تمہیں رسول دیں اسے لے لو اور جس چیز سے رسول روکیں، اُس سے (کسی تردُّد کے بغیر) رک جاؤ''۔ (الحشر:07)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ دوٹوک ضابطہ اس لیے مقرر فرمایا کہ نبی معصوم ہیں، اُن کا نطق بھی معصوم ہے اور اُن سے خطا کا صادر ہونا ناممکن ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور وہ (رسول) اپنی خواہشِ نفس سے کوئی بات نہیں کہتے، وہ وہی کہتے ہیں، جس کا انہیں وحی کے ذریعے حکم ہوتا ہے''۔ (النجم:4-3)

رسول اللہ ﷺ کو یقیناً اس بات کا علم تھا کہ ایک ایسا وقت آئے گا کہ لوگ قرآن مجید کی آڑ میں شانِ رسالت اور مقامِ رسالت کا بالواسطہ انکار کرتے ہوئے شارعِ مجاز اور بااختیار مُقَنِّن کی حیثیت سے آپ کے منصب کا انکار کریں گے اور یہ انکار ''حاکمیّتِ الٰہی'' کے پرکشش اور خوبصورت عنوان سے ہوگا۔ اسی لیے آپ ﷺ نے اس کی پیش بندی کرتے ہوئے فرمایا: ''سنو! مجھے قرآن عطا کیا گیا ہے اور اس کی مثل (واجب الاطاعت قانون میری سنت کی صورت میں) اس کے ساتھ ہی عطا کیا گیا ہے، سنو! ممکن ہے کہ ایک شخص خوب سیر شدہ (عیش وعشرت میں مست) اپنی مسند پر ٹیک لگائے ہوئے ہوگا اور کہے گا: بس اس قرآن کو لازم پکڑو، سو جو کچھ تم اس میں حلال پاؤ، اسے حلال مانو اور جو کچھ تم اس میں حرام پاؤ اسے حرام مانو، (جبکہ حلال وحرام قرآن تک محدود نہیں ہے)، تمہارے لیے پالتو گدھے کا گوشت اور کچلیوں (سامنے کے دانتوں) سے شکار کرنے والے درندے حلال نہیں ہیں''۔ (سنن ابی داؤد:4594)

یعنی ان کی حرمت کا بیان قرآن میں نہیں ہے، مگر میں قرآن میں دیے ہوئے تشریعی اختیار سے اس نوع کے تمام جانوروں کو حرام قرار دیتا ہوں؛ ان میں شیر، چیتا، بھیڑیا، کتا، بلی اور اس قبیل کے تمام جانور شامل ہیں۔ اسی طرح عرباض بن ساریہ بیان کرتے ہیں:

"(ایک دن) رسول اللہ ﷺ (خطبہ دینے کے لیے) کھڑے ہوئے اور فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اپنی مسند پر براجمان ہو کر یہ گمان کرے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی چیز حرام کی ہے، اس کا بیان قرآن میں ہے، (نہیں ایسا ہرگز نہیں)، سنو! بخدا میں نے حکم جاری کیے ہیں اور نصیحت کی ہے اور بعض امور سے منع کیا ہے، تو اُن کی حرمت قرآن کی حرمت کی طرح قطعی بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے"۔ (سنن ابی داؤد:4599)

حضرت مالک بن انس بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میں تمہارے درمیان دو (اہم) چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں اور وہ ہیں: کتاب اللہ اور سنتِ رسول، جب تک تم ان دونوں کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ وابستہ رہو گے، کبھی گمراہ نہ ہو گے"۔

(موطا امام مالک)

21 فروری 2014ء

آئین یا شریعت

حالیہ مذاکرات کے تناظر میں تحریکِ طالبان پاکستان کے ترجمان شاہد اللہ شاہد اور لال مسجد والے مولانا عبدالعزیز صاحب کا نفاذِ شریعت کے حوالے سے بیان سامنے آیا تو ہمارے الیکٹرونک میڈیا کی رونقوں کو چار چاند لگ گئے۔ اینکر پرسن اور ماہرینِ آئین وقانون کیل کانٹے سے لیس ہو کر ٹیلی ویژن اسکرین پر نمودار ہوئے اور مباحثے اور مکالمے کا بازار سج گیا۔ اس سے بظاہر یہ تأثر پیدا ہوا کہ آئین و شریعت کا یکجا ہونا محال ہے، یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں، جہاں آئین ہے وہاں شریعت کا داخلہ بند اور جہاں شریعت ہوگی، وہاں آئین کی گنجائش نہیں۔ ہماری رائے میں یہ سب لفظی بحثیں ہیں اور بزم کی رونق سجانے کے لیے میڈیا کی ضرورت ہے۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور اور نفاذِ شریعت میں کوئی تضاد نہیں ہے، جو کچھ طالبانِ پاکستان اب تک کرتے چلے آئے ہیں، اس کا شرعی جواز ہماری فہم سے بالاتر ہے بلکہ بے قصور انسانوں کے جان ومال اور آبرو کی حرمت کو پامال کرنا شریعت کی رُو سے حرامِ قطعی ہے اور اس کے لیے کوئی بھی جواز (Justification) قابلِ قبول نہیں ہے۔ دوسری جانب جو حضرات دستورِ پاکستان کی تقدیس (Sanctity) کی باتیں کر رہے ہیں، وہ بتائیں کہ اس دستور پر لفظاً و معنًی (In Letter & Spirit) کب عمل ہوا؟۔

دستور میں ریاست کا نام "اسلامی جمہوریہ پاکستان" ہے، دستور کی رُو سے ریاست کا سرکاری مذہب اسلام ہے۔ اور دستور کے آرٹیکل ۲ (الف) کی رو سے قراردادِ مقاصد ملک

کا جوہری اور اساسی قانون (Substantive Law) ہے اور اس کی دفعات مؤثر ونافذ العمل ہیں۔ قراردادِ مقاصد کی دفعہ 1 میں ہے: ''کائنات میں اقتدارِ اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے''۔ دفعہ 2 میں ہے: ''ملک کا قانون قرآن وسنت پر مبنی ہوگا اور کوئی بھی قانون یا انتظامی حکمنامہ، جو قرآن وسنت کے منافی ہو، نافذ العمل نہیں ہوگا''۔

دستورِ پاکستان کے آرٹیکل 31 میں ہے: ''پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی اسلام کے بنیادی اصولوں اور اساسی تصورات کے مطابق مرتب کرنے کے قابل بنانے اور انہیں ایسی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے، جن کی مدد سے وہ قرآنِ پاک اور سنت کے مطابق زندگی کا مفہوم سمجھ سکیں''۔

دستور پاکستان کا آرٹیکل نمبر: 227 ریاست کو اس امر کا پابند بناتا ہے کہ: ''تمام موجودہ قوانین کو قرآنِ پاک اور سنت میں منضبط اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے گا، جن کا اس حصے میں بطورِ اسلامی احکام حوالہ دیا گیا ہے اور ایسا کوئی قانون وضع نہیں کیا جائے گا، جو مذکورہ احکام کے منافی ہو''۔ دستور کا آرٹیکل 228 تا 231 اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل، اس کے ارکان کی اہلیت اور تمام طریقہ کار (Rules of Business) کا ذکر ہے۔ اس کی رُو سے حکومت پر لازم ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی حتمی سفارشات کو پارلیمنٹ میں بحث کے لیے پیش کرے اور پھر اس کے مطابق قانون سازی کی جائے، لیکن آج تک ایسا نہیں ہوا۔

پس ہمارے ہاں آئین کی تقدیس کا نعرہ تو بہت لگایا جاتا ہے لیکن لفظاً ومعنیً آئین کی روح پر عمل نہیں ہوتا۔ پھر آئین میں ایک طرف تو قرآن وسنت کی بالادستی کا اقرار و میثاق ہے اور اسی کے ساتھ ایسی دفعات بھی موجود ہیں جو قرآن وسنت کی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتیں، مثلاً: صدر کا اپنے عہدِ صدارت میں عدالت کے سامنے جوابدہی سے استثنا (Immunity)، جبکہ قرآن وسنت کی تعلیمات تو یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف

حالتِ جنگ بلکہ عین میدانِ جنگ میں اپنے آپ کو قصاص کے لیے پیش فرمایا، حالانکہ آپ پر قصاص واجب نہیں تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''نبی مومنوں کی جانوں سے بھی زیادہ ان کے قریب ہیں''۔(الاحزاب:6)

ولایت کے ایک معنی تصرف واختیار کے بھی ہیں اور اسی معنی کی مناسبت سے بعض مترجمین نے اس آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے: ''نبی ایمان والوں کی جانوں سے بھی زیادہ ان کے مالک ہیں''۔اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو مقدمے کے فریقِ مخالف کے ساتھ مساوی حیثیت میں عدالت میں پیش کیا۔ایک حدیثِ پاک میں ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے (اپنے قرض کی واپسی کا) تقاضا کیا اور (مطالبے میں) سختی کی، اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے (اس کو ڈانٹنے یا مارنے کا) ارادہ کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو، کیونکہ جس کا کسی پر حق ہو، اس کے لیے بات کرنے (یعنی سختی کے ساتھ مطالبہ کرنے) کی گنجائش ہوتی ہے (اور فرمایا) اسے اونٹ خرید کر دے دو، صحابہ نے عرض کی: ہمارے پاس اس سے زیادہ عمر کا اونٹ موجود ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہی اونٹ خرید کر اسے دے دو، کیونکہ تم میں بہترین شخص وہ ہے جو قرض اچھی طرح سے ادا کرے''۔(صحیح بخاری:2390)

1993ء میں جب اُس وقت کے وزیر اعظم نواز شریف کی حکومت کو اُس عہد کے صدر غلام اسحاق خان نے برطرف کیا، تو معزول یا برطرف وزیر اعظم نے سپریم کورٹ آف پاکستان میں اپنی حکومت کی بحالی کے لیے آئینی پٹیشن (استدعا) دائر کی۔اسی دوران ایک اور شخص نے دستور کے آرٹیکل نمبر:2A کا حوالہ دے کر اس دفعہ کی رو سے صدر کی نااہلی کی پٹیشن دائر کردی۔ اس کے جواب میں اُس وقت کے چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس (ر) ڈاکٹر نسیم حسن شاہ نے فرمایا کہ دستور کے تمام دفعات اپنی اپنی جگہ مستقل بالذات ہیں اور کوئی ایک دفعہ دوسری دفعہ پر حاکم نہیں ہے، یعنی ایک دفعہ دوسری کو

Over Rule نہیں کرسکتی اور اس بنیاد پر اُس آئینی پٹیشن کو مسترد کردیا۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ جب پارلیمنٹ، اسٹیبلشمنٹ اور عدلیہ کی سوچ کا انداز (Approach) یہ ہو تو دستور میں قرآن وسنت کی بالادستی کی دفعہ محض آرائشی اور نمائشی بن کر رہ جاتی ہے اور یہ عملاً مؤثر نہیں رہتی اور اس اندازِ فکر سے دستور کی روح مجروح بلکہ مفلوج ہو جاتی ہے۔

پس ضرورت اس امر کی ہے کہ دستور کے اندر تضادات (Contradictions) اور ابہامات (Ambiguities) کو سنجیدگی کے ساتھ دور کیا جائے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ 1973ء کے دستور کی تیاری میں تمام مکاتبِ فکر کے علماء کا اہم کردار ہے اور اُن کے اس پر تصدیقی، تائیدی اور توثیقی دستخط ثبت ہیں۔ لیکن اُن کی توثیق دستور کے تحریری میثاق کے لیے حجت ہے، بعد میں دستور سے جو انحراف یا اِغماض برتا گیا، اس کی تائید وحمایت ان علمائے کرام نے کبھی نہیں کی۔

1973ء کا اصل دستور اگر آج مِن وعَن (As It Is) نافذ العمل ہوتا، تو قومی اسمبلی میں صرف 217 براہِ راست منتخب نشستیں ہوتیں، نہ غیر مسلموں کی مخصوص نشستیں ہوتیں اور نہ ہی خواتین کی، یہ سب (Indemnity Bills) کے ذریعے دستور میں کی گئی اضافی ترمیمات اور فوجی آمروں کے غیر آئینی فیصلوں کو آئینی جواز عطا کرنے (Validation) کے لیے پارلیمنٹ کی جانب سے بالترتیب آٹھویں اور سترہویں دستوری ترامیم کا ثمرہ ہے۔ بحیثیت قوم ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم تضادات سے نکل نہیں پارہے اور جب کوئی افتاد آتی ہے تو ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں۔

آج ایسے دانشوروں، ماہرینِ آئین وقانون اور اہلِ علم کی کمی نہیں ہے۔ جو وقتاً فوقتاً ازسرِنو یہ بحثیں چھیڑ دیتے ہیں کہ قائدِ اعظم نے تو سیکولر ریاست کا خواب دیکھا تھا، اور کبھی یہ راگ الاپنا شروع کردیں گے کہ کون سا اسلام، کس کا اسلام؟ اس کا جواب تو اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات میں موجود ہے کہ پبلک لاء یعنی قانونِ عامّہ کے بارے میں مسالک

کے درمیان کوئی بڑا اور جوہری تفاوت نہیں ہے۔ اور احوالِ شخصیہ(Personal Law) عبادت، نکاح، طلاق، وقف اور وراثت وغیرہ میں ریاست کو کسی زحمت اور تردُّد میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے، بس یہ سب شریعت سے گریز کے حیلے بہانے اور چونچلے ہیں، جو ہر دور میں کسی مولانا عبدالعزیز یا طالبان کے لیے ریاستی معاملات میں نفوذ کی گنجائش پیدا کرتے رہتے ہیں۔

25فروری2014ء

پاکستان کا نظامِ عدل

2009ء سے 2013ء تک جناب افتخار محمد چودھری چیف جسٹس آف پاکستان اور اعلیٰ عدلیہ کے مُعطّل جج صاحبان کی ایک پُرزور تحریک کے نتیجے میں بحالی کے بعد پاکستان نے عدالتی فعّالیت کا ایک مثالی دور دیکھا۔ وزرائے اعظم اور سول وملٹری افسرانِ اعلیٰ عدالتوں میں طلب کیے گئے، سب پر ایک لرزہ طاری رہتا تھا، محترم چیف جسٹس آف پاکستان اور عدالتِ عظمیٰ کے باوقار جج صاحبان کے تبصرے (Observations) الیکٹرونک و پرنٹ میڈیا کی زینت بنتے رہے، شاید عدالتِ عظمیٰ کی جانب سے Suo Moto ایکشن کا یہ ایک عالمی ریکارڈ ہو۔ حکومت کے انتظامی حکم نامے (Executive Orders) مُعطّل ہوتے رہے، ایک وزیر اعظم دومنٹ کی سزا کے بعد پانچ سال کے لیے نااہل قرار پائے۔

الغرض ریاست کے سارے ستون ایک ستون کے سامنے لرزہ براندام نظر آئے۔ اس حوالے سے میڈیا پر بھی رونقیں لگی رہیں، یقیناً اس کے کچھ مثبت نتائج بھی برآمد ہوئے، حکومت کی بعض مالی بے اعتدالیوں پر گرفت ہوئی، بے جا نوازشات اور بیوروکریسی کی میرٹ کے برعکس ترقیاں غیر مؤثر قرار پائیں۔ اگرچہ ایگزیکٹو نے بھی ڈھیٹ پن میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور یہ ثابت کیا کہ انتظامیہ تاخیری حربوں (Delaying Tactics) سے عدالتِ عظمیٰ کے فیصلوں اور اَحکامات کو بے اثر کرسکتی ہے، ان کے تیز دانتوں کی کاٹ کو کُند کرسکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک دہشت اور رُعب ودبدبے کا تاثر قائم رہا تاآنکہ موجودہ چیف جسٹس آف پاکستان نے ایک ٹھیراؤ اور توازن کی کیفیت قائم کی۔

لیکن کیا اس عدالتی فعالیت سے بحیثیت مجموعی پاکستان میں انصاف سستا ہو گیا؟، اس کی رفتار میں غیر معمولی تیزی آ گئی، عام آدمی نے سکھ کا سانس لیا، مظلوم کو انصاف اُس کی دہلیز پر ملنے لگا، زیریں اور متوسط درجے کی عدلیہ سے رشوت کا خاتمہ ہو گیا، فوری فیصلے ہونے لگے، جج بے خوف و خطر فیصلے کرنے لگے، گواہ ہر قسم کے خطرات اور انتقام کے خدشات سے بے نیاز ہو کر عدالتوں میں پیش ہو کر گواہیاں دینے لگے، تفتیشی ادارے مثالی بن گئے، انتہائی خطرناک اور بااثر دہشت گردوں کو عدالتوں میں پیش کیا جانے لگا، عدالتوں میں کئی عشروں سے زیر التوا مقدمات کی فائلوں سے گرد جھاڑ کر سُرعت کے ساتھ فیصلے ہونے لگے، دنیا پاکستان میں بے لاگ اور شفاف فیصلوں کو دیکھ اَش اَش کر اٹھی؟، بے کس اور بے بس دادرسی کے طلبگاروں کو دھڑا دھڑ انصاف ملنے لگا؟، وہ منصفوں کی درازیِ عمر اور بلندیِ درجات اور حکمرانوں کی عدل گستری کے باعث اُن کے طولِ اقتدار اور دوامِ اقتدار کی دعائیں مانگنے لگے؟، قتل و غارت، دہشت و فساد، ظلم و عدوان اور لوٹ مار قصۂ پارینہ بن گئے؟، ملک کرپشن سے پاک ہو گیا اور نظامِ ریاست و حکومت کا ہر کل پرزہ ٹھیک ٹھیک کام کرنے لگ گیا؟...... سچ اور حق یہ ہے کہ ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے، عملی میدان میں کوئی بڑی اور جوہری تبدیلی رونما نہیں ہوئی، حبیب جالب نے کہا تھا:

پھر گئے دن فقط وزیروں کے

ہیں وہی رات دن فقیروں کے

ایسا کیوں ہے؟۔ حق بات یہ ہے کہ ہمارا نظامِ عدل از کار رفتہ، انتہائی بے فیض، بودا اور ناکارہ ہو چکا ہے۔ اس میں مظلوموں اور انصاف کے طلبگاروں کو فیض رسانی (Delivery) کی صلاحیت نہیں رہی، کیفیت کچھ یوں ہے کہ:

تن ہمہ داغ داغ شد

پنبہ کجا کجا نہم

یعنی جسدِ ملی کے زخموں پر پھایا کہاں کہاں رکھوں، مرہم کہاں کہاں لگاؤں، پورا بدن تو

پارہ پارہ ہو چکا ہے، بلکہ ناکارہ ہو چکا ہے۔ جناب والا! اس نظام کی مکمل تشکیل نو (Overhauling) اور جراحی (Surgery) کی شدید ضرورت ہے۔ لیکن اس کا دُور دُور تک کوئی امکان نظر نہیں آیا۔ اعلیٰ عدالتوں کے عزت مآب، باوقار اور فاضل جج صاحبان برا نہ منائیں تو حقیقت یہ ہے کہ یہ نظام بوسیدہ ہو چکا ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا:

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدے کے بت ہو گئے پرانے

ایک طرف عام آدمی کے لیے انصاف عنقا ہے اور دوسری جانب جب ہم دستور کے آرٹیکل 184 کے تحت بنیادی حقوق کی تقدیس اور حُرمت (Sanctity) کی طویل اور تھکا دینے والی اور بال کی کھال اتارنے والی فاضل وکلاء کی طویل بحثیں اخبارات میں پڑھتے ہیں، تو عام آدمی کا خون کھولنے لگتا ہے کہ کیا بنیادی حقوق کے حق دار صرف وہ بااثر طبقات ہیں، جو فاضل وقابل وکلاء کی لاکھوں روپے کی فیسیں ادا کرنے کی سکت رکھتے ہیں، غریب ونادار کا کوئی بنیادی حق نہیں ہوتا؟۔

مقدمے کے حقائق وواقعات سے قطع نظر خصوصی عدالت کئی مہینوں کی جُہدِ مسلسل اور محنتِ شاقّہ کے باوجود جنرل (ر) پرویز مشرف کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر کے فردِ جرم عائد کرنے کے قابل نہیں ہو سکی۔ سرِدست یہ سوال غیر متعلق ہے کہ وہ ملزَم (Accused) ہی رہیں گے، باعزت وباوقار بری ہو جائیں گے یا مجرم (Convict) قرار پائیں گے۔ صرف اس جانب توجہ دلانا ہے کہ زیردست اور بالادست کے لیے انصاف کے پیمانے الگ الگ ہیں۔ اس کے باوجود کہا جا رہا ہے کہ انصاف ہونا کافی نہیں ہے، لازم ہے کہ انصاف ہوتا ہوا نظر بھی آئے اور یہ کہ یہ تو Selective Justice یعنی "مَن پسند انصاف" ہے۔

1973ء میں پاکستان کا متفقہ دستور بنا تو اس میں آرٹیکل نمبر 6(2) موجود تھا اور چوہدری ظہور الٰہی مرحوم اس میں شریک تھے، اس کے بعد کی تقریباً 20 دستوری ترامیم میں

چوہدری شجاعت حسین شریک رہے، کسی کو نہ سوجھی کہ High Treason یا "ریاست سے غداری" کا لفظ سابق فوجی سربراہ کے مقامِ عالی کے شایانِ شان نہیں ہے، اسے آئین شکنی یا کوئی اور نام دے دیا جائے، حضور یہ بھی کر کے دیکھ لیں، کچھ نہیں ہوگا، کوئی رشید اٹلی تو آکر آئین نہیں توڑے گا۔ توپ وتفنگ سے لیس کوئی فوجی سربراہ ہی یہ کام کرسکتا ہے، تو کیوں نہ آئین میں ایک اور ترمیم کر کے اسے ایک اعزاز قرار دیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ بنچ اور بار کا اشتراک شفاف اور مثالی عدل کا ضامن ہے، پس دعا کریں کہ یہ بنچ اور بار سلامت رہیں، عدل کم یاب، نایاب یا ہمیشہ کے لیے مفقود الخبر خواب (Missing Dream) بن جائے، تو بھی حرج کی بات نہیں ہے۔

اب ذرا آنکھیں بند کر کے اور دل پر ہاتھ رکھ کر چشم تصور میں سوچیے کہ بفرضِ محال طالبان اسلام آباد میں آکر بیٹھ جاتے ہیں اور نفاذ شریعت کا اعلان کرتے ہیں۔ آبپارہ کے قریب کسی پارک میں کھلی عدالت لگتی ہے، پانچ دس سرکشوں کی گردنیں اڑائی جاتی ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ آؤ اپنے اپنے مقدمات لے کر آؤ، گھنٹوں اور دنوں میں فیصلے ہوں گے۔ تو ذرا بتایئے! کہ ستم رسیدہ مفلوک الحال اور پسے ہوئے لوگ لاکھوں روپے فیس لینے والے وکلاء کا بستہ اٹھائے ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ میں جائیں گے یا اِن کھلی عدالتوں کا رُخ کریں گے؟۔ ہوسکتا ہے سو فیصد انصاف نہ ہو پائے اور یقیناً نہیں ہو پائے گا، کیونکہ کوئی بھی انسان خطا سے پاک نہیں ہے۔ لیکن دسیوں سالوں کی اذیّت وانتظار، ذِلّت اور رُسوائی اور پیسے کی بربادی سے تو نجات مل جائے گی۔ آخر قیامت کے دن عرصۂ محشر میں بھٹکتے پھرتے پریشاں حال لوگ، جن میں صالحین متقین بھی ہوں گے اور عُصاۃ اور فاسقین بھی ہوں گے، کسی شفیع کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے کہ عدالت تو لگے، جو ہونا ہے ہو جائے، اِس اذیّت سے تو نجات ملے۔ کیا ہمارے اہلِ اقتدار اور نظام انصاف وقانون کے محافظ پاکستان کی سرزمین کسی ایسی قیامت برپا ہونے کے انتظار میں ہیں، جب ندامت کے سوا ان کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔

پس آفتاب نصف النہار کی طرح روشن اور واضح بات یہ ہے کہ ہمارا ضابطۂ فوجداری (Criminal Procedure Code) اور ضابطۂ دیوانی (Civil Procedure Code) شفاف اور جلد انصاف (Speedy Justice) کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسے ہم نے اپنے زمینی حقائق، درپیش صورتِ حال، عصری تقاضوں اور مظلومین کی فلاح کے لیے حقیقت پسندانہ سانچے میں ڈھالا ہی نہیں ہے، نہ ہی یہ سوچا اور دیکھا کہ ہمارے عوام کو انصاف فراہم کرنے کی صلاحیت ان ضوابط میں ہے یا نہیں اور ہمارے عوام میں اس کا مالی بوجھ اٹھانے کی سکت ہے بھی یا نہیں اور ہمارے تفتیشی اداروں کو جدید وسائل واسباب دستیاب ہیں یا نہیں؟۔ خدارا سوچیے! بابا بلھے شاہ نے کہا تھا:

عقل ہووے تے سوچاں ای سوچاں
عقل نہ ہوئے تے موجاں ای موجاں

اور علامہ اقبال نے کہا تھا:

حذر! اے چیرہ دستاں
سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

یہ تعزیرِ فطرت ہی تو ہے کہ ریاست اپنے منحرفین اور باغیوں سے کہہ رہی ہے کہ ہماری کوئی شرط نہیں، آیئے ہم سے مذاکرات کیجیے!، اور وہ کہہ رہے ہیں کہ پہلے اپنی نیک نیتی اور اخلاص کے ثبوت کے طور پر ہماری شرائط مانیے!

28 فروری 2014ء

مارچ2014ء

کراچی کی حالتِ زار

کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے، اس کی آبادی کے صحیح اعداد و شمار حکومت کے پاس بھی نہیں ہیں، کیونکہ ڈیڑھ عشرے سے پاکستان میں مردم شماری نہیں ہوئی، تاہم ڈیڑھ تا دو کروڑ کے درمیان اس کی آبادی کا تخمینہ بتایا جاتا ہے۔ کراچی پاکستان کی معیشت کی رگِ جاں ہے، کراچی رواں دواں رہے، تو پاکستان کی معیشت کی رگوں میں تازہ خون کی روانی ہوتی ہے، کراچی جامد و ساکت ہو جائے تو پاکستان کی معیشت پر جمود طاری ہو جاتا ہے۔ بلوچستان کے غیر یقینی حالات کے سبب گوادر کی بندرگاہ پوری طرح بروئے کار (Operational) نہیں لائی جا سکی۔ لہٰذا پاکستان کی تمام درآمدات و برآمدات کا انحصار کراچی پر ہے۔

آج میرا موضوع کراچی کا امن وامان، آپریشن اور اس کے نتائج، سیاسی و سماجی آمیزش اور بے امنی اور فساد کے مسائل نہیں ہیں۔ بہت سے کالم نگار اور صحافی حضرات کراچی اور بطورِ خاص نائن زیرو کا چند گھنٹوں کا دورہ کر کے بزعمِ خویش کراچی کے مسائل کے ماہر بننے کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں اور ایک طبیبِ حاذق کی طرح مرض کی تشخیص بھی کر لیتے ہیں اور شرطیہ کامیاب علاج بھی تجویز کر دیتے ہیں۔ میں 19 دسمبر 1964ء سے کراچی میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہوں اور میٹرک کے بعد میرے تمام تعلیمی مراحل یہیں تکمیل کو پہنچے اور ساری عملی زندگی اسی شہر میں گزاری۔ دسمبر 1965ء سے میری رہائش فیڈرل 'بی' ایریا میں نائن زیرو سے تھوڑے ہی فاصلے پر رہی۔ کراچی کے مسائل اور مصائب پر ایک

مبسوط کتاب لکھی جاسکتی ہے، لیکن بارہا اپنے کالموں میں لکھ چکا ہوں کہ پورا سچ بولنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور ہے اوراس کی قیمت بھی چکانی پڑتی ہے۔

اندرونِ سندھ کے تقریباً سارے وڈیرے، میر وپیر اور اہلِ ثروت وسیاست دان مستقل طور پر کراچی ہی میں رہتے ہیں، زیادہ تر کی رہائش گاہیں ڈی ایچ اے کراچی میں ہیں، اسی طرح بلوچستان کے بیشتر قبائلی سرداروں اور سیاست دانوں کا قیام بھی کراچی بالخصوص ڈی ایچ اے میں ہے۔ اپنے آبائی علاقوں سے ان سب کا تعلق حکمرانی اور مفادات سمیٹنے کی حد تک ہے۔

اکیسویں صدی کے شروع میں سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کا جو نیا نظام متعارف ہوا اور نعمت اللہ خان سٹی ناظم بنے تو انہوں نے کراچی شہر کے بنیادی ڈھانچے (Infrastructure) کی ترقی کے لیے ایک بہتر شعور (Vision) سے کام لیا اور اس وقت کے صدرِ پاکستان جنرل (ر) پرویز مشرف کو قائل کیا کہ کے پی ٹی، ڈی ایچ اے اور پاکستان اسٹیل جیسے ادارے جو اس شہر کے انفرااسٹرکچر کو استعمال کرتے ہیں، وہ اس کی ترقی میں حصہ لیں، چنانچہ فلائی اوور پل، فری ایکسپریس وے اور بہت سے مقامات پر ٹریفک کی روانی میں رکاوٹیں دور کرنے کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ بعدازاں مصطفیٰ کمال سٹی ناظم بنے، ان کی خوش قسمتی کہ صوبائی حکومت بھی ایک طرح سے ان کے گورنر کے کنٹرول میں تھی، صدرِ پاکستان کی بھی ان کو حمایت حاصل تھی، اس لیے انہوں نے اس کام کو بہت تیزی سے آگے بڑھایا اور کسی حد تک کراچی ایک جدید شہر کی صورت اختیار کرتا جارہا تھا۔ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ سڑکیں بنتی تھیں اور ایک ہی بارش میں نیست ونابود ہوجاتی تھیں۔ مصطفیٰ کمال صاحب نے یہ اہتمام کیا کہ سڑک کے ساتھ نئی سیوریج لائن ڈالنے کا بھی انتظام کیا، جس کے نتیجے میں وہ سڑکیں کافی حد تک محفوظ رہیں۔

جب سے پیپلز پارٹی کی حکومت نے زمامِ اقتدار سنبھالی، کراچی کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک کیا، نئے ترقیاتی منصوبے بنانا تو درکنار، جو سڑکوں اور سیوریج لائن کا انفرااسٹرکچر بنا

تھا، اس کی تعمیر و مرمت پر بھی توجہ نہ دی۔ چنانچہ آج حال یہ ہے کہ کراچی کا حلیہ بگڑ چکا ہے، سڑکیں دوبارہ کھنڈر بن رہی ہیں، واٹر لائن اور سیوریج لائن جگہ جگہ سے ٹوٹی پڑی ہیں، سیوریج کا پانی واٹر لائن میں مکس ہو رہا ہے اور سڑکیں تباہ و برباد ہو رہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس شہر کا کوئی والی وارث نہیں ہے، یہ شہر ناپُرساں ہے، صوبائی حکومت کو اس شہر سے کوئی غرض نہیں ہے اور بلدیاتی ادارے نہ تو موجود ہیں اور سپریم کورٹ کی سعیِ بسیار کے باوجود ان کی بحالی کا مستقبلِ قریب میں بظاہر کوئی امکان نہیں ہے۔

لیاری ایکسپریس وے جس پر قومی خزانے سے بہت بڑی رقم خرچ ہوئی، وہ اب بھی نامکمل ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے کہ اگر اس کو اسی طرح سے نامکمل و ناتمام چھوڑنا تھا تو لوگوں کو دربدر کرنے اور قومی خزانے کو تباہی کی نذر کرنے کا جواز کیا تھا۔

وزیر اعظم پاکستان نے جہاں کراچی کے لا اینڈ آرڈر پر توجہ دی ہے، ان کی ذمے داری ہے کہ کراچی کی سڑکوں کی بربادی اور حالتِ زار کو بھی دیکھیں اور اس کے انفرا اسٹرکچر کی بحالی کے لیے ہنگامی پروگرام ترتیب دیں، جس میں بڑا حصہ صوبائی حکومت ڈالے، لیکن ایک معتد بہ حصہ وفاقی حکومت کو بھی ڈالنا چاہیے، بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ وفاقی بجٹ میں کراچی کی بحالی اور ترقی کے لیے ایک مناسب حصہ مختص ہونا چاہیے۔

کراچی کی ٹریفک کی صورتِ حال اس سے بھی ابتر اور بدتر ہے۔ ساری ٹریفک انتہائی بے ہنگم اور غیر منظم انداز میں چل رہی ہوتی ہے، گھنٹوں ٹریفک جام ہوتا ہے اور اسی صورتِ حال میں ڈکیتیاں ہوتی ہیں، گن پوائنٹ پر لوگوں سے نقد رقوم اور پرس چھن جاتے ہیں اور کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا، ٹریفک پولیس کا دور دور تک پتا نہیں ہوتا اور عوام کو مزاج یہ بن چکا ہے کہ وہ ٹریفک پولیس کی ہدایات کی پرواہ بھی نہیں کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جب سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کے تحت جو سیویلین سٹی وارڈنز ٹریفک کنٹرول کرنے کے لیے مقرر کیے گئے، تو ان کے ایک ادنیٰ اشارے سے پوری ٹریفک رک جاتی تھی اور کسی کو ان کے حکم سے سرتابی کی مجال نہ تھی۔ پس ایک اہم مسئلہ لاقانونیت کا ہے، قانون کی بے توقیری کا

ہے اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے عمّال کے رُعب وداب کے نہ ہونے کا ہے۔

آئے دن شہر میں رونما ہونے والے واقعات کے نتیجے میں بسیں جلادی جاتی ہیں اور پھر ستر کی دہائی کی بوسیدہ بسیں جن کا انگ انگ فریاد کررہا ہوتا ہے، کوئی چیز سلامت نہیں ہوتی، لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح ان کے اندر ٹھُس کر سفر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ بسیں جہاں چاہتی ہیں، مسافروں کو بٹھانے اور اُتارنے کے لیے رُک جاتی ہیں، حتیٰ کہ انڈر پاسز اور فلائی اوور کے ابتدا اور انتہا پر بھی رُک جاتی ہیں، انسانی جانوں کے ممکنہ نقصان یا ٹریفک کی روانی میں خلل ڈالنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ شاید ہی دنیا کے کسی اتنے بڑے شہر میں شہری ٹریفک کا اتنا ابتر حال ہو۔ یہی کراچی کی سڑکوں پر چلنے والے رکشاؤں اور ٹیکسیوں کا ہے اور بیشتر گاڑیاں غیر رجسٹرڈ ہیں، اس لیے ان کا کوئی منظم ریکارڈ یا اعداد وشمار کسی حکومتی ادارے کے پاس نہیں ہیں، چنگ چی رکشے خودرو گھاس کی طرح شہر کی سڑکوں پر رواں دواں ہیں۔

ایمپریس مارکیٹ جو کبھی کراچی کے سیاحوں کے لیے توجہات کا مرکز ہوا کرتی تھی، آج سڑکیں چوڑی ہونے کے باوجود کوئی شریف آدمی وہاں سے گزر نہیں سکتا۔ پرائیویٹ ٹریفک میں روز افزوں اضافہ ہورہا ہے اور منظم باوقار شہری ٹریفک نہ ہونے کی وجہ سے اپنی گاڑیوں پر سفر کرنے پر مجبور ہیں، اس کی وجہ سے ٹریفک کا رش ناقابلِ کنٹرول ہوگیا ہے اور شہر کی آلودگی میں بے انتہا اضافہ ہوگیا ہے۔ شاہراہ پاکستان جس پر پہلے W-11 کی شہرت دور دور تک پہنچ رہی تھی، اب اس پر چنگ چی کی زگ زیگ اور بل کھاتے ہوئے رکشاؤں کا راج ہے اور پرائیویٹ کاروں والے اپنے گاڑیوں کے تحفظ کے لیے دعائیں کرتے ہوئے جاتے ہیں۔

ساحل سمندر جو کراچی کے شہریوں کے لیے ہفتے بھر کی مشغول زندگی کے بعد راحت کا سامان فراہم کرتا تھا اور اندرونِ ملک وبیرونِ ملک سے سیاح بڑے شوق سے اس کا رخ کرتے تھے، اب وہ اوباشوں اور لٹیروں کی آماجگاہ ہے، جرائم کے بڑھتے ہوئے واقعات

کے سبب ڈی ایچ اے نے دو دریا جانے والا راستہ بند کر دیا ہے اور یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ نو دولتیے امراء کی اوباش اولاد کی اخلاق باختہ حرکات کا مرکز بھی ڈی ایچ اے اور پوش آبادیاں ہیں اور بہت سے دہشت گرد بھی ان معزز آبادیوں میں اپنی پناہ گاہیں اور کمین گاہیں بنا لیتے ہیں۔ قایدِ اعظم کے مزار کے تقدس کو جس طرح پامال کیا جاتا ہے، اس کی داستان میڈیا پر آ چکی ہے۔ پس میرا عاجزانہ سوال ہے؟ اس شہر کا کوئی والی وارث ہے، تو سامنے آئے اور یہاں کے رہنے والوں کو ان گوناگوں اذیتوں سے نجات دلانے کا کوئی سامان کرے۔

7 مارچ 2014ء

حسد

ہماری سیاسی امراض کی اصلاح کا بیڑا تو ماشاء اللہ ہمارے میڈیا نے رضا کارانہ طور پر اٹھا رکھا ہے، یہ الگ بات ہے کہ روزانہ کے دھواں دار مناظرے اور مباحثے کے بعد جب وہ اپنے پروگرام کی بساط لپیٹتے ہیں تو ناظرین کے دامن میں فکری انتشار، بے یقینی اور قنوطیت کے سوا کچھ باقی نہیں بچتا۔ لہٰذا بہتر ہے کہ ہم آج اصلاحِ ذات اور پاکیزگیٔ نفس کی بات کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیمِ امت کے لیے اکثر اپنے خطباتِ مبارکہ میں یہ کلمات ارشاد فرماتے تھے: ''ہم اپنے نفس کی شرارتوں سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں''۔

انسان کو جو اخلاقی اور نفسانی (Psychic) عوارض لاحق ہوتے ہیں، ان میں سے ایک حسد ہے، اسے ہم اردو میں ''جلنا'' اور انگریزی میں ''Jealousy'' کہتے ہیں۔ اس کے مقابل جو پسندیدہ صفت ہے، اسے عربی میں ''غِبطَہ'' اور اردو میں ''رشک'' کہتے ہیں۔

کسی کو جمال، مال، صحت، علم یا جاہ و منصب جیسی نعمتوں میں پھلتا پھولتا دیکھ کر یہ تمنا کرنا کہ اُس سے یہ نعمت چھن جائے اور مجھے مل جائے، حسد کہلاتا ہے۔ یہ اتنی قبیح نفسانی صفت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ''سُوْرَۃُ الْفَلَق'' میں حاسد کے حسد سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی ہے۔ نعمتیں عطا کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ کسے نعمت تفویض کرے اور کسے نعمت سے محروم کردے یا کون نعمت کا حق دار ہے اور کون نہیں ہے اور یہ کہ کس کے لیے اُس کی ساری عطائیں انعام کے طور پر ہیں اور کس کے لیے امتحان اور اِبتلا کے طور پر ہیں؟۔

حاسد دراصل اللہ کی تقدیر اور تقسیم پر اعتراض کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ''کیا یہ لوگ اُس چیز پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے ان کو (یعنی اپنے پسندیدہ بندوں) کو اپنے فضل سے عطا فرمائی ہے''۔(النساء:54)

(۲) ''اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر جو فضیلت دی ہے، اس (کے چھن جانے) کی تمنا نہ کرو''۔(النساء:32)

ایسی تمنا تو وہ کرے گا، جس کا یہ ایمان ہو کہ اللہ کے خزانے میں اتنا ہی تھا، جو اِس شخص کو دے دیا، اب میرے لیے کچھ نہیں بچا۔ مومن کا تو یہ اعتقاد ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے خزانے بے حد و بے حساب ہیں، وہ جتنا بھی کسی کو عطا کرے، اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں آتی۔ پس مومن کو تو یہ تمنا کرنی چاہیے کہ اے اللہ! یہ بھی تیری نعمتوں میں پھلتا پھولتا رہے اور مجھے بھی اپنے فضل و کرم سے نواز دے، چنانچہ فرمایا: ''اور اللہ سے اُس کے فضل کا سوال کرو''۔(النساء:32)

مشرکینِ مکہ نے اعتراض کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کو نبوت عطا کرنی ہی تھی تو مکہ اور طائف کی بستیوں میں سے کسی بڑے سردار یا رئیس کو عطا کی جاتی، ظاہری اعتبار سے وسائل نہ رکھنے والے حضرت عبداللہ و آمنہ کے یتیم فرزند کو کیوں عطا کر دی گئی؟، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''اور انہوں نے کہا: یہ قرآن ان دو شہروں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟ (اللہ تعالیٰ نے ان کے اِس اعتراض کا جواب دیا)، کیا یہ (کفار) آپ کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں؟، ہم نے (اپنی حکمت سے) ان کے درمیان دنیاوی زندگی میں (اسباب) معیشت کو تقسیم کیا ہے''۔(الزخرف:32-31)

اس آیت میں بتایا کہ دنیا یا آخرت کی نعمتوں کو اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے تقسیم فرماتا ہے، اس کے لیے وہ کسی کو جواب دِہ نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے، جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے اور صدقہ گناہوں کو ایسے دھو ڈالتا ہے، جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے اور نماز

مومن کا نور ہے اور روزہ جہنم سے (بچاؤ کے لیے) ڈھال ہے"۔(سنن ابن ماجہ:4210)

آپ ﷺ نے ایک طویل حدیث میں فرمایا: "مومن کے دل میں ایمان اور حسد دونوں بیک وقت جگہ نہیں پاسکتے"۔(سنن نسائی:3109)

رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: "تمام لوگوں میں افضل کون ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: "ہر وہ شخص جو نرم دل اور زبان کا سچا ہو، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: زبان کا سچا ہونے کو تو ہم پہچانتے ہیں، یہ "مَخْمُوْمُ الْقَلْب (نرم دل)" کون ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: وہ جو متقی ہو، اس کا دل پاکیزہ ہو، اس نے کوئی گناہ اور سرکشی نہ کی ہو اور وہ اپنے دل میں کسی کے لیے کینہ اور حسد نہ رکھتا ہو"۔(ابن ماجہ:4216)

یہودِ مدینہ ان آیات وعلامات سے سید المرسلین ﷺ کو جان چکے تھے کہ یہی وہ نبی ہیں جن کی بشارت سارے انبیائے کرام علیہم السلام دیتے چلے آئے ہیں اور ان کی نشانیاں تورات کی آیات میں موجود ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس آخری نبی کے منتظر بھی تھے۔ اور قرآن نے یہ بھی بتایا کہ اپنے عہد کے کفار کے مقابلے میں وہ آنے والے نبی آخر الزمان ﷺ کے وسیلے سے فتح کی دعائیں بھی مانگتے تھے، لیکن جب خاتم النبیین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے، تو صرف اور صرف اس حسد کی بنا پر، کہ یہ آخری نبی اور سارے انبیاء کے تاجدار، بنی اسرائیل کی بجائے بنو اسماعیل میں کیوں بھیجے گئے، آپ پر ایمان نہ لائے اور آپ کی نبوت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اور جب ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ کتاب آئی، جو اُس آسمانی کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے، جو ان کے پاس (پہلے سے موجود) ہے اور وہ اس سے پہلے (اسی نبی آخر الزمان کے وسیلے سے) کفار کے خلاف فتح کی دعا کرتے تھے، پس جب وہ ان کے پاس آگئے، جن کو انہوں نے (تورات میں بیان کردہ نشانیوں سے) پہچان لیا، تو انہوں نے ان کے ساتھ کفر کیا"۔(البقرہ:89)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس نبی اس طرح پہچانتے

ہیں، جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں''۔(البقرہ:146)

اس سے معلوم ہوا کہ حسد اخلاقی اور اعتقادی اعتبار سے اتنی مُہلک بیماری ہے کہ اس کے باعث انسان نعمتِ ایمان سے محروم ہو جاتا ہے اور بعض اوقات ایک پوری امت اس کے نتیجے میں آخرت کی تباہی اور اور بربادی کا شکار ہو جاتی ہے۔

اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے تاکیداً فرمایا:

''بدگمانی سے بچو، بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے اور تم لوگوں کی (پوشیدہ) باتیں نہ سنو اور لوگوں کے عیوب کی چھان بین نہ کرو اور جس چیز کو خریدنے کا ارادہ نہ ہو، اس کے قیمت بڑھانے کے لیے بولی نہ لگاؤ اور ایک دوسرے کے ساتھ حسد نہ کرو اور ایک دوسرے کے ساتھ بغض نہ کرو اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کی برائی نہ کرو اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ''۔ کفار، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حسد بھی کرتے تھے، مختلف طریقوں سے ایذا بھی پہنچاتے تھے اور نظر بد بھی لگاتے تھے، جبرائیلِ امین آئے اور یہ دعائیہ کلمات پڑھ کر آپ کو دم کیا: ''ہر اس چیز سے جو آپ کو ایذا پہنچائے اور حسد کرنے والے ہر نفس اور آنکھ کے شر سے بچنے کے لیے میں اللہ کے نام سے میں آپ کو دم کرتا ہوں، اللہ کے نام سے میں آپ کو دم کرتا ہوں، اللہ آپ کو شفا عطا فرمائے''۔(ترمذی:972)

حسد ہی وہ مرض ہے جس میں شیطان مبتلا ہوا، اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مسجودِ ملائک بنا کر جو عظمت عطا کی، وہ اس سے برداشت نہ ہوئی اور اسی نفسانی مرض کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہوا اور اللہ کی رحمت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔ آج ہمارے گھرانوں میں اور ماحول میں یہ اَخلاقی بیماری بہت عام ہے۔ حاسد کے حسد سے پناہ مانگنے کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے اسی لیے عطا فرمائی کہ حاسد آتشِ انتقام میں جَل کر کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔ لیکن زیادہ تر صورتوں میں حاسد اپنا ہی نقصان کرتا ہے، اپنے ہی اعمالِ خیر کو برباد کرتا ہے اور اپنے ہی دل و دماغ میں بھڑکائی ہوئی آگ میں جلتا اور کڑھتا رہتا ہے، دوسرے کا نقصان کم ہی کر پاتا ہے، اسی لیے اللہ کے نیک بندے یہ دعا کیا کرتے ہیں:

"اے اللہ! مجھے حاسد نہ بنا، محسود بنا"۔ محسود اسے کہتے ہیں جس سے حسد کیا جائے اور ظاہر ہے کہ حسد اسی سے کیا جائے گا، جس میں کوئی کمال ہو، خوبی ہو، صورت وسیرت کا جمال ہو، اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی نعمتوں سے نوازا ہو۔ پس حسد کی آگ میں جلنے سے بہتر ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت، نعمت، رأفت اور فضل وکرم کا سوالی بن کر رہے، اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہے اور اس کی عطا لامحدود ہے، نعمت ملے تو شکر کرے، مشکل کا سامنا ہو تو صبر کرے۔

10 مارچ 2014ء

تکبر واِستکبار

انسان کے اَخلاقی، روحانی اور مُہلک نفسانی عوارض میں سے ایک عُجب (Arrogance)، تکبُّر اور اِستکبار ہے۔ اسی قبیح خصلت نے شیطان کو ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ کیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا: آدم کو سجدہ کرو، تو ابلیس کے سوا سب فرشتوں نے سجدہ کیا، اس نے انکار کیا اور تکبّر کیا اور کافر ہوگیا''۔ (البقرہ:44)

عُجب کے معنی ہیں: ''غرور میں مبتلا ہونا'' اور ''تکبُّر واِستکبار'' کے معنی ہیں: ''خود کو بڑا گردانا یا بڑا سمجھنا''۔ ''اَلْمُتَکَبِّرُ'' اللہ تعالیٰ کی صفتِ جلیلہ ہے، حقیقی کبریائی اور بڑائی صرف اسی کی شان ہے، اسی لیے سورۃ الحشر آیت:23 میں جہاں اللہ تعالیٰ کی ایک سے زائد صفاتِ جلیلہ کو ایک مقام پر بیان فرمایا ہے، ان میں ''اَلْمُتَکَبِّرُ'' کی صفت بھی ہے، اس کے معنی ہیں: ''بڑائی والا، عظمت والا''۔ بقولِ شاعر:

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آزری

حدیثِ قدسی میں ربِّ ذوالجلال فرماتا ہے: ''کبریائی میری ''رِداء'' اور عظمت میری ''اِزار'' ہے، سو (بندوں میں سے) جو ان صفات میں مجھے چیلنج کرے گا، تو میں اسے جہنم میں داخل کردوں گا''۔ اور ایک روایت میں ہے: ''جہنم میں پھینک دوں گا''۔

(سنن ابن ماجہ:4175)

جب ''رِداء'' اور ''اِزار'' کی نسبت اللہ کی ذات کی طرف کی جائے، تو اس کے وہی معنی

مراد ہوں گے جو اس کے شایانِ شان ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات جسم، جسمانیات، اِن کے عَوارض، لَوازِم اور مُتعلِّقات سے پاک ہے، مقدّس ہے اور مُعَرّیٰ ہے۔ قرآن وحدیث میں اس طرح کی نسبتیں انسانوں کو سمجھانے کے لیے ارشاد فرمائی گئی ہیں، ان سے ان کے حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ ذاتِ اُلوہیت جلّ وعلاء کے شایانِ شان جو بھی معنی مراد ہوں، ان پر ہمارا ایمان ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہماری مثالی دنیا میں اعلیٰ مناصب کے لیے ایک خاص یونیفارم یا لباس ہوتا ہے۔ حدیثِ پاک سے مراد یہ ہے کہ ''مُتکبِّر'' گویا اللہ تعالیٰ کی شانِ کبریائی کو چیلنج کرتا ہے یا اس جیسا بننے کا دعویٰ کرتا ہے یا اپنے آپ کو ایسا سمجھتا ہے، اسی بنا پر اس کا ٹھکانا جہنم کو قرار دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں میں عجز و نیاز اور تواضع و انکسار کی صفات پسند ہیں، بلکہ عبادت کے معنی ہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انتہائی تذلُّل (Submissiveness) کے ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ مغرور، متکبر کو پسند نہیں فرماتا''۔ (النساء:36)
(۲) ''اسی طرح اللہ ہر جبار متکبر کے دل پر (اس کی سرکشی کے وبال کے طور) مہر لگا دیتا ہے''۔ (المؤمن:35)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن متکبرین کو (انسانی شکل میں) چھوٹی چھوٹی چونٹیاں بنا کر اٹھایا جائے گا، لوگ انہیں روندیں گے، ہر چھوٹی چیز بھی ان پر مسلط ہوگی، پھر انہیں جہنم کے اُس قید خانے کی طرف لے جایا جائے گا، جسے ''بُولَس'' کہتے ہیں اور ایسی آگ کے شعلے ان پر بلند ہوں گے، جو آگ کو بھی جلا ڈالے، انہیں زہریلی مٹی اور جہنمیوں کے زخموں کی پیپ پلائی جائے گی''۔ (ترمذی:2492)

اس کے برعکس جو اللہ کے حضور تواضع کرے، اللہ تعالیٰ اسے سربلندی عطا فرماتا ہے، ارشادِ نبوی ہے: ''جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے ایک درجہ تواضع کرتا ہے، اللہ اس کا ایک درجہ بلند فرماتا ہے اور جو شخص اللہ کے سامنے ایک درجہ تکبّر کرتا ہے، اللہ اس کو ایک درجہ پست کر دیتا ہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس کو سب سے نچلے طبقہ میں کر دیتا ہے''۔ (سُنن ابن ماجہ:4176)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بدترین بندہ وہ ہے جو تکبر کرے اور حد سے تجاوز کرے اور "جبّارِ اعلیٰ" کی ہستی کو بھول جائے، جو گھمنڈ میں مبتلا ہو اور اترائے اور خداوندِ کبیر و متعال کو بھول جائے اور جو (احکامِ خداوندی سے) غافل ہو جائے اور انہیں نظر انداز کر دے اور قبر اور اس میں گلنے سڑنے کو بھول جائے، جو سرکشی اختیار کرے اور (احکامِ الٰہی سے) بغاوت کرے اور اپنے آغاز و انجام کو بھول جائے"۔ (ترمذی:2448)

"عبداللہ بن مبارک نے کہا: کمالِ تواضع یہ ہے کہ انسان دنیاوی اعتبار سے اپنے سے کم تر کے ساتھ تواضع کرے، یہاں تک کہ اسے احساس ہو جائے کہ دنیاوی جاہ و منصب کی بنا پر آپ کو اس پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے اور یہ کہ جو دنیاوی اعتبار سے اس سے برتر ہے، اپنے آپ کو اس کے آگے ذلیل نہ کرے تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ اس کی دنیاوی برتری حقیقت میں فضل و کمال نہیں ہے۔ قتادہ نے کہا: جسے اللہ تعالیٰ نے مال یا جمال یا علم یا اسبابِ ظاہری سے نوازا ہو اور پھر وہ تواضع نہ کرے تو قیامت کے دن یہی نعمتیں اس کے لیے وبال بنیں گی۔ ایک روایت میں ہے: اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ جب میں آپ کو نعمتوں سے نوازوں تو آپ عاجزی اختیار کریں تاکہ میں تکمیلِ نعمت کروں"۔

(اِحیاءعلومِ الدین، جلد:3، ص:419)

متکبر کی ایک پہچان اَڑیل پن، ہٹ دھرمی اور کٹ حجتی ہوتی ہے، وہ حق کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا بلکہ عقلی دلائل سے اسے رَدّ کرتا ہے، حالانکہ ایمان کی حقیقت اور مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مکرم ﷺ کے فرمان کے آگے بلا چون و چرا سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔ اسے عقل کی کسوٹی پر نہیں پرکھتا بلکہ عقل کی راستی اور اِصابت (Righteousness) کے لیے وحیِ ربانی کو کسوٹی بناتا ہے اور اسی نتیجۂ فکر کو راست اور حق سمجھتا ہے، جو وحی کی کسوٹی پر پورا اترے، جو عقل کو مطلقاً معرفتِ حق کے لیے میزان اور کسوٹی بنائے، وہ زندیق ہے اور یہی ابلیس کا شِعار ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد ہے:

"اور (اے آدم!) ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر تمہاری صورت بنائی، پھر ہم نے فرشتوں

سے کہا: آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا (اور) وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا، (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: تجھ کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے منع کیا، جبکہ میں نے تمہیں حکم دیا تھا؟ اُس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے، (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: تو یہاں سے اُتر، تجھے یہاں گھمنڈ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا"۔ (الاعراف:13-12)

یعنی آگ لطیف ہے اور مٹی کثیف، اور لطیف چیز کثیف سے افضل ہے، تو میں اپنے جوہرِ تخلیق کے اعتبار سے افضل ہو کر اَدنیٰ کے سامنے سجدہ کیسے کروں؟ اسے عقل نہیں مانتی۔ دلیل اس کا ساتھ نہیں دیتی۔ سو اُس نے عقلی دلیل سے اللہ تعالیٰ کے حکم کو رَد کر دیا اور راندۂ درگاہ ہوا۔ اور فرشتوں نے بلاچوں وچرا اللہ تعالیٰ کے حکم کو تسلیم کیا اور آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ فرشتوں کو معلوم تھا کہ کمال نہ آگ میں ہے، نہ ذرۂ خاک میں ہے، کمال تو ربِّ ذوالجلال کی عطا میں ہے، وہ چاہے تو ذرّے کو آفتاب سے بالا کر دے، قطرے کو سمندر کر دے اور خاک کے پتلے آدم کو رشکِ ملائک بنا دے۔

پس متکبر انسان کی ایک پہچان خود سری، خودی فریبی اور اپنی ذات کو راستی فکر (Self Righteousness) کا حامل سمجھنا ہے، ایسے شخص پر اللہ تعالیٰ معرفتِ حق کے دروازے بند کر دیتا ہے اور فریبِ نفس میں مبتلا ہو کر وہ اپنی خطا کو صواب، باطل کو حق، ظلم کو عدل اور ناروا کو روا سمجھنے لگتا ہے۔ آج ہم اپنے پورے ماحول اور نظام کا جائزہ لیں تو ہم پر عیاں ہو گا کہ بحیثیتِ مجموعی ہم اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ یہ فریبِ نفس انفرادی بھی ہوتا ہے اور گروہی اور طبقاتی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم میں کتنے ہی گروہ ہیں جنہوں نے شریعت کے مسلمہ معیارات کو رد کر کے اپنے اپنے معیارات وضع کر لیے ہیں، علامہ اقبال کا یہ فرمان سچ ہے:

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمت روایات میں کھو گئی

بندہ جب خود رائی، خودنگری، خود فریبی اور عُجبِ نفس میں مبتلا ہوتا ہے، تو خود کو بڑا سمجھنے لگتا ہے اور دوسروں کو اپنے مقابلے میں حقیر جاننے لگتا ہے، حدیثِ پاک میں ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کے دل میں ذرہ بھر بھی تکبر ہوگا، وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا، ایک شخص نے عرض کی: (یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم!) انسان چاہتا ہے کہ اس کا لباس اچھا ہو، جوتے اچھے ہوں، (کیا یہ تکبر ہے؟)، آپ ﷺ نے فرمایا: (نہیں)، بے شک اللہ تعالیٰ (اپنی ذات، صفات اور افعال میں) جمیل ہے اور اپنی صفتِ جمال کا ظہور (اپنی مخلوق میں بھی) پسند فرماتا ہے، تکبر تو حق کے انکار اور لوگوں کو (اپنے مقابلے میں) حقیر جاننے کا نام ہے''۔ (مسلم:147)

11 مارچ 2014ء

خطیبِ بے بدل

لیے دیے، کھچے کھچے، رچے بسے، سب سے سوا، سب سے جدا، خطیبِ بے بدل، اپنے انداز کے علم الکلام کے ماہر، سینٹ سے بے دل اور قومی اسمبلی میں گاہے بگاہے درشن کرانے والے، یعنی یہ ہمارے مایۂ ناز وزیرِ داخلہ جناب چوہدری نثار علی خان ہیں۔ اخبارات سے معلوم ہوا تھا کہ اس بار انہوں نے وزارتِ داخلہ اپنی پسند سے لی تھی اور سب کچھ ٹھیک کرنے کے عزم سے انہوں نے یہ منصب حاصل کیا تھا۔ اُن کے سیاسی قد کاٹھ کو دیکھتے ہوئے بجا طور پر اُن سے کافی امیدیں بھی وابستہ تھیں۔ اُن کی شعلہ نوائی اور خطابت کے شکوہ و دبدبہ کا تو ایک زمانہ معترف ہے، قومی اسمبلی میں قائدِ حزبِ اختلاف اور پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے اُن کا انداز باوقار اور آن بان والا تھا۔ عام میل جول سے وہ ہمیشہ گریزاں رہے اور میڈیا سے بھی بالعموم فاصلے پر رہتے ہیں یا اپنی پسند پر کسی اینکر پرسن کے پروگرام میں آتے ہیں۔

وزارتِ داخلہ میں ان کے پیش رَو (Predecessor) جناب عبدالرحمٰن ملک ذرا مختلف قسم کے آدمی تھے۔ میڈیا کے ساتھ ان کے روابط (Interaction) کا عالم یہ تھا کہ اسلام آباد سے انہیں میڈیا رخصت کرتا اور کراچی ایئر پورٹ پر استقبال کے لیے موجود ہوتا، کوئی میٹنگ ہو، میڈیا سر کے بَل حاضر ہوتا، حتیٰ کہ ایک بار سابق وزیر اعظم سید یوسف رضا گیلانی کو کہنا پڑا کہ ملک صاحب فوٹو سیشن میں میرے برابر آجایئے، آپ کی برکت سے ہماری تصویر بھی آجائے گی اور انہی کا یہ قول زریں ہے کہ: ''میں تو بے وضو ملک

صاحب کا نام بھی نہیں لیتا''۔ پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم میں مصالحت کے وہ مُتَخَصِّص (Specialist) تھے۔ ظاہر ہے روٹھنے کے بعد مل جانے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ وہ صاحبِ کرامت بھی تھے، بروقت بتا دیتے تھے کہ فلاں شہر میں اتنے خودکش حملہ آور داخل ہو گئے ہیں۔ اگر اس شہر کے باسیوں کی شومیِ قسمت سے اُن کی پیشین گوئی کے مطابق خودکش حملہ ہو جاتا تو اُن کی کرامت برحق ہو جاتی اور فرماتے کہ میں نے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا اور اگر اُن کی خوش نصیبی سے یہ حملہ ٹل جاتا تو یہ اُن کی حسنِ تدبیر کا واضح ثبوت ہوتا، اس لیے دو چار پیشین گوئیاں اُن کی نوکِ زبان پر ہوتیں۔

ہمارے ممدوح چوہدری نثار علی خان صاحب کو پہلا جھٹکا سکندر حیات نے فاتحِ اسلام آباد بن کر لگایا۔ فاتحِ عالم سکندرِ اعظم کی روح اگر یہ سب منظر دیکھتی تو سکندر حیات کی قسمت پر رشک کرتی کہ اسلام آباد کے چھوٹے سے ریڈ زون کا فاتح اور چہار دانگِ عالم میں اُس کی شہرت کے ڈنکے اس شان سے بج رہے ہیں کہ اس کے مقابلے میں میری عالمی فتوحات ہیچ نظر آتی ہیں۔ وہ تو زمرد خان نے رنگ میں بھنگ ڈال دی، ورنہ چوہدری نثار علی خان صاحب کے حسنِ انتظام اور حکیمانہ تدبیر کا عالمی ریکارڈ قائم ہو جاتا۔ وہاں سے جو سلسلہ چلا ہے تو رکنے کا نام نہیں لیتا۔

اِس دوران اُن کے منہ سے نکلے ہوئے ''یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے؟'' کے جملے نے سینٹ کی آبرو خطرے میں ڈال دی اور تب سے آج تک یہ گتھی سلجھ نہیں پا رہی اور ''سینٹ آف پاکستان'' اُن کی خطابت کو ترس رہی ہے، حالانکہ اگر چوہدری پرویز الٰہی بلیک میلنگ سے ڈپٹی پرائم منسٹر بن سکتے ہیں، تو ہمارے چوہدری صاحب میں کس چیز کی کمی ہے، مگر اپنی اپنی قسمت، کسی کی مجبوری بھی اُن کی مختاری نہیں بن پا رہی۔

حالیہ سانحہ سیکٹر F-8 اسلام آباد کا ہے، جس نے اسلام آباد کی فول پروف سیکورٹی کا نہ صرف پول کھول دیا بلکہ پہلے سے خوف زدہ حکمرانوں کو اور خوف زدہ کر دیا۔ ہمارے حکمران (یعنی پارلیمنٹ کی دستوری کمیٹی کے فاضل اراکین) جب مہینوں پردے کے پیچھے

بیٹھ کر اٹھارہویں آئینی ترمیم تصنیف فرما رہے تھے، تو انہیں اندازہ ہی نہ ہوا کہ وہ ملک کو وِفاق یعنی فیڈریشن سے کنفیڈریشن کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ اب آپ لاکھ قومی سلامتی کی پالیسیاں بنائیں، صوبوں کی رضامندی کے بغیر آپ کی حکمرانی اسلام آباد تک محدود ہے۔ لا اینڈ آرڈر یعنی امن وامان صوبائی سبجیکٹ ہے۔ ہمارے اہلِ جنون کے لیڈر اور سونامی کی وعید سنانے والے کو بھی یہ اندازہ نہ تھا کہ قومی اسمبلی میں اکثریت کے بل پر آپ صرف قومی بجٹ پاس کر سکتے ہیں، کسی بھی قسم کی قانون سازی کے لیے ایوان بالا میں سادہ اکثریت لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "تحفظِ پاکستان ایکٹ" پاس نہیں ہو پا رہا۔ مولانا فضل الرحمٰن اور ایم کیو ایم ویسے ہی مشکل موضوع ہیں، کیونکہ یہ دونوں جماعتیں اپنے حصے کے مطابق یا کچھ زائد لینے کے بعد بھی بیک وقت اقتدار و اختلاف سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور صاحبِ اقتدار کو ڑھتے رہتے ہیں۔ سر دست مولانا فضل الرحمٰن حکومت میں شامل ہونے کے باوجود "تحفظِ پاکستان آرڈی ننس" کی علانیہ مخالفت کر رہے ہیں اور ایم کیو ایم اپنے کارڈ عین وقت پر اوپن کرے گی اور لازماً کوئی نہ کوئی سودا بازی (Bargaining) ہوگی۔

چوہدری صاحب کے حصے میں دوسری رسوائی سیکٹر F-8 میں عدالت پر دہشتگردوں کے حملے، جج سمیت 12 افراد کے قتل اور متعدد افراد کے زخمی ہونے اور تقریباً 45 منٹ تک کسی مزاحمت کے بغیر قتل و غارت کی کارروائی جاری رہنے کے نتیجے میں آئی۔ چوہدری اپنے سحرِ خطابت سے رات کو دن ثابت کر سکتے ہیں، لیکن خطابت کے جوہر اور الفاظ کے ہیر پھیر سے نہ حقائق بدلتے ہیں، نہ زخم بھرتے ہیں اور نہ ہی جن کے پیارے بچھڑ گئے ہیں، ان کے صدمے کم ہوتے ہیں۔ عوام کو تبدیلی اُس وقت محسوس ہوگی، جب دہشتگردی اور تخریب کاری کی کارروائی کو موقع پر ہی کامیابی کے ساتھ کاؤنٹر کیا جائے اور انہیں کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے، ورنہ بعد از مرگ واویلا اور مرثیہ پڑھنے اور انتظامی ناکامیوں کی نئی نئی تاویلات و توجیہات پیش کرنے سے قوم کی بے یقینی، احساسِ عدمِ تحفظ اور سلامتی کے اداروں اور نظام پر عدمِ اعتماد میں اضافہ ہوگا۔

نئی قومی سلامتی پالیسی کے پورے خدوخال ہمارے سامنے نہیں ہیں۔ میڈیا کے ذریعے فلٹر ہوکر جو متفرق معلومات سامنے آرہی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم زمینی حقائق کے ادراک سے عاری ہیں، فوری خطرات کے سدِّ باب کا ہمارے پاس کوئی میکنزم یا حکمتِ عملی نہیں ہے، بس آئیڈیل ازم اور صفحۂ قرطاس پر بہتر سے بہتر ڈرافٹ تصنیف کرنے میں مصروف ہیں، جس کے فضائل پر پارلیمنٹ میں ایک اچھی تقریر ہوسکے اور میڈیا پر مباحثے کا اسٹیج سج جائے اُس کی حتمی تشکیل مسلم لیگ (ن) کے موجودہ دورانیے کے بقیہ چار سال میں ہو پائے گی یا نہیں، اس کا کسی کو علم نہیں۔

قوم کو اس سے بھی کوئی غرض نہیں کہ نئی قومی سلامتی پالیسی ہمارے وزیر داخلہ اور اُن کے تحت قائم اداروں کے حکماء وفلاسفہ کا نتیجۂ فکر ہے یا یواین او یا کسی اور ادارے کی ویب سائٹ سے لی گئی ہے، جیسا کہ بعض کالم نگاروں اور تجزیہ نگاروں نے دعویٰ کیا ہے۔ لیکن مریض کو تو شفا سے غرض ہوتی ہے، اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ دوا کس نے بنائی اور کہاں سے آئی۔

پس حد درجہ احترام کے ساتھ عرض ہے کہ چوہدری صاحب نے مایوس کیا، اُن سے جو توقعات وابستہ تھیں وہ پوری نہ ہوسکیں۔ اسے قوم یا اہلِ نظر کی غلطی اور کوتاہی قرار دیا جائے کہ چوہدری صاحب کی امکانی فکری وعملی استعداد (Potential) کے بارے میں انہوں نے غلط اندازہ لگایا، بلاسبب غیر معمولی توقعات وابستہ کرلیں اور پھر ظن وتخمین اور اندازوں کا آئینہ کرچی کرچی ہوتا نظر آیا تو انہیں صدمہ ہوا۔ یا پھر اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارا پورا حکمران طبقہ خوف میں مبتلا ہے اور خوف ودہشت کی کیفیت نے اُن کی صلاحیتیں مفلوج کردی ہیں اور ان کی قوتِ فیصلہ کو سلب کرلیا ہے۔ یہ فکری انتشار اور یک سوئی کا فقدان اہلِ اقتدار تک ہی محدود نہیں، حزبِ اختلاف کی نمایاں پارٹیاں بھی اسی میں مبتلاء ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ حزبِ اختلاف کے پاس کسی بھی مسئلہ میں پیش قدمی اور پس پائی کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے۔ وہ لفظوں کے ہیر پھیر سے بھی کام لے لیتے ہیں تاکہ حسبِ توقع نتائج نہ آنے پر اُن

کے لیے Face Saving کی گنجائش رہے اور کہہ سکیں کہ ہم نے تو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ جب کہ اس کے برعکس بروقت اور درست فیصلہ کرنے کی اصل ذمّے داری حزبِ اقتدار پر عائد ہوتی ہے اور کامیابی کا کریڈٹ بھی انہیں کو جاتا ہے اور ناکامی کی ذمے داری بھی انہی پر عائد ہوتی ہے اور اُن کے لیے ذمّے داری قبول کرنے سے گریز یا فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا اور نہ ہی کفِ افسوس ملنے سے ناقص فیصلوں اور اقدامات کے نتائج کی تلافی ہوتی ہے۔

14 مارچ 2014ء

اب جب کہ

اب جب کہ ہزار ہا اندیشوں اور خدشات اور ابتدائی ریہرسل کے بعد مذاکرات کے فیصلہ کن راؤنڈ کے لیے فضا ہموار ہوگئی ہے، حکومت کی اصل کمیٹی تشکیل پا چکی ہے اور مذاکرات کے پُرزور داعی جناب عمران خان اور حکومت ایک پیج پر آ گئے ہیں اور یہ بھی تاثر دیا جا رہا ہے کہ اس سارے عمل کو مسلح افواج کی آشیرباد بھی حاصل ہے، تو پوری قوم کو اخلاص کے ساتھ دعا مانگنی چاہیے کہ یہ مذاکرات کامیاب ہوں اور نتیجہ خیز ثابت ہوں۔ پاکستان اور اہلِ پاکستان نے بہت ظلم سہہ لیے ہیں اور بہت کشت و خون ہو چکا ہے۔ وزیر اعظم کے بقول اگر کوئی مزید قطرۂ خون بہائے بغیر امن مل جائے، تو اس سے بڑی خوشی کی خبر اور کیا ہو سکتی ہے۔ وزیر اعظم جناب محمد نواز شریف نے بڑے پن کا مظاہرہ کیا اور خود چل کر خان صاحب کی رہائش گاہ پر چلے گئے اور سرکاری کمیٹی پر ان دونوں رہنماؤں کا اتفاقِ رائے بھی ہو گیا، تو بظاہر مذاکرات کا فیصلہ کن راؤنڈ شروع کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔ مولانا سمیع الحق بدستور آن بورڈ ہیں۔ مولانا فضل الرحمن کو یقیناً نظر انداز کیے جانے کا احساس ہوگا، کیونکہ وہ بجا طور پر اپنے آپ کو ایک اہم اسٹیک ہولڈر سمجھ رہے تھے۔ چونکہ کسی بھی ممکنہ آپریشن کے نتیجے میں صوبہ خیبر پختونخوا کی حکومت قبائلی عوام کے بعد سب سے اہم متاثرہ فریق ہوتی، لہٰذا اس کا آن بورڈ ہونا اور اسے بھی اعتماد میں لیا جانا ضروری تھا، سو یہ مرحلہ بھی بحسن و خوبی سر ہو گیا۔

سابق سرکاری کمیٹی کے ارکان عزتِ سادات بچا کر گھروں کو لوٹے، سوائے سربراہ

کمیٹی کے کہ ان کے معاصر کالم نگار اور صحافی بھائیوں نے اُن کی خوب خبر لی اور انہیں بہر حال اس کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ جماعتِ اسلامی چونکہ خیبر پختونخوا حکومت کا حصہ ہے، سو اس حوالے سے بالواسطہ انہیں بھی آن بورڈ سمجھیے، لیکن مذاکرات کی غیر معمولی حامی جماعت، جماعتِ اسلامی کو حکومت نے براہِ راست اعتماد میں نہیں لیا، تاہم پروفیسر ابراہیم کی صورت سے وہ طالبان کی مذاکراتی ٹیم کا حصہ ہیں اور اس سارے عمل کے عینی شاہد بھی ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ کچھ مثبت کردار بھی ادا کر سکیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی اور عوامی نیشنل پارٹی کا موقف واضح نہیں ہے، یہ دونوں پارٹیاں بیک وقت دونوں موقف اپنائے ہوئے ہیں، البتہ اُن کا اصل رُجحان فوجی آپریشن کی جانب ہے، تاہم ایم کیو ایم کا موقف واضح ہے۔ نظامِ اقتدار سے باہر کی مذہبی جماعتیں ٹی وی اسکرین پر ٹکر چلوا کر یا موقع ملنے پر ٹیلی ویژن مباحثوں میں حصہ لے کر اپنا موقف بیان کرتے رہتے ہیں اور اپنے وجود کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ لیکن جدید جمہوری اور بطورِ خاص پارلیمانی نظامِ جمہوریت میں انہیں قابلِ توجہ نہیں سمجھا جاتا تاوقتیکہ وہ سسٹم کو جام کرنے یا مفلوج کرنے کی صلاحیت ثابت نہ کریں۔ یعنی شرافت، امن پسندی یا صلاحیتِ فساد وانتشار (Nuisance Value) کا نہ ہونا کمزور اور بے اثر ہونے کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔

تحریکِ طالبانِ پاکستان اور ان کے اتحادی یا حامی گروپوں کے مطالبات تو سب کو معلوم ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) جنگ بندی، پہلے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ چونکہ حکومت جارح ہے، اس لیے جنگ بندی میں پہل بھی وہی کرے، تاہم بعد میں انہوں نے خود پہل کر کے ایک ماہ کی جنگ بندی کا اعلان کر دیا اور اب انہیں چاہیے کہ اس میں غیر مشروط توسیع کریں تاکہ مذاکرات نسبتاً پُر امن اور خوش گوار ماحول میں جاری رہیں اور نتیجہ خیز ثابت ہوں۔

(۲) پاکستان کی جیلوں میں اُن کے قیدیوں کی رہائی، اور ظاہر ہے کہ ان پر قائم مقدمات کی

واپسی اُن کی رہائی کی جانب پہلا قدم ہوگی، کیونکہ اگر ان کے خلاف کوئی مقدمہ درج ہے، تو ان کی ضمانت پر رہائی عدالتوں کی منظوری سے ہوگی اور غیر مشروط رہائی مقدمات کی واپسی کی صورت میں ہوگی اور طالبان کو بھی اپنے ہاں یرغمالی بندوں کو رہا کرنا ہوگا۔

(۳) املاک اور جانوں کے نقصان کا معاوضہ، جس کا تخمینہ یقیناوہ لگائیں گے اور اس شق پر طویل بحث مباحثہ اور اعصاب شکن بار گیننگ (سودابازی) ہوگی۔

(۴) قبائلی علاقوں سے پاکستانی مسلح افواج کا انخلا۔ حکومت کا مستقل جنگ بندی اور امن کے علاوہ کوئی اور دوٹوک مطالبہ سامنے نہیں آیا، سوائے اس کے کہ مذاکرات پاکستان کے دستوری نظام کے تابع ہوں گے، لیکن یہ ایک علامتی سا مطالبہ ہے، اس سے کوئی اساسی یا جوہری تبدیلی مذاکراتی عمل میں پیدا ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔

(۵) طالبانِ پاکستان کا آخری مطالبہ، نفاذِ شریعت ہوگا۔

جرگہ یا ڈائیلاگ قبائلی روایات کا حصہ ہے اور اس میں وہ ملکۂ تامہ اور مہارتِ کاملہ رکھتے ہیں اور اس حوالے سے ان کے اعصاب کافی مضبوط ہیں۔ میری رائے میں طالبان پوائنٹ ٹو پوائنٹ یعنی بتدریج آگے بڑھنا چاہیں گے، کیونکہ ان کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ بتدریج اپنے اہداف حاصل کرتے رہیں گے اور آخر میں نفاذِ شریعت کے مسئلے پر معاہدے میں بریک ڈاؤن کا مرحلہ بھی آسکتا ہے۔ بریک ڈاؤن کی صورت میں طالبان کی جیب خالی نہیں ہوگی، وہ کچھ نہ کچھ حاصل کر چکے ہوں گے اور ناکامی کا ملبہ بھی آسانی سے حکومت پر ڈال سکیں اور حکومت کا دامن اس مرحلے پر خالی ہوگا۔

اس لیے حکومت کا فائدہ پوائنٹ ٹو پوائنٹ مراحل طے کرنے کی بجائے ایک جامع معاہدے (Package Deal) میں ہوگا تاکہ وہ قوم کے سامنے سرخ رُو ہوسکے۔ ورنہ کفِ افسوس ملنے اور گلے شکوے سننے اور سنانے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ حکومت کے لیے یہ مرحلہ قابلِ رحم ہوگا۔

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟، قوم کو بہترین کی توقع ضرور رکھنی چاہیے، لیکن

خدانخواستہ مذاکرات کی ناکامی کی صورت میں بدترین نتائج اور ردِ عمل کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ طالبان اپنی قوت اب مجتمع اور محفوظ رکھنا چاہتے ہوں تاکہ افغانستان سے غیر ملکی افواج کے انخلا کے بعد وہ کابل پر حکمرانی کا دور واپس لا سکیں اور پھر اسے Base Camp بنا کر دنیا بھر میں نفاذِ شریعت کی راہ ہموار کر سکیں۔

ہماری رائے میں مولانا سمیع الحق اور پروفیسر ابراہیم پر بھی بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے، ان کی حیثیت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ مذاکرات میں طالبان کی نمائندگی کر رہے ہیں یا اُن کا کا نام ''طالبان کمیٹی'' ہے۔ اُن کا ایک دینی اور علمی چہرہ بھی ہے اور اسی وجاہت نے انہیں یہ مقام عطا کیا ہے۔ پس اُن کی ترجیحی دینی واخلاقی ذمے داری یہ ہے کہ وہ طالبان کے ترجمان کے بجائے حَکَم اور ثالث کا کردار ادا کریں اور دونوں کے غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی جواب دہ ہیں اور قرآن کی ہدایت یہی ہے:

''اور کسی قوم کی عداوت تمہیں اس بات پر برانگیختہ نہ کرے کہ عدل نہ کرو، عدل کرو، یہی شِعارِ تقوے کے قریب ترین ہے''۔ (المائدہ:8)

اسی طرح اُن اکابر علماء مشائخ کی بھی دینی وملّی ذمے داری ہے، جن کے ساتھ طالبان کا استاذی شاگردی یا پیری مریدی کا تعلق ہے کہ وہ انہیں اپنے پاس بلا کر یا اُن کے پاس جا کر اُن پر اِتمامِ حجت کریں کہ اُن کا فہمِ شریعت ناقص ہے اور پاکستان میں داخلی طور پر جو بھی دہشت وتخریب، قتل وفساد اور اغوا کی کارروائیاں کی جارہی ہیں یا کی گئی ہیں، شریعت میں اُن کا کوئی جواز نہیں بنتا اور اس پر انہیں اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے اللہ تعالیٰ اور تمام متاثرہ مظلومین سے معافی مانگنی چاہیے۔

جہاں تک عمران خان اور سید منور حسن کا تعلق ہے، اُن کا موقف تو یہ ہے کہ ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر اور الگ تھلگ رہ کر ہمیں اپنے معاملات سنوارنے چاہئیں، ع: ''تجھ کو پرائی کیا پڑی، اپنی نبیڑ تو''۔ پس اصل سوال یہ ہے کہ کیا حکومت بیرونی دنیا سے مکمل لاتعلقی Afford کر سکتی ہے، یعنی اس کی متحمل ہو سکتی ہے۔ سو امریکا اور مغربی دنیا ان سارے

سلسلے کو مانیٹر کریں گے اور اپنے عالمی مفادات کی میزان پر انہیں پرکھیں گے۔ اس سلسلے میں بارش کا پہلا قطرہ یورپی یونین کی پارلیمنٹ کی 35 نکات پر مشتمل قرارداد کی صورت میں سامنے آچکا ہے، انہوں نے کہا ہے کہ یورپین یونین میں جی ایس پی پلس حیثیت ملنے کے بعد اِس کے نتیجے میں عائد ذمّے داریوں کو پورا کرنا ہوگا۔ پس ہماری قیادت کو چاہیے کہ آنکھیں کان اور ذہن کے دریچے کھلے رکھے اور جو بھی اقدامات وہ طے کریں، ان کے متوقع اثرات ونتائج کو ذہن میں رکھتے ہوئے پارلیمنٹ اور پوری سیاسی قیادت کو مستقل اعتماد میں لیں تاکہ پوری قوم کی حمایت اور تعاون سے کسی بھی ناخوش گوار صورتِ حال کا مقابلہ کیا جاسکے۔

17 مارچ 2014ء

❁

میں بیمار تھا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن (اپنے بندے سے) فرمائے گا: اے فرزندِ آدم! میں بیمار تھا تو نے میری عیادت نہ کی، (بندہ) عرض کرے گا: اے پرُوردگار! میں تیری عیادت کیسے کرتا؟، تو تو ربُّ العالمین ہے (اور ان عوارض سے پاک ہے)، اللہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو نہیں جانتا کہ میرا فلاں بندہ (تیرے سامنے) بیمار ہوا، تو تو نے اس کی عیادت نہ کی، تجھے نہیں معلوم کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس ہی پاتا؟، (اللہ تعالیٰ پھر فرمائے گا:) اے بنی آدم!: میں نے تجھ سے کھانا مانگا، تو تو نے مجھے نہ کھلایا، (بندہ) عرض کرے گا: اے پرُوردگار! میں تجھے کیسے کھلاتا؟، تو تو ربّ العالمین ہے (اور بھوک و پیاس بندوں کی حاجات ہیں)، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو نہیں جانتا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا، تو تو نے اسے نہ کھلایا، کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو (میرے اس محتاج) بندے کو کھلاتا، تو تو اُسے میرے پاس ہی پاتا (یعنی مجھے اپنے قریب ہی پاتا)، (اللہ تعالیٰ پھر فرمائے گا:) اے بنی آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا، تو تو نے مجھے نہ پلایا، بندہ عرض کرے گا: اے پرُوردگار! میں تجھے کیسے پانی پلاتا؟، تو تو ربُّ العالمین ہے (اور ان حاجات سے پاک ہے)، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تجھ سے میرے فلاں پیاسے بندے نے پانی مانگا، تو تو نے اسے نہ پلایا، اگر تو نے اسے پانی پلایا ہوتا، تو اسے میرے پاس ہی پاتا''۔ (مسلم: 2569)

بندوں کے لیے غور وفکر اور عبرت کا مقام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محتاج بندے کی

بیماری کو اپنی بیماری، اس کی بھوک کو اپنی بھوک اور اس کی پیاس کو اپنی پیاس سے تعبیر فرمایا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ہستی ان تمام عوارض سے مبرّیٰ، پاک، بے عیب اور بالاتر ہے۔ پھر اُس ذاتِ عالی صفات نے بیمار کی عیادت کو اپنی عیادت اور محتاج کو کھانا کھلانے اور پانی پلانے کو اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا، حالانکہ اس کی ذات ان تمام حاجات سے پاک اور بے عیب ہے۔

محدّثینِ کرام نے اس حدیث کی شرح میں فرمایا: اس حدیثِ قدسی کا منشا یہ ہے کہ بیمار کی عیادت، محتاج بھوکے کو کھلانا اور پیاسے کو پانی پلانا، یہ بالواسطہ اللہ کی عبادت اور اس کے حبیبِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّتِ جلیلہ ہے۔ حدیث پاک کی ترتیب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیمار کی عیادت اور تیمارداری کا ثواب بھوکے کو کھانا کھلانے اور پیاسے کو پانی پلانے سے بھی زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ: ''اے بنی آدم! اگر تو بیمار کی عیادت کرتا، بھوکے کو کھانا کھلاتا اور پیاسے کو پانی پلاتا تو، مجھے اس کے قریب ہی پاتا''۔ یعنی ان کاموں سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کا قُرب حاصل ہوتا ہے، بندہ اللہ کے قریب ہوجاتا ہے اور اللہ کی رحمت بندے پر سایہ فگن ہوجاتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے دکھی بندوں کے دکھوں کا مداوا کرنے والوں کو اپنا قُرب عطا کرتا ہے۔ چنانچہ حدیثِ قدسی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میں اپنے ان بندوں کے قریب ہوتا ہوں، جو خشیتِ الٰہی سے لرز اٹھتے ہیں اور بے بسی و بے کسی کے عالم میں شکستہ دل ہوکر مجھے پکارتے ہیں''۔ (مرقاۃ المفاتیح)

یہ حدیثِ پاک میں نے صحرائے تھر کی حالیہ خشک سالی اور اُس کے نتیجے میں رونما ہونے والی بچوں کی اَموات اور وہاں کی عوام کے اِفلاس اور بے بسی و بے کسی کے تناظر میں بیان کی ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ صوبائی حکومت کے پاس اِن بیماروں کے علاج اور مصیبت زدہ لوگوں کی بھوک اور پیاس کو مٹانے کے لیے وسائل نہیں تھے، بلکہ اصل مسئلہ حکمرانوں کی بے اعتنائی، بے نیازی اور غیر ذمے دارانہ رویہ ہے۔ اگر الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا ان آفت زدہ لوگوں کے حالات رپورٹ نہ کرتا، تو شاید اور کافی عرصے تک وہ اپنے بچوں کے

لاشے اٹھاتے رہتے اور بھوک و پیاس سے تڑپتے رہتے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(۱) ''پس وہ دشوار گھاٹی میں داخل نہ ہوا اور تو کیا جانے کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟، وہ (قرض یا غلامی سے) گردن چھڑانا یا بھوک کے دن کھانا کھلانا ہے، ایسے یتیم کو جو رشتے دار بھی ہو یا کسی خاک نشین مسکین کو''۔ (البلد:16-11)

(۲) ''بات یہ نہیں ہے، بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے ہو اور تم ایک دوسرے کو کھانے کھلانے کی طرف راغب نہیں کرتے ہو اور تم وراثت کا سارے کا سارا مال ہڑپ کر جاتے ہو اور تم مال سے بہت زیادہ محبت کرتے ہو''۔ (الفجر:20-17)

زیادہ سنگ دلی اور دکھ کی بات یہ ہے کہ صوبائی حکومت اپنے عوام کے حالات سے بے خبر، ثقافت کے نام پر رنگ رلیاں منانے میں مصروف تھی اور اُسے سندھ کی خدمت سے تعبیر کیا جا رہا تھا، جب کہ اس دوران سندھ کے مفلوک الحال عوام اور نومولود بچے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ قومی خزانے کی وہ امانتیں جو اس کے حق داروں کو لوٹائی جانی چاہییں تھیں، وہ گویّوں اور رَقّاصوں پر لٹائی جا رہی تھیں اور اسے لبرل ازم اور روشن خیالی کا نام دیا جا رہا تھا۔

اب میڈیا کے متوجہ کرنے پر وفاقی حکومت، صوبائی حکومت اور صوبہ پنجاب و خیبر پختونخوا کی حکومتیں اور مخیر حضرات اس طرف متوجہ ہوئے ہیں، ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں، کچھ نہ ہونے سے ہونا ہی بہتر ہے، خواہ بعد از خرابیِ بسیار ہی کیوں نہ ہو۔ اس مرحلے پر ہم اس امر کی جانب بھی متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ اِن قدرتی مصائب کے موقع پر جب وسائل کو اس جانب موڑا جاتا ہے، تو جلد بازی میں بعض اوقات Overlapping ہو جاتی ہے، اس کو عربی میں ''تراکب اور تداخُل'' کہتے ہیں، یعنی وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم یا چند افراد کو ان کے حصۂ استحقاق (Deserved Share) سے زیادہ مل جانا اور بعض افراد کا سرے سے محروم رہ جانا۔

وفاقی حکومت، حکومتِ سندھ، پنجاب اور خیبر پختونخوا کی حکومت اور مخیر حضرات کی

جانب سے مُعتد بہ (Sizeable) رقوم کا اعلان ہو چکا ہے۔ بیماروں کے علاج اور افلاس زدہ انسانوں اور مویشیوں کی فوری ضرورتوں کو ترجیح اوّل ملنی چاہیے، لیکن امدادی رقوم اور اعانتی سامان کی تقسیم کے لیے مناسب Survey، یعنی تفصیلی جائزہ لیا جانا چاہیے اور اس کا شفاف ہونا بھی ازحد ضروری ہے۔ اس تفصیلی جائزے میں سیاسی ترجیحات کی بجائے ضرورت کو استحقاق کی بنیاد بنانا چاہیے۔ میڈیا اور قابلِ اعتماد رفاہی تنظیموں کو بھی اس پر نظر رکھنی چاہیے، ورنہ بروقت امداد نہ پہنچنے کے نقصان سے امداد کی غیر شفاف اور غیر منصفانہ تقسیم کا نقصان اُفقی (Horizentally) اور عمودی (Vertically) اعتبار سے زیادہ اور دیر پا ہوگا۔ بدقسمتی سے صوبہ سندھ کی بیوروکریسی کی شہرت بھی دوسرے صوبوں کے مقابلے میں زیادہ داغ دار ہے۔

اکثر یہ سوال اٹھتا ہے کہ صوبہ سندھ کے حکمران اور سیاست دان عوام کے مسائل سے لاتعلق (Irrelevant) کیوں ہوتے ہیں، انہیں عوام کے دکھ درد کا احساس کیوں نہیں ہوتا، ان کی حکومت کی فیض رسانی (Delivery) اور اندازِ حکمرانی (Governance) پر ہمیشہ انگلیاں کیوں اٹھتی ہیں؟۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سندھ کے عوام نے 1970ء سے 2013ء تک کبھی بھی میرٹ اور کارکردگی کی بنیاد پر ووٹ نہیں دیا۔ خاص طور پر اندرونِ سندھ کے عوام نے پیپلز پارٹی کی حمایت کو ایک طرح سے عقیدے کا درجہ دے دیا ہے، تو پھر حکمرانوں کے بارے میں اُن کے گلے شکوے کا کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا۔ انسان اکثر اپنے تجربات سے سیکھ کر اپنی سوچ اور فیصلوں کا انداز بدل لیتا ہے، سندھ میں سیلاب اور قدرتی آفات پہلے بھی آتی رہی ہیں اور ان کا نتیجہ بھی آج سے کوئی مختلف نہیں تھا، لیکن اس سے عوام کی سیاسی وابستگی پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوا، بقولِ شاعر:

اطہر تم نے عشق کیا، کچھ تم بھی کہو کیا حال ہوا؟
کوئی نیا احساس ملا، یا سب جیسا احوال ہوا

سو حق اور سچ یہ ہے کہ ماضی کے تجربات نے سندھ کی عوام میں کوئی نیا احساس پیدا نہیں

کیا، انتخابات کے موقع پر حکمرانوں کے احتساب کا کوئی سیاسی کلچر پروان نہیں چڑھا، اسی لیے یہاں کے اندازِ حکمرانی میں کبھی کوئی جوہری تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ چنانچہ شیطان کے پیروکار دنیا میں کی گئی اپنی بداعمالیوں کا ملبہ جب آخرت میں شیطان پر ڈال کر اپنی ذمے داری سے دامن چھڑانا چاہیں گے، تو شیطان کا جواب قرآن کے کلماتِ مبارکہ میں یہ ہوگا:

''جب حشر کی کارروائی پوری ہوگئی، تو شیطان نے کہا: بے شک اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا، وہ برحق وعدہ تھا اور میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا، سو میں نے اس کے خلاف کیا، (لیکن) میرا تم پر کوئی زور تو نہیں چلتا، سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں (گناہ کی طرف) بلایا، تو تم نے میری دعوت پر لبیک کہا، سو (آج) تم مجھ کو ملامت نہ کرو، (بلکہ) اپنے آپ کو ملامت کرو''۔ (ابراہیم:22)

20 مارچ 2014ء

صوفی اسلام

تصوف دراصل قلب وذہن کی پاکیزگی (جسے قرآن مجید میں ''تزکیہ'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے)، روحانی جلا، اِخلاص، تسلیم ورضا اور اعمال وعبادات میں درجۂ احسان کا نام ہے، جسے حدیثِ جبریل میں رسول اللہ ﷺ نے واضح فرمادیا: ''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت حضوریِ قلب کے ساتھ اس طرح کرو کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، پس اگر تم اپنی بصارت کی نارسائی کے سبب اسے نہیں دیکھ پاتے، تو وہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے''۔ یہی روحِ تصوف ہے۔

جہادِ افغانستان کے دوران امریکا اور پوری مغربی استعماری دنیا اس کی پشت پناہ بھی تھی اور اس کے لیے تمام تر مالی اور حربی وسائل بھی فراہم کیے جارہے تھے، عالمی میڈیا اس کی حوصلہ افزائی کررہا تھا۔ دنیا بھر سے مجاہدین کو لاکر صوبہ خیبر پختونخوا اور قبائلی علاقے میں جمع کردیا گیا، جن میں عرب، ازبک، تاجک، افریقی اور محدود تعداد میں سفید فام لوگ بھی شامل تھے۔ سوویت یونین، جس کا سرکاری نام ''یونین آف سوویت سوشلسٹ ریپبلک'' تھا، مشترکہ دشمن قرار پایا۔ مسلمانوں کے نزدیک اس لیے کہ سوویت یونین نے ایک مسلم ملک افغانستان پر فوج کشی کی تھی اور امریکا اور مغربی دنیا اس لیے کہ ان کے سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کو سوویت یونین کے آمرانہ اور اشتراکی نظام سے خطرات لاحق تھے۔

آخرِ کار سوویت یونین نے افغانستان سے اپنی بساط لپیٹی اور بعدازاں دنیا کے نقشے پر اُس کا نام بھی باقی نہ رہا۔ کئی نئے آزاد ممالک دنیا کے نقشے پر ابھر کر سامنے آئے۔ مثلاً:

وسطی ایشیا کے ممالک ازبکستان، تاجکستان، قزاقستان، کرغیزستان، آرمینیا اور آذربائیجان، مشرقی یورپ کے ممالک: یوکرائن، جارجیا، پولینڈ، چیکوسلاویکیا، بیلاروس وجود میں آئے۔ دیوارِ برلن گری اور عوامی جمہوریہ جرمنی (سابق مشرقی جرمنی) وفاقی جمہوریہ جرمنی میں ضم ہوا اور متحدہ جرمنی وجود میں آیا۔ اس کے علاوہ لٹویا، مالدووہ، لتھوینیا اور اسٹونیا کی آزاد بالٹک ریاستیں قائم ہوئیں۔ اسی طرح یوگوسلاویا کی فیڈریشن بھی ٹوٹ گئی اور بوسنیا ہرزیگووینا، کروایشیا اور سربیا کی آزاد ریاستیں وجود میں آئیں اور سابق سوویت یونین کی تحلیل کے بعد صرف رشین فیڈریشن باقی رہی۔

جہادِ افغانستان کے نتیجے میں ایک طرف تو اشتراکی نظام پون صدی کے تجربے کے بعد ناکامی سے دوچار ہوا اور دنیا جو دو سپر پاورز کے حلقہ ہائے اثر میں منقسم تھی، اب سوویت یونین کی تحلیل اور اشتراکی نظام کی ناکامی کے بعد یک قطبی ہوگئی۔ اب تا حال دنیا میں ایک ہی سپر پاور امریکا ہے، جو دنیا کو اپنی مرضی اور منشا کے مطابق چلانا چاہتا ہے، اس میں خواستہ و ناخواستہ یورپی یونین اس کی حلیف ہے۔ جب دنیا میں دو سپر پاورز موجود تھیں، تو کسی حد تک تحدید و توازن کا نظام موجود تھا، مگر سوویت یونین کی تحلیل کے بعد امریکا شترِ بے مہار بن گیا، اقوامِ متحدہ اور اس کی سلامتی کونسل اس کی باندی بن گئیں، ان دونوں اداروں سے مہرِ تصدیق ثبت کر کے جس پر چاہا فوج کشی کردی اور جس کا چاہا ناطقہ بند کردیا اور مشکیں کس دیں۔

9/11 کے بعد محبت و نفرت اور دوستی و دشمنی کے پیمانے بدل گئے، ماضی کے محبوب اب مبغوض (Hateful) ہوگئے، دوستی دشمنی میں بدل گئی۔ امریکا نے افغانستان پر فوجی یلغار کردی اور طبلِ جنگ بجاتے ہوئے اُس وقت کے امریکی صدر جارج ہربرٹ بش نے کہا: ''اس میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ یہ جنگ ہم ہی جیتیں گے''۔

مگر یہ دشمن جسے تر نوالہ سمجھا گیا تھا، وہ لوہے کے چنے ثابت ہوا، دانت گھس گئے، مگر یہ چنے چبائے نہ گئے۔ اس تلخ تجربے کے بعد امریکا اور مغربی مفکرین نے ''صوفی اسلام'' کا پرچم سربلند کرنے، اس کی پذیرائی کرنے اور اسے پروموٹ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس

مقصد کے لیے ڈالر، پاؤنڈ اور یورو کی تجوریاں کھول دی گئیں، مغرب و مشرق میں "صوفی کانفرنسیں" اور "سیمینار" منعقد کیے جانے لگے، آنیاں جانیاں لگ گئیں، حتیٰ کہ چوہدری شجاعت حسین "صوفی کونسل" کے سربراہ قرار پائے اور اس وقت کی امریکی سفیرہ این پیٹرسن نے بعض مساجد اور مزارات کے دورے کیے اور ان کی تزئین و آرائش کے لیے گرانٹ منظور کی۔

انہیں دراصل تصوف سے کوئی غرض نہ تھی، ان کی نظر میں "صوفی اسلام" سے مراد "بے ضرر اور غیر مزاحمتی اسلام" تھا کہ جب چاہو اور جسے چاہو روند ڈالو، کچل دو، کسی بھی طرف سے ردِ عمل کے طور پر "چوں" کی آواز بھی نہ آئے۔ اس پر کچھ ہمارے سادہ لوح دوستوں نے سمجھا کہ اب "صوفی اسلام" کے غلبے کا دور آچکا، صبحِ نو طلوع ہو چکی اور ماضی قریب قصۂ پارینہ بننے والی ہے۔ یہ خود فریبی اور خوش فہمی تھی، میں نے دوستوں سے کہا: ایسا بھی کوئی ایمان اور اسلام ہے، جسے پروموٹ کرنے کا بیڑا امریکا اٹھائے۔ لیکن عزیمت سے عاری اور حقیقت سے نظریں چرانے والے لوگ دن میں کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں اور ایسی ہی من پسند خوابوں کی دنیا میں رہنا چاہتے ہیں، یا تو انہیں نوشتۂ دیوار اور سامنے کے حقائق کا ادراک نہیں ہوتا اور یا وہ ان کا سامنا کرنے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں پاتے۔ اس دوران امریکا اور مغرب کے سفراء، مفکرین یا ان کے صحافیوں سے مکالمہ ہوتا، تو میں انہیں یہ کہتا کہ آپ کی یہ تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی، کیونکہ جس فکری رُجحان (Phenomenon) اور جہادی یا عسکری جنون کا آپ کو سامنا ہے، اس کی تاریخ تین چار دہائیوں پر مشتمل ہے۔ اس کی فکری آبیاری، مالی وسائل اور جدید ترین اسلحہ و حربی ٹیکنالوجی کی فراہمی اور بین الاقوامی روابط کے قیام میں آپ لوگوں کا بڑا حصہ تھا اور آپ کے اشارے پر بعض عرب ممالک نے بھی اپنے خزانوں کے در کھول دیے تھے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ آنِ واحد میں آپ کمپیوٹر کا بٹن دبائیں اور کوئی دوسری قوت اُن کے مقابل آکھڑی ہو اور آپ فاتحِ عالم بن کر نکل جائیں۔ یہ وہ جن ہے جسے بوتل سے نکالنے کا منتر تو

معلوم ہو جاتا ہے، لیکن واپس بند کرنے کا منتر کسی کو نہیں آتا۔

جب یہ تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی تو پھر امریکا نے طالبان کی صفوں کا ایکسرے کر کے ان میں سے کچھ اچھے طالبان کی تلاش شروع کر دی اور ان سے مکالمے کی تدبیریں سوچی جانے لگیں، مگر یہ حیلہ بھی کارگر ثابت نہ ہوا۔ یہ سطور لکھنے کا خیال مجھے اس لیے آیا کہ ایم کیو ایم جو اپنے دعوے کے مطابق سیکولر پارٹی ہے، اس کے قائد جناب الطاف حسین کو اچانک ''صوفیائے کرام کانفرنس'' منعقد کرنے کا خیال آیا۔ میں نے ان دوستوں سے کہا: اس سکّے کو تو امریکا آزما کر دیکھ چکا، اس میں کوئی حرارت یا انقلابی ولولہ اب نہیں رہا۔ چند مستثنیات کے سوا تصوف کے آستانے تو کب کے ویران ہو چکے، اب عقابوں کے نشیمن زاغوں کے تصرف میں ہیں، اب وہاں ایک جدید قسم کی روحانی جاگیرداری جڑ پکڑ چکی ہے اور اس کے لیے صرف کسی بزرگ سے نسبی اور صُلبی نسبت کا ہونا کافی ہے۔ علم وعمل، تقویٰ و کردار، تزکیہ، شِعارِ طریقت اور معیارِ شریعت، الغرض کسی چیز کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اسی لیے وہ آستانے جو کبھی علم وعمل اور شریعت وطریقت کا مرکز تھے، اب وہاں عشرتیں ہیں، دادِ عیش ہے، حکومتی مناصب ہیں، اقتدار کے ایوانوں تک رسائی ہے، شاہ ہیں، مخدوم ہیں، شہزادے ہیں، صاحبزادے اور پیرزادے ہیں، جن کے چہرے مُہرے، وضع قطع اور اَطوار سے شریعت وطریقت کی کسی ظاہری علامت کی بھی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ اولیائے کاملین اپنے مزارات میں آرام فرما ہیں اور ان کی شریعت وطریقت کی میراث کی مارکیٹنگ کسی اہلیت ومعیار کے بغیر اپنی دنیا سنوارنے کے لیے کی جا رہی ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ ان غیر متدین اور غیر مُتشرّع سجادگان کی مارکیٹنگ کے لیے ایسے واعظ اور خطباء پیدا ہو گئے، جو معمولی نذرانوں کے عوض یہ خدمات بجا لا رہے ہیں، انہیں عوام کی نفسیات سے بھی کھیلنا آتا ہے اور ان کی سادہ لوحی اور عقیدت کو بھی کیش کرنا خوب آتا ہے۔ امریکا کی ہارورڈ یونیورسٹی، ییل یونیورسٹی، برطانیہ کی آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کے مارکیٹنگ گریجویٹ بھی ملٹی نیشنل کارپوریشنز کے لیے شاید ایسی مارکیٹنگ نہ کر

پائیں، جو ہمارے ہاں کے واعظ اور خطباء اِن نااہل سجادگان کے لیے کرتے ہیں۔ وہ بھی دین کے نام پر دنیا کماتے ہیں اور ان کی بھی دین کے نام پر دنیا سنور جاتی ہے۔ اب کلاشنکوف کی گولی، راکٹ، بمب اور خودکش حملوں کا جواب مزارات پر قوالی کی محفلوں، رقص ودھمال اور حقیقت سے عاری ''وجد'' اور ''تواجد'' سے نہیں دیا جاسکتا۔

تصوف تو دراصل اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان وایقان اور صفاتِ الٰہی کا مَظہر بننے کا نام ہے، جس کی بنا پر صاحبِ ایمان باطل کے مقابلے میں ڈٹ جاتا ہے اور باطل سے سمجھوتا نہیں کرتا۔ علامہ اقبال نے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
اُس کے نفسِ گرم سے ہے، گرمیِ اَحرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

مُلوکیت کا دَور ہے اور صوفیہ کا امام استقامت کے ساتھ میدان میں کھڑا نظر آتا ہے۔ علامہ اقبال کے بقول وہ حریت کا پاسبان اور سرمایۂ ملت کا نگہبان ہے، اس کی گردن اللہ کے سوا کسی جابر سلطان کے سامنے نہیں جھکتی۔

یہی صورتِ حال غوث الاعظم محی الدین عبد القادر الجیلانی نوراللہ مرقدہ کی ہے۔ خلیفہ ابوالمظفر المستنجد باللہ سونے اور چاندی کی تھیلیاں بھر کر نذرانہ پیش کرنے آتا ہے، آپ وہ تھیلیاں ہاتھوں میں دباتے ہیں تو ان سے خون ٹپکنے لگتا ہے، آپ نے فرمایا:

''اے ابوالمظفر! تمہیں اللہ سے حیا نہیں آتی کہ لوگوں کا خون چوستے ہو اور مجھے اس کے نذرانے پیش کرتے ہو، خدا کی قسم اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کا پاس نہ ہوتا، تو یہ خون بہتا ہوا خلیفہ کے محل تک جا پہنچتا''۔

وقت کے جابر سلاطین کے لیے آپ کی دعا یہ ہوتی تھی: ''اے اللہ! یا تو انہیں ہدایت عطا فرما اور یا ان کی شوکت کو توڑ دے''۔

21 مارچ 2014ء

جہاد کا اعجاز

''صوفی اسلام'' کے عنوان سے کالم جمعہ 21، مارچ کو شائع ہوا اور اس پر ای میل کے ذریعے فوری طور پر ملک اور بیرونِ ملک سے متعدد حضرات کا مثبت ردِّ عمل موصول ہوا۔ بہت سے حضرات نے تفصیلی تاثرات لکھے، اُن میں سے ایک مہربان منصور احمد صاحب نے لکھا:

''مفتی صاحب! مانا کہ جہادِ افغانستان کے موقع پر تو امریکا، نیٹو، بلکہ پوری مغربی دنیا، چین، عالَمِ عرب، الغرض سارا عالَم ہی سوویت یونین کے خلاف میدانِ عمل میں آ گیا تھا اور اِس بنا پر جہادِ افغانستان میں اَخلاقی، مالی اور حربی امداد کا راستہ کھل گیا تھا، مگر 2001ء تا 2014ء میں امریکا و نیٹو سمیت اٹھائیس ممالک کی تقریباً ڈیڑھ لاکھ مسلح افواج نے جدید ترین سامانِ حرب، مشترکہ انٹیلی جنس نیٹ ورک اور مالی ترغیبات سے آراستہ ہوکر افغانستان پر فوج کشی کر دی اور زمین پر فوج اُتارنے سے پہلے جدید ترین جنگی جہازوں کے ذریعے بمباری کر کے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ وہاں ایک کٹھ پتلی حکومت بھی قائم کی، افغانستان کی مقامی فوج بھی تیار کی اور اُسے تربیت دے کر جدید ترین اسلحہ سے آراستہ بھی کر دیا۔ طالبان کی حکومت تو شروع ہی میں ختم ہو چکی تھی، مجاہدین کے لیے اب نہ کوئی جائے پناہ رہی اور نہ ہی بیرونی مالی و حربی امداد کے ذرائع باقی رہے، نہ پیٹرو ڈالر کا سیلاب کہ بعض بندگانِ اغراض سیم وزر اور درہم و دینار کی چکا چوند دیکھ کر اس طرف مائل ہو جاتے۔ ہر صاحبِ نظر کو معلوم ہے کہ سعودی عرب اور اس کے زیرِ اثر ممالک اور مصر وغیرہ

خواستہ و نا خواستہ براہِ راست امریکا کے تابع ہیں، لہٰذا وہ امریکا کی مرضی کے خلاف کسی کو امداد دینے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب امریکا جدید ترین سامانِ حرب و ضرب کے انبار کے ہوتے ہوئے خائب و خاسر ہو کر اور اپنے مقاصد میں ناکام رہ کر افغانستان سے اپنے اتحادیوں سمیت بوریا بستر کیوں لپیٹ رہا ہے؟۔ کیا اُسے جذبۂ جہاد اور مجاہدین کی قوتِ ایمانی کے سوا کوئی اور نام دیا جا سکتا ہے، اس کی اور کیا توجیہہ کریں گے؟۔ پس یہ مان لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ جذبۂ جہاد کا نہ کوئی متبادل ہے اور نہ ہی اِس کا کوئی توڑ، اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس کی حکمت کے تحت دیر ہو سکتی ہے، مگر اندھیر نہیں''۔

یہ میں نے اپنے قاری کے تأثرات کو اپنے الفاظ میں ذرا مرتب انداز میں تحریر کیا ہے، تاکہ اِس ذہنی سوچ کا ابلاغ بہتر انداز میں ہو سکے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ بات بہت حد تک درست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک ہمارے روشن خیال اور لبرل ماہرین اسٹوڈیوز میں بیٹھ کر دھڑلے سے یہ کہتے تھے کہ افغانستان میں امریکا کی فتح یقینی ہے۔ مگر جب سے امریکا نے افغانستان سے 2014ء میں اپنی بساط لپیٹنے کا قطعی اعلان کیا ہے، تو اُن ماہرین کا لب و لہجہ اور سُر بدل گیا ہے اور Tone بھی پہلے جیسی نہیں رہی اور اب وہ یہ کہنے لگے ہیں کہ طالبانِ افغانستان کا غلبہ واضح ہے، وہ افغانستان کے بیشتر حصے پر ان کے کنٹرول اور تحکّم (Writ) کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اب وہ دبے لفظوں میں یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ امریکا اور اُس کے اتحادیوں کے مقابلے میں طالبانِ افغانستان کی اَخلاقی برتری واضح ہے، کیونکہ وہ غیر ملکی قابض اور غاصب استعماری افواج کے مقابل اپنے ملک کی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں، جب کہ امریکا ایک غاصب اور قابض بیرونی قوت ہے۔

اگر جہادِ افغانستان کے نتیجے میں سوویت یونین بطورِ ریاست صفحۂ ہستی سے مٹ گیا تھا، تو اب امریکی رعب و دبدبے کی بھی وہ پہلے جیسی آن بان نہیں رہی۔ چنانچہ یوکرائن کے ایک حصے ''کریمیا'' میں روس سے اِلحاق کے لیے یک طرفہ ریفرنڈم اور اُس کے نتیجے میں

رشین فیڈریشن کے ساتھ اِلحاق کے خلاف امریکا اور اس کے اتحادیوں نے علامتی اقدامات پر اکتفا کی اور زیادہ جارحانہ انداز نہیں اپنایا، یہ رُجحان (Phenomenon) ایک بدلتے ہوئے مَنظر کی نشاندہی کر رہا ہے۔ یہ سوال اپنی جگہ ہے کہ امریکا کے مقابل ایسی سپر پاور جو اس کی برتری کو چیلنج کرے یا اس کے مظالم کے آگے ایک سدِّ راہ بن جائے، کب اور کتنی قوت کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے؟، اس کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، کوئی بھی یقینی اور قطعی پیشین گوئی نہیں کر سکتا۔

جہاد کا اعجاز کوئی نئی بات نہیں ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے اوّلین خطبۂ خلافت میں، جسے ہم کسی بھی مہذب و متمدن اسلامی ریاست کا منشور قرار دے سکتے ہیں، فرمایا تھا:

''جب بھی قومِ مسلم شِعارِ جہاد کو ترک کرے گی، تو اس پر ذلت مُسلّط کر دی جائے گی اور جب بھی اُمتِ مسلمہ میں فحاشی (Obscenity) عام ہو جائے گی، تو اس پر آفات کا نزول ہو گا''۔

پس حق اور سچ یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی حُرمت اور وقار کا راز جذبۂ جہاد میں مضمر ہے۔ اگرچہ جہاد کے عنوان کا غلط استعمال اور شریعت کی مَنشا کے خلاف اُس کی تطبیق بجائے خود ایک اَلمیہ ہے۔

ہم جس ذہنی افتاد (MInd Set) کے مخالف ہیں اور اسے دینِ اسلام اور شریعت کی رُو سے کسی بھی درجے میں جائز نہیں سمجھتے اور اس کے باطل ہونے میں ہمیں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، یہ وہ دہشت گردی، قتل وغارت اور تخریب وفساد ہے جو پاکستان کی سرحدوں کے اندر برپا ہے اور اس کے نتیجے میں پاکستان میں ہزاروں کی تعداد میں بے قصور انسانی جانوں کا اِتلاف ہوا ہے اور بعض تجزیہ نگاروں کے دعوے کے مطابق جانی نقصان کے اَعداد وشمار پچاس ہزار سے متجاوز ہیں، جب کہ پاکستان کو مالی اِعتبار سے سو ارب ڈالر کا نقصان ہو چکا ہے۔ اسے یکسر بند ہونا چاہیے اور یہ سلسلہ حتمی اور قطعی طور پر ختم ہونا چاہیے۔

اگر مذاکرات پُرامن طریقے سے ہوسکیں تو پاکستان کے لیے بہت بڑی کامیابی ہے، ورنہ ہر قیمت پر ملک وقوم کو امن وسلامتی فراہم کرنا ریاست کی ذمے داری ہے۔

تصوف کے سوتوں کے خشک ہوجانے اور مراکزِ تصوف کے ویران ہوجانے کا جو میں نے ذکر کیا ہے، تمام قارئین نے اس کی تائید کی ہے۔ یہ مبارک ومقدس سلسلے چند مستثنیات کے سوا اب مِشن کی بجائے معاش بن چکے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بزرگانِ دین کے مزارات سے متصل دینی تعلیم، تزکیہ اور تربیت کے ادارے قائم ہوتے، انسانی فلاح ورفاہ کے کام ہوتے، شریعت وطریقت کی شمعیں روشن ہوتیں، راہِ راست سے بھٹکے ہوئے انسانوں کو دوبارہ ''صراطِ مستقیم'' پر گامزن کیا جاتا، خدا فراموش بندوں کو خداشناسی کی راہ پر لگایا جاتا اور تاریک دلوں میں حُبِّ الٰہی اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی شمعیں روشن کی جاتیں اور مسلمانوں کو بے عملی کی کیفیت سے نکال کر کردار وعمل کا پیکر بنایا جاتا۔ اِن آستانوں سے وابستہ ساری اَفرادی قوت سپاہ عزیمت بنتی اور آج جس بے کسی اور بے بسی کا ماتم کیا جارہا ہے، اِس گریہ وزاری کی نوبت نہ آتی، بقولِ علامہ اقبال:

محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے، اوروں کو بھی دکھلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

جب حق میں باطل کی آمیزش کردی جائے یا دین کے نام پر دنیا سنواری جائے، تو علمائے ربانیین اور علمائے حق کا کام ہوتا ہے کہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ کیے بغیر کلمۂ حق بیان کریں اور اولیائے کرام سے محبت کرنے والے سادہ لوح مسلمانوں کو اچھے اور برے کی تمیز سکھائیں اور بتائیں کہ ہر چمکدار چیز سونا نہیں ہوتی اور صحرا میں چمکتی ہوئی ریت سَراب ہوتی ہے، سرچشمۂ خیر نہیں ہوتی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ عقابوں کے نشیمن پر قابض زاغوں نے پیشہ ور واعظین اور خُطباء کو نہایت ہوشیاری اور عیاری سے اپنا

مارکیٹنگ ایجنٹ اور سیلز مین بنا لیا ہے اور دونوں کے اشتراک سے سادہ لوح عوام شکار ہو رہے ہیں۔ وہ تصوُّف جو کبھی طاقت تھا اور وقت کے مُلوک اور سلاطین بھی ان اَہل اللہ کی وجاہت، قوتِ ایمانی اور رُوحانی سَطوت و شوکت سے لرزتے تھے، اب مُتَصوِفین کے حصار میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ جن کو دِین سے کوئی واسطہ نہیں، وہ ''صوفی اسلام'' کے پرچارک اور پروموٹر بن گئے ہیں، فیا للعجب!۔

پس وقت کا تقاضا یہ ہے کہ حقیقی صوفیائے کرام اور علمائے حق اس خطرے کا اِدراک اور اِس کی تلافی کی تدبیر کریں۔ حضرت سید علی ہجویری رحمہ اللہ کے عہد تک تو مُتَصوِف (جعلی صوفی) کم از کم ظاہرداری کے لیے دِین کا لبادہ اَوڑھ لیتے تھے، اب تو اِس اداکاری کی بھی ضرورت نہیں رہی۔

24 مارچ 2014ء

ہاہا کار

لگتا ہے مولانا محمد خان شیرانی کا ہمارے الیکٹرونک میڈیا کے اینکر پرسنز اور اخباری کالم نگاروں سے کوئی روحانی رشتہ یا فکری رابطہ ضرور ہے۔ جب بھی ہمارے میڈیا کو موضوعات کی قلت کا سامنا ہوتا ہے، ٹیلی ویژن اسکرین کی رونقیں ماند پڑنے لگتی ہیں، کالم کی کاٹ دار چھری کی آب وتاب ماند پڑنے لگتی ہے، این جی اوز کی بیگمات اور ماہرین کی طلب میں کمی آتی ہے، تو مولانا اُن کی مدد کو آتے ہیں اور اسلامی نظریاتی کونسل کی کوئی قرارداد یا سفارش چپکے سے میڈیا کے حوالے کر دیتے ہیں اور پھر چاروں طرف رونقیں لگ جاتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ٹیلی ویژن اسکرین یا کالموں کی بہار سے کوئی انقلاب برپا ہونے کو ہے۔ چنانچہ مولانا اور میڈیا کی یہ نظریاتی رفاقت جاری وساری ہے اور ان کی اسلامی نظریاتی کونسل کی چیئرمین شپ کے دوام کے لیے الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا سے بڑھ کر دعا گو اور کون ہوگا؟۔ پس لازم ہے کہ مولانا کی چیئرمین شپ جاری رہے تاکہ گلشن کا کاروبار رواں دواں رہے۔

اس عرصے میں میڈیا کی مدد کے لیے مولانا نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے دو سفارشات جاری کیں: ایک چیئرمین شپ کے پہلے دور کے اختتام پر ڈی این اے ٹیسٹ کی قطعی شرعی شہادت نہ ہونے کے حوالے سے اور دوسری موجودہ دور کے آغاز پر اس حوالے سے کہ دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کی تحریری اجازت ضروری نہیں ہے۔ ان دونوں سفارشات کا بعض لوگوں کو بڑا فائدہ ہوا، کچھ حضرات کو اپنی فنی مہارت کے اظہار اور

بعض این جی اوز کی بیگمات کو اپنی روزی حلال کرنے کا موقع ملا۔

میڈیا کی آتش بداماں بحثیں سن کر ایسا لگا کہ پاکستان میں ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعے روز درجنوں کی تعداد میں خواتین کی عصمت دری کرنے والوں کو ٹھکانے لگایا جارہا تھا، مولانا نے ظلم کی انتہا کردی ہے کہ یہ سارا سلسلہ یکدم موقوف کردیا۔ اسی طرح ایسا محسوس ہوا کہ ہمارے جاگیردار، پیر، میر، وڈیرے، سیاست دان اور سرمایہ دار دوسری شادی کی اجازت لینے اپنی پہلی بیگمات کے سامنے قطاریں بنائے کھڑے تھے، مگر مولانا نے اچانک آکر اس Queue کو توڑ دیا۔ چنانچہ ان حضرات کی پہلی بیویاں یک دم بے توقیر ہوگئیں اور اب ان کی کوئی قدرومنزلت باقی نہ رہی۔

ان سلاطینِ میڈیا سے بڑھ کر کون جانتا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کی سفارشات پر مشتمل بڑے بڑے حجم (Volume) کی اتنی کتابیں مطبوعہ صورت میں موجود ہیں کہ الماری بھر جائے، مگر کب کسی پارلیمنٹ نے ان پر غور کیا ہے یا بحث کی ہے یا قانون سازی کی ہے۔ تو ان ہزارہا صفحات میں دو صفحات کا اور اضافہ ہوگیا تو کیا فرق پڑا۔ ہاں! یہ فرق ضرور پڑا ہے کہ اینکر پرسنز کو بزم کی رونق دوبالا کرنے کے لیے ایک نیا موضوع ہاتھ آگیا اور بالواسطہ طور پر مذہب اور اہلِ مذہب کو بھی کوسنے کا موقع مل گیا۔ مولانا کی ایک خوبی یہ ہے کہ فلیتا لگا کر خود غائب ہوجاتے ہیں۔ مرکزیہ مجلسِ اقبال لاہور میں ایک بار غالباً مظفر وارثی صاحب نے یہ شعر پڑھا تھا:

بپا ہم سال میں اک مجلسِ اقبال کرتے ہیں
پھر اس کے بعد جو کرتے ہیں، وہ قوال کرتے ہیں

ہمارے بعض فاضل متجدِّدین بھی حسبِ توفیق اہلِ مذہب کو کوستے رہتے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ اس عہد کے علماء کا فہمِ دین ناقص ہے، وہ فکری جمود کا شکار ہیں، اپنے عہد کے تقاضوں سے نابلد اور مذہب کے نادان دوست ہیں۔ غلام احمد پرویز بہت پہلے یہ سوچ عطا کرگئے ہیں کہ قانونِ الٰہی کا ماخذ صرف کتاب اللہ ہے اور رسول اللہ ﷺ کی حیثیت

مرکزِ ملت یا سربراہِ ریاست کی ہے، پس اپنے عہدِ مبارک میں آپ نے اپنے قول و فعل کے ذریعے قرآن مجید کی جو تعبیر کی۔ یہ صرف اس عہد کے لیے تھی، اسی طرح ہر عہد کا سربراہِ مملکت جو تعبیر کرے گا، اس عہد کے لیے وہی حجت ہوگی۔

تعدّدِ اَزدواج کی گنجائش عدل کی کڑی شرط کے ساتھ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ یہ کسی معاشی، سماجی، طبی اور فطری ضرورت کے تحت اِباحت کے درجے میں ہے، یہ فرض، واجب یا سنتِ ہدیٰ کے درجے میں نہیں ہے۔ انسانی اَحوال اور مختلف زمانوں کے اعتبار سے سماجی تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس پر طنز اور طعن کے تیر وہی چلا رہے ہیں جو اس میں مبتلا ہیں۔ کتنے جاگیر دار، وڈیرے اور سرمایہ دار ہیں، جو اس سے بچے ہوئے ہیں اور یہی حال ماڈرن بیگمات کا ہے کہ اپنا گھر تو برباد کر چکی ہوتی ہیں اور سادہ لوح لوگوں کے گھروں کا سکون برباد کرنا چاہتی ہیں۔ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو اس ملک کے انتہائی ماڈریٹ اور تعلیم یافتہ جاگیردار اور سیاست دان تھے، کیا اُن کی دو شادیاں نہیں تھیں؟ کوئی بتا سکتا ہے کہ اُنہوں نے دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی سے تحریری اجازت لی تھی، یہاں میں غلام مصطفیٰ کھر کا نام نہیں لوں گا، کیونکہ ان کی شادیوں کی صحیح تعداد کا معلوم ہونا دشوار ہے۔ موجودہ اسمبلیوں اور سینٹ کے معزز اراکین کا تجزیہ کر کے دیکھ لیں، ایک بہت بڑی تعداد ایک سے زائد بیویاں رکھتی ہے۔ کتنے علماء ہیں جنہوں نے ایک سے زائد شادیاں کر رکھی ہیں، تقابل کر کے تجزیہ کر لیجیے، صحیح اعداد و شمار سامنے آجائیں گے اور اگر بالفرض کسی عالم نے دوسری شادی کی بھی ہو تو ہمارے سامنے ایک مثال بھی نہیں کہ اس کی بیوی مہر کا مطالبہ کرنے یا اپنے حقوق کی فریاد کرنے یا حق طلب کرنے کے لیے منظرِ عام پر آئی ہو۔

مغرب میں بلاشبہ قانونی طور پر ایک سے زائد شادیوں پر پابندی ہے، لیکن وہاں حرام کاری اور بدکاری پر نہ کوئی پابندی ہے اور نہ ہی یہ اس معاشرے میں کوئی عیب ہے۔ ہمارے معاشرے میں شور مچانے والا طبقہ وہی ہے، جو حلال پر قدغن لگانا چاہتا ہے، اسے

قانونی، سماجی اور اخلاقی عیب قرار دینا چاہتا ہے، لیکن فحاشی، عریانی اور حرام ذرائع اختیار کرنے پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ تو جہاں نکاح عیب بن جائے اور زنا تہذیبی کلچر بن جائے، تو وہاں یہ واویلا کرنے اور ہاہا کار مچانے کی کیا ضرورت ہے؟۔ کیا یہ بات ریکارڈ پر نہیں ہے کہ قومی اسمبلی کی ماڈرن بیگمات کسی سردار کی دوسری بیوی بنیں، کیا کوئی ثبوت ہے کہ انہوں نے اپنے ہونے والے شوہر نامدار سے کہا ہو کہ پہلی بیوی کا تحریری اجازت نامہ دکھاؤ، کیا ان میڈیا پرسنز اور این جی اوز کی بیگمات نے کبھی ان کو ملامت کیا؟۔

ڈی این اے ٹیسٹ کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ یہ یکسر نا قابلِ اعتبار ہے اور یہ کہ اس کی بنیاد پر کوئی تعزیر عائد نہیں ہوسکتی، یہ واضح طور پر کہا گیا تھا کہ اسے قرائن کی شہادت (Circumstantial Evidence) اور معاون شہادت (Supporting Evidence) کے طور پر لیا جاسکتا ہے۔ کیا ہمیں اپنے ملک میں قانون نافذ کرنے والے مختلف اداروں کی دیانت اور اَخلاقی معیارات کا علم نہیں ہے، کیا مختلف تنازعات میں مقتولین اور مجروحین کی طبی رپورٹ (Medico Legal Report) سوفیصد دیانت پر مبنی ہوتی ہے، کیا بیسیوں واقعات میں ایسی رپورٹوں میں ردّوبدل نہیں کیا جاتا، ان رپورٹوں کے ذریعے مقدمے کی ثقاہت کو نا قابلِ اعتبار نہیں بنایا جاتا؟، تو کیا ڈی این اے رپورٹ مرتب کرنے والے آسمان سے نازل ہوں گے؟، کیا ہمیں اپنے معاشرے کے اَخلاقی تنزّل اور روز بروز گرتے ہوئے دیانت وامانت کے معیارات کا علم نہیں ہے، کیا ڈی این اے ٹیسٹ کو بلیک میلنگ کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا؟۔ میری ان گزارشات پر کوئی شخص یہ اعتراض وارد کرسکتا ہے کہ عینی شہادت (Eye Witness) بھی جھوٹی ہوسکتی ہے۔ تسلیم ہے، مگر اسے تو عدالت میں جرح کے ذریعے پرکھا جاسکتا ہے، آپ تو ڈی این اے ٹیسٹ کو الہامی شہادت کا درجہ دینا چاہتے ہیں۔

میڈیا پر بیٹھ کر لعن طعن کرنے یا کالموں میں کوسنے سے پہلے یہ بھی سوچ لینا چاہیے کہ ہمارے ملک کے زمینی حقائق کیا ہیں، عوام کی غالب اکثریت کے مذہبی عقائد اور نظریات

کیا ہیں، کیا یہ متجددین ان کی ترجمانی کرتے ہیں یا عوام کی غالب اکثریت نا قابلِ اعتبار اور بے وقعت ہے، صرف ان اہلِ عقل وخرد کے نظریات ہی قابلِ تکریم ہیں، کیا یہ جمہوری سوچ ہے، کیا یہ جمہوری قدریں ہیں۔ اسی لیے تو میں بارہا کہتا ہوں کہ حکومت کا مادہ حکم (Writ) اور حکمت ودانش ہے۔ حکمت ودانش کا تقاضا یہ ہے کہ ملک کے عوام کی غالب اکثریت کے مذہبی جذبات اور عقائد ونظریات کو بے توقیر نہ سمجھا جائے اور ان کو تضحیک کا نشانہ نہ بنایا جائے۔

25مارچ2014ء

اضطراب کی لہر

میڈیا اور مدارس کے لوگ مسلسل رابطہ کر رہے ہیں کہ مدارس کے بارے میں کیا ہونے جا رہا ہے۔ اچانک تحفظ مدارس کنونشنوں اور کانفرنسوں کا سلسلہ کیوں چل پڑا ہے، یہ اضطراب کی لہریں کیوں بلند ہو رہی ہیں، سوچ یہ ہے کہ ہمیں اس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ جو حضرات سراپا احتجاج ہیں، وہ سسٹم میں موجود ہیں، پس قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انہیں اندر کی باتوں کا علم ہے، جب کہ ہم سسٹم سے باہر ہیں۔ ہمیں میڈیا کے ذریعے بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وزارتِ داخلہ کی مرتب کی ہوئی ''قومی سلامتی پالیسی'' میں دینی مدارس کے بارے میں کن عزائم کا اظہار کیا گیا ہے اور کیا کیا مقاصد و اہداف مقرر کیے گئے ہیں۔

تاہم اب تک کا تجربہ یہی ہے کہ پہلی بار جو پالیسی عالَمِ غرب سے نازل ہوئی تھی، اس کا عنوان ''مدرسہ ریفارم آرڈی ننس'' تھا، جو اُس وقت کے صدر جنرل پرویز مشرف نے جاری کیا تھا، مگر بالآخر اپنی تمام تر خودسری اور خود اعتمادی کے باوجود یہ بھاری پتھر ان سے نہ اٹھایا گیا اور ان کا یہ آرڈی ننس غیر مؤثر ہو گیا، حالانکہ اس کے ضمن میں ترغیب و ترہیب یعنی Carrot & Stick کا ایک جامع پیکیج بھی تھا۔

بعد میں پاکستان پیپلز پارٹی کی گورنمنٹ میں اسی کا چربہ وزیر داخلہ عبدالرحمن ملک نے ''مدرسہ ریفارم اتھارٹی'' کے نام سے پیش کیا اور سبز باغ بھی دکھائے، مگر یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھی۔ بالآخر انہوں نے انتہائی عجلت میں ''اتحادِ تنظیماتِ مدارس پاکستان'' کی قیادت کے ساتھ ایک مفاہمتی دستاویز یعنی M.O.U. پر دستخط کیے اور ایک ماہ کے اندر معاملات کو

حتمی وقانونی شکل دینے کا وعدہ کیا، لیکن: ''پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی''، بقولِ غالب:

تیرے وعدے پہ جیے ہم، تو یہ جان، جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

اب بھی شاید اس کو نئے سرے سے آراستہ کر کے وزیرِ داخلہ چوہدری نثار علی خان نے پیش کیا ہے اور اسے مجوزہ ''قومی سلامتی پالیسی'' کا حصہ بنایا گیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ انہوں نے بھی اسے لفظ بہ لفظ نہ پڑھا ہو، بس سرسری طور پر نظر ڈالی ہو۔ ایک ٹیلی ویژن چینل نے بڑے منجھے ہوئے اور سینئر ارکانِ اسمبلی سے پوچھا کہ کیا آپ نے ''تحفظ پاکستان بل'' پڑھا ہے، تو اُن سب نے فرمایا: ''نہیں''۔ اسمبلی میں پیش کیے جانے والے بل کوئی قیمتی پلاٹ تو نہیں ہوتے جن کی فائل کو غور سے پڑھا جائے اور ہمارے معزز منتخب ارکان اس پر اپنا قیمتی وقت صرف کریں۔ ان کے کرنے کے اور کام تھوڑے ہیں۔

ویسے آج کل سسٹم بھی اہلِ احتجاج کے آستانہ عالیہ پر سجدہ ریز ہے، اسی لیے ہمیں سمجھ نہیں آرہی کہ کس کو کس سے خطرہ ہے؟۔ عالی مرتبت وزیرِ داخلہ چوہدری نثار علی خان انہی آستانوں کے طواف میں مصروف ہیں، چنانچہ ایک طرف تو وزیرداخلہ اپنی شان میں ارکانِ سینٹ وقومی اسمبلی کی ادنیٰ جسارت بھی گوارا نہیں کرتے، لیکن یہاں ان کی کیفیت، بقول مرزا اسد اللہ خان غالب کچھ یوں ہے:

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

اگر جا نہ سکیں تو ٹیلیفونک رابطے قائم ہو جاتے ہیں، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ بیعت کر چکے ہیں۔ الغرض حکومت المعروف چوہدری نثار علی خان کے ساتھ اُن کی دوستی، قربت اور عقیدت اپنی معراج پر ہے، تو پھر دینی مدارس کو خطرہ کس سے ہے؟، کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟۔ خطرہ تو وہیں سے لاحق رہتا ہے، لیکن اب وہاں ماشاء اللہ راوی ہر طرف چین لکھتا ہے۔

اہلِ نظر نے بتایا ہے کہ بیعت کی بھی کئی قسمیں ہیں:

ایک بیعت استرشاد: جو رُشد و ہدایت کے حصول اور روحانی جلا و ارتقا اور تزکیہ و تربیت کے لیے ہوتی ہے۔

دوسری بیعتِ برکت: جو محض حصول برکت کے لیے ہوتی ہے۔

تیسری بیعتِ منفعت: جو کسی بااثر شخصیت سے غیر معمولی منفعت کے حصول کے لیے ہوتی ہے، خواہ یہ منفعت دولت کی چمک دمک کی صورت میں ہو یا اس ہستی کے ذریعے کسی بلند منصب تک رسائی مطلوب ہو یا کسی صاحبِ منصب جلیلہ کا قرب مقصود ہو۔

چوتھی بیعتِ نجات: جو کسی آفتِ غیبیہ سے بچنے کے لیے کی جاتی ہے۔

چوہدری صاحب کی بیعت مختلف الجہات ہے، مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب سے تو غالباً رُشد و استرشاد کے لیے ہوگی، لیکن مولانا سمیع الحق صاحب سے بیعت یقیناً نجات اور دفعِ بلا کے لیے ہی ہوسکتی ہے۔ مولانا سمیع الحق نے تحریکِ طالبان پاکستان کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد اپنی اس غیر معمولی اہلیت و اہمیت کو ثابت کردیا ہے۔ صوفیائے کرام سے سنا ہے کہ تسبیح پھیرنے کے دو طریقے ہوتے ہیں: ایک یہ کہ آپ ایک ایک دانہ اپنی طرف کھینچتے چلے جائیں اور دوسرا یہ کہ ایک ایک دانہ گراتے جائیں۔ پہلا طریقہ ''جلبِ منفعت'' یعنی کسی متوقع نفع کے حصول کے لیے اور دوسرا طریقہ ''دفعِ مضرّت'' یعنی کسی متوقع مصیبت کو ٹالنے کے لیے ہوتا ہے۔ چوہدری صاحب کو ہمارا مشورہ ہے کہ ایک تسبیح ''جلبِ منفعت'' کے لیے پھیرا کریں اور دوسری ''دفعِ مضرّت'' کے لیے، اس طرح دونوں مقاصد حاصل ہوتے رہیں گے۔

اس سیاق و سباق میں ٹی وی پر ٹکر چلتا ہوا دیکھا کہ حزبِ اختلاف نے احتجاج کیا ہے کہ بیوروکریٹس کے ذریعے تحریکِ طالبانِ پاکستان سے مذاکرات کیے جارہے ہیں اور ساتھ ہی یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ حکومت مذاکرت کے بارے میں In Camera (یعنی پس پردہ) بریفنگ دے۔ ہمیں حیرت ہے کہ کم و بیش روزانہ مولانا سمیع الحق، مولانا یوسف

شاہ اور پروفیسر ابراہیم مذاکرات کی رننگ کمنٹری On Camera (یعنی علانیہ) نشر کررہے ہوتے ہیں، تو چوہدری نثار علی خاں پردے میں آکر اس سے زیادہ کیا بریفنگ دیں گے؟، اُن کی معلومات کا ذریعہ بھی تو یہی حضرات ہیں۔

ہاں! اس کی بجائے پردے میں رہ کر کچھ اور راز و نیاز کی باتیں مقصود ہوں تو الگ بات ہے، اپوزیشن کو بیوروکریٹس کے ذریعے مذاکرات پر اعتراض ہے۔ لگتا ہے حکمران تو وزیرستان نہیں جانا چاہتے، البتہ سید خورشید احمد شاہ صاحب جانا چاہتے ہوں، تو وہ مولانا سمیع الحق کو ویزے کی درخواست دے سکتے ہیں۔ مولانا سمیع الحق بڑے فراخ دِل ہیں، وہ شاہ صاحب کو مایوس نہیں کریں گے، اُن کی تو خواہش ہے کہ اُن کے آستانے پر رونقیں لگی رہیں اور مولانا فضل الرحمٰن، متعدد اراکینِ اسمبلی اور سینٹرز پر مشتمل سیاسی قوت کے باوجود انہیں رشک بھری نظروں سے دیکھتے رہیں۔ ویسے ایک بار کسی ٹرک کے پیچھے لکھا ہوا دیکھا تھا: ''تم مجھے اچھے لگنے لگے ہو، کبھی آؤ نا باجوڑ''۔ شاہ صاحب چلے چلیے، باجوڑ نہ سہی، وزیرستان ہی سہی، بس ذرا واپسی کی گارنٹی مولانا سمیع الحق صاحب سے پیشگی لے لیجیے گا، میر تقی میر نے کہا تھا:

پتا پتا، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

یعنی قائدِ حزبِ سید خورشید احمد شاہ اور ان کے رفقاء کے علاوہ باقی دنیا کو معلوم ہے کہ طالبانِ پاکستان کے مُطالبات (Demands) و مطلوبات (Desires) کیا ہیں؟، ان کے بارے میں کسی ریسرچ کی ضرورت نہیں ہے۔ اصل مسئلہ اُس وقت پیدا ہوگا جب زرِ تلافی کی تقسیم کا مرحلہ آئے گا کہ کس کے توسط سے تقسیم کی جائے۔ ظاہر ہے یہ رقم یقیناً اربوں روپوں میں ہوگی، اسی کی جانب تو مولانا فضل الرحمن متوجہ کرتے رہتے ہیں کہ قبائلی جرگہ اس کا بہترین چینل ہیں۔ لیکن چوہدری صاحب مولانا کو سائیڈ لائن میں رکھے ہوئے ہیں، لگتا ہے یہ پالیسی دیر تک نہیں چلے گی، کیونکہ اصل اسٹیک ہولڈر تو وہی ہیں۔

ایک اور ٹکرا امریکی وزیر خارجہ جان کیری کا چل رہا تھا کہ "دہشت گردی کنٹرول کرنے کے لیے ہم حکومتِ پاکستان کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں"۔ اب یہ معلوم نہیں کہ اُن کے تعاون کی صورت کیا ہے۔ اُنہوں نے اشارۃً کہا ہے کہ ہم ڈرون اٹیک حتی الامکان رو کے ہوئے ہیں، ایسی صورت میں طالبان کے بہترین مفاد میں ہوگا کہ مذاکرات کی سیریز چلتی رہیں اور ڈرون اٹیک کی آفت ٹلتی رہے۔

ہمارا جمہوری کلچر بھی عجیب ہے، جب ہم حکومت میں ہوتے ہیں تو زاویہ نظر کچھ اور ہوتا ہے اور جب اپوزیشن میں آتے ہیں تو سوچنے کا انداز، پسند و ناپسند کا معیار اور کسی کے منظورِ نظر ہونے یا اچانک آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے کے اطوار یکسر بدل جاتے ہیں۔ سابق حکومت کے دور میں تو دو ہزار امریکن انٹیلی جنس کے کارندوں کو مسلّمہ بین الاقوامی قوانین کو یکسر نظر انداز کر کے دبئی ایئر پورٹ پر ویزے جاری کیے گئے اور اس کے نتیجے میں ریمنڈ ڈیوس جیسے واقعات سرزد ہوئے اور بلیک واٹر کی داستانیں میڈیا کی زینت بنیں۔ آج وہی اپوزیشن ڈیڑھ ارب ڈالر کی آمد پر واویلا کر رہی ہے، لیکن سب مطمئن رہیں یہ سب کچھ اوپر اوپر سے ہو رہا ہے، اندر سے سب متفق ہیں اور پالیسی کی حد تک کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے۔

28 مارچ 2014ء

اپریل2014ء

نظمِ اجتماعی

ہم کالم نگاری کے میدان میں نو وارد ہیں، اردو محاورے کے مطابق جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ نہ جانے روزنامہ دنیا کے گروپ ایڈیٹر جناب نذیر ناجی صاحب کے ذہن میں یہ خیال کیسے آیا کہ انہوں نے مجھے کالم لکھنے کی فرمائش کی، میں نے بھی کچھ تردد کے بعد اس پیشکش کو قبول کرلیا۔ ہم اپنے مزاج کے اعتبار سے طالبِ علم ہیں، لہٰذا یہ سوچ کر حامی بھرلی کہ کچھ سیکھنے کا موقع ضرور ملے گا۔ امام احمد رضا قادری کو اُن کے چند عقیدت منداحباب نے ایک ایسی نعت لکھنے کی فرمائش کی جس میں کئی زبانوں کو ایسی مہارت کے ساتھ یکجا کردیا گیا ہو کہ اشعار کا آہنگ، وزن اور تسلسل بھی قائم رہے اور معنوی ربط بھی ٹوٹنے نہ پائے۔ چنانچہ انہوں نے ''لَمْ یَاْتِ نَظِیْرُکَ فِیْ نَظَرٍ'' والی مقبولِ عام نعت لکھی اور اس میں عربی، فارسی، اردو، ہندی اور پوربی زبانوں کو خوبصورت انداز میں منظم کیا اور مقطع میں فرمایا:

بس خامۂ خامِ نوائے رضا، نہ یہ طرز میری نہ یہ رنگ میرا
ارشادِ اَحِبّاء ناطق تھا، ناچار اس راہ پڑا جانا

ہمارے پاس تو زبان وبیان کی مہارت اور مطالب ومعانی کا وہ ذخیرہ نہیں، جو امام احمد رضا قادری کے پاس تھا، لیکن اپنا توشہ دان خالی ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے، اس راہ پر چل پڑے۔ اس میں جو Feedback یعنی قارئین کے تاثرات ملتے ہیں، ان میں تحسین بھی ہوتی ہے اور بعض اوقات تنقید بھی، اس سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔

بعض روشن خیال دانش وَروں کی نظر میں ہم جیسے لوگ تنگ نظر ہوتے ہیں اور ہمارا فہمِ دین بھی ناقص ہے۔ اس کا اظہار کبھی دبے لفظوں میں اور کبھی برملا ہوتا ہے۔ ہمارے ایک فاضل مہربان ہیں جو تجربہ کار اینکر پرسن، کالم نگار، تجزیہ نگار اور معروف لکھاری ہیں۔ ان کے عطا کردہ اصول کے مطابق قرآن کے معانی ومطالب کی تعبیر وتشریح ہر عہد کے "نظمِ اجتماعی" کا دائرۂ اختیار ہے اور اُس عہد کے لیے قرآن کی وہی تعبیر حُجت ہے، جو "نظمِ اجتماعی" طے کرلے۔ انہوں نے "خلافتِ راشدہ" کو بھی یہی حیثیت (Status) عطا کی ہے اور جناب غلام احمد پرویز نے منصبِ نبوت کو یہ حیثیت دی تھی۔

عہدِ حاضر میں ہمارا "نظمِ اجتماعی" کیا ہے؟۔ کم وبیش ستاون مسلم ممالک ہیں، جہاں کی اکثریتی آبادی مسلمان ہے اور حکومت کا نظم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان ممالک کے طرزِ حکومت میں ملوکیت ہے یا آمریت۔ چند ممالک جہاں کسی حد تک جمہوریت ہے، وہ بھی اپنے دستوری میثاق کے اعتبار سے سیکولر ہیں۔ دستوری نہاد اور میثاق کے اعتبار سے صرف پاکستان اور ایران اسلامی جمہوری ریاستیں ہیں۔

پاکستان کے "نظمِ اجتماعی" میں قانون سازی کا اختیار پارلیمنٹ کو حاصل ہے۔ اسلامی فہم کے حوالے سے پارلیمنٹ کی جو دانش، اہلیت اور ترجیحات ہیں، انہیں ہمارے فاضل دوستوں سمیت ہر کوئی بخوبی جانتا ہے۔ اسی طرح مصائب ومشکلات کا مقابلہ کرنے، قوم کو بے امنی اور دہشت وفساد کے بحران سے نکالنے کے لیے جو جرأت وہمت درکار ہے، آیا وہ ہمارے حکمرانوں میں موجود ہے؟، اس سے بھی ہر ایک بخوبی واقف ہے۔ مولانا سمیع الحق اور مولانا یوسف شاہ نے ہمارے قائم مقام وزیرِ دفاع کو معمولی سی تنبیہ کی کہ وہ جس طرح کی باتیں کررہے ہیں، لگتا ہے کہ وہ ہندوستان کے وزیرِ دفاع ہیں، تو ہمارے وزیرِ دفاع کا لب ولہجہ انتہائی مؤدبانہ ہوگیا، پس زمینی حقیقت یہی ہے۔ وزیرِ دفاع خواجہ محمد آصف نے صرف یہ کہا تھا کہ اگر طالبان ریاست کی حاکمیت اور پاکستان کے دستور کو نہیں مانیں گے، تو پھر آپریشن ہوگا۔

توکیا ہم قرآن کی تعبیر وتشریح کا مقدس فریضہ اِس پارلیمنٹ کو تفویض کرنا چاہتے ہیں؟۔اور آج کے ''نظمِ اجتماعی'' کو ''عہدِ صدیقی اور عہدِ فاروقی'' کے ''نظمِ اجتماعی'' کے مماثل قرار دینا چاہتے ہیں، کیا یہ سوچ منصفانہ ہے؟۔ہمارے ایک پختہ کار سیاست دان، ماہر آئین وقانون اور سابق وزیر قانون جناب ایس ایم ظفر نے حال ہی میں کہا ہے کہ ہماری اسٹیبلشمنٹ اب چار عناصر ترکیبی پر مشتمل ہے: (۱) پارلیمنٹ (۲) سول وملٹری بیوروکریسی، (۳) اعلیٰ عدلیہ نے بھی اپنی جگہ بنالی ہے، بلکہ جسٹس افتخار محمد چوہدری کے دور میں عدلیہ سب پر حاوی (Dominant) ہورہی تھی، (۴) ان کے بقول ہماری اسٹیبلشمنٹ کا ایک اہم عنصر آزاد الیکٹرونک و پرنٹ میڈیا بھی بن چکا ہے۔ہماری رائے میں اب ایک اور غالب عنصر طالبان کی صورت میں اپنے آپ کو منوا چکا ہے، کسی کو اس رائے سے اختلاف ہے، تو یہ اس کا حق ہے۔ان کے حوالے سے اب حکمران اور سیاست دان ہی نہیں، ہمارا آزاد میڈیا بھی کافی حد تک ادب کے دائرے میں آتا جارہا ہے اور جارحانہ لب ولہجہ بدل رہا ہے، سو یہ ہے ہمارا نظمِ اجتماعی۔سیکولرازم کیا ہے، اس پر تفصیلی بحث درکار ہے۔

لیکن کیا یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح نہیں ہے کہ سیکولرازم کی داعی ریاستوں کا ''نظمِ اجتماعی'' اسی پر استوار ہے کہ وہ اپنی اجتماعی فلاح کے لیے کسی الہامی ہدایت کے محتاج نہیں ہیں اور نہ ہی وہ اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ان کا نظریہ یہی ہے کہ انسان کی اجماعی یا اکثریتی فکر اپنی صلاح وفلاح کے لیے جو بھی لائحہ عمل تجویز کرے، وہی درست ہے۔آج مغرب میں اسی بنیاد پر ہم جنس پرستی کو قانونی حیثیت دے دی گئی ہے، ان کے نظم میں دو مرد یا دو عورتیں باہم شادی کرسکتے ہیں اور قانونی طور پر ایک شادی شدہ جوڑے کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں، نہ یہ کوئی عیب ہے، نہ عار ہے، بلکہ افتخار ہے۔

جب تنقید کی جاتی ہے تو ہمارے دانشور کہتے ہیں، آپ میدانِ عمل میں آئیں اور جمہوری انتخابات کے ذریعے نظام کو اپنے کنٹرول میں لیں اور اپنی پسند کے منہاج پر

چلائیں۔ لیکن کیا ہمارے یہ فاضل دانشور دل پر ہاتھ رکھ کر یہ بتائیں گے کہ رائج الوقت جمہوری اور انتخابی عمل کے ذریعے وہ خود ایوانِ اقتدار میں پہنچ سکتے ہیں، یقیناً ان کا جواب نفی میں ہوگا۔ پھر دو ہی راستے رہ جاتے ہیں کہ یا تو طالبان پیدا کیے جائیں اور ان کے آگے ریاست سپر انداز ہو جائے یا ریاست کوئی ایسی صورت پیدا کرے کہ وہ مسلمانوں کے اجماعی یا اکثریتی نظریات کا احترام کرے اور انہیں اپنے اجتماعی نظام میں حکیمانہ انداز میں جذب کرے تاکہ معاشرے کو موجودہ شکست وریخت اور انتشار سے نجات مل سکے۔

تحریکِ طالبان پاکستان کے لوگ جس مکتبۂ فکر کے علما کا احترام کرتے ہیں اور ان کو اپنا استاذ اور مرشد تسلیم کرتے ہیں، ان میں سے ایک متوازن فکر رکھنے والے عالم سے میں نے پوچھا کہ آپ کے اکابر علماء پاکستان کے اندر طالبان کی دہشت گردی کی کارروائیوں کے خلاف اسلام بلکہ خلافِ انسانیت اور باطل ہونے کے بارے میں دوٹوک موقف کیوں نہیں اختیار کرتے؟۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے لیے مشکلات ہیں اور یہ آسان کام نہیں ہے۔ ہمارے مسلمہ اکابر کو بھی دھمکیاں ملتی ہیں اور خطرناک نتائج کی تنبیہات آتی رہتی ہیں۔ ہمارے نوجوان علماء اور طلبہ کی ایک بھاری تعداد طالبان کے اس نظریے کی قائل ہوتی جارہی ہے کہ نظام کے اندر رہتے ہوئے اس ملک میں نفاذِ شریعت ہمیشہ ایک خواب ہی رہے گا اور یہ خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔

اب تو وزیرِ دفاع نے بھی یہ کہہ دیا ہے کہ اگر طالبان کے ساتھ مذاکرات کے لیے زیرو آپشن بھی ہو، تو ہم اسی کو ترجیح دیں گے۔ اور مولانا سمیع الحق صاحب پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ مذاکرات سو بار ناکام ہوں، تب بھی مذاکرات ہی واحد آپشن ہے، ہم آپریشن کے متحمل نہیں ہوسکتے، یعنی اسے Afford نہیں کرسکتے۔ مذاکرات کے پہلے دور کے بعد حکمران اور حکومتی مذاکراتی ٹیم مہر بہ لب ہیں اور قوم کو جو بھی معلومات مل رہی ہیں، وہ طالبان کی مذاکراتی ٹیم کے ذریعے ہی مل رہی ہیں۔

ہمارے بہت سے فاضل دانشور تکرار کے ساتھ اس بات کا بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ

قائدِ اعظم پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے اور ان کا ویژن یہی تھا۔ تحریکِ پاکستان اور قائدِ اعظم کے وژن پر جو محققین اتھارٹی کا درجہ رکھتے ہیں، وہ اس کا جواب دلائل سے دیتے رہتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے 67 سال بعد اس طرح کی بحثیں قوم میں فکری انتشار کا سبب بن رہی ہیں۔

ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا قائدِ اعظم یا مسلم لیگ کی کسی بھی درجے کی قیادت نے تحریکِ پاکستان کے دوران کبھی ایک بار بھی برملا یہ کہا کہ ہم ایک سیکولر ریاست قائم کرنے جا رہے ہیں، مسلمان تو اس نعرے کو سن کر تحریکِ پاکستان کے ہمنوا بنے تھے کہ: پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ۔

قائدِ اعظم کی شخصیت پر اس حد تک تو سب کا اتفاق ہے کہ وہ صاف گو انسان تھے، جھوٹ اور منافقت سے کوسوں دور تھے اور ان پر کسی مخالف نے بھی مکر و فریب کا الزام نہیں لگایا۔ اگر ان کی منزل سیکولر پاکستان ہوتی، تو وہ قوم کو کبھی بھی تاریکی میں نہ رکھتے۔

13 اپریل 2014ء

آدمیّت و ابلیسیت

قرآن مجید میں آدم علیہ السلام کا نام 17 مرتبہ ذکر ہوا۔ اولادِ آدم کا تذکرہ 14 مقامات پر ''بنی آدم'' کے عنوان سے، ایک مقام پر ''ذُرِّیتِ آدم'' کے عنوان سے، 65 مقامات پر ''انسان'' کے عنوان سے، 18 مقامات پر ''اِنس'' کے عنوان سے، 5 مقامات پر ''اُناس'' کے عنوان سے، ایک مقام پر ''اَناسی'' کے عنوان سے، ایک مقام پر ''اِنسیّ'' کے عنوان سے، 36 مقامات پر ''بشر'' اور ایک مقام پر تثنیہ کے صیغے کے ساتھ ''بشرین'' کے عنوان سے ہوا۔ قرآن مجید کا مخاطب بھی ''انسان'' ہے اور نبوت و رسالت کا خطاب بھی ''انسان'' سے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل کی نعمت سے نوازا۔ انسان کے علاوہ ''جنّات'' اور ''ملائک'' اللہ تعالیٰ کی ''ذی عقل'' مخلوق ہیں اور اسی ''نعمتِ عقل'' کی بنیاد پر انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ''تشریعی احکام'' کا مُکلّف بنایا ہے۔ قدیم منطق کی اصطلاح میں انسان کو ''حیوانِ ناطق'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ''ناطق'' سے صرف بولنے کی استعداد مراد نہیں ہے، بلکہ ''ادراک'' اور ''تعقّل'' (Rationality) کی صلاحیت مراد ہے۔ یہ وہ صلاحیت ہے جس کی بنا پر انسان خیر و شر، ہدایت و ضلالت، حق و باطل اور صَواب و خطا میں تمیز کرتا ہے۔ وہ کوئی کام کرنے سے پہلے اس کے اپنی ذات کے لیے نفع بخش اور ضرر رساں ہونے کا اندازہ لگاتا ہے، یعنی اَفعال و اعمال کے ارتکاب سے پہلے ان کے نتائج کے بارے میں سوچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کو ان کلمات میں بیان فرمایا: ''کیا ہم نے اُس کی دو

آنکھیں، زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے اور ہم نے اس کو (خیر و شر کی) دونوں راہیں بتا دیں"۔ (البلد: 10-8)، اور فرمایا: "پھر اس نے (نفسِ انسانی) کو اُس کی نیکی اور بدی الہام کر دی"۔ (الشمس: 08)

الغرض اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفس اور جبلّت میں نیکی اور بدی میں تمیز کا مَلکہ عطا کیا اور خارجی طور پر اس کی رہنمائی کے لیے انبیائے کرام اور رُسُلِ عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا اور الہامی کتابیں بھی نازل فرمائیں اور اس جامع نظامِ ہدایت کی حکمت بھی یہی بیان فرمائی:

"اور ہم نے (اپنی رحمت کی) خوشخبری دینے والے اور (اپنے عذاب سے) ڈرانے والے رسول بھیجے، تاکہ رسولوں (کی بعثت) کے بعد لوگوں کے لیے اللہ پر (بدی کو اختیار کرنے کے حوالے سے) کوئی حجت (Justification) باقی نہ رہے"۔ (النساء: 165)

اگرچہ اللہ تعالیٰ پر کسی کا کوئی حق یا استحقاق نہیں ہوتا، لیکن اس نے عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے یہ نظامِ ہدایت قائم فرمایا تاکہ اِتمامِ حجت ہو جائے۔

ابتدائے آفرینش میں اللہ تعالیٰ نے آدم وحوا علیہما السلام کو جنت میں داخل کیا اور انہیں جنت کی نعمتوں سے مستفید ہونے کی آزادی عطا فرمائی، لیکن ان پر یہ بندش بھی عائد کر دی کہ:

"تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا، ورنہ تم حد سے بڑھنے والوں میں سے ہو جاؤ گے"۔ (البقرہ: 35)

بشری کمزوری کے تحت حضرت آدم وحوا علیہما السلام نے اس حد یعنی Barrier کو عبور کر دیا اور ممنوعہ چیز کے پاس چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری حکم عدولی کا سبب شیطانی وسوسے کو قرار دیا اور فرمایا:

"پھر دونوں کے دلوں میں شیطان نے وسوسہ ڈالا، تاکہ (انجامِ کار) ان دونوں کی شرمگاہیں جو اُن سے چھپائی ہوئی تھیں، ان کو ظاہر کر دے۔ اور اُس نے کہا: "تمہارے

رب نے اس درخت سے تمہیں صرف اس لیے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے بن جاؤ یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ"۔ اور اُس نے ان سے قسم کھا کر کہا: "بے شک میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں"، پھر اُس نے فریب سے انہیں (اپنی طرف) مائل کر لیا، جب ان دونوں نے اس درخت سے چکھا، تو ان کی شرمگاہیں ان کے لیے ظاہر ہو گئیں اور وہ اپنے اوپر جنت کے پتے جوڑنے لگے اور ان کے رب نے ان سے پکار کر فرمایا: "کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا تھا اور تم دونوں کو یہ نہ فرمایا تھا کہ بے شک شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے"۔ دونوں نے عرض کی: "اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اور اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے، تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے"۔ (الاعراف: 23-20)

یہاں سے شعارِ آدمیت ہمارے سامنے آیا کہ آدم علیہ السلام نے اپنی خطائے اجتہادی کا اعتراف کیا اور اس پر نادم ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے معافی خواستگار ہوئے۔ اپنی غلطی کا کوئی جواز (Justification) نہیں پیش کیا، نہ ہی کسی منطق اور دلیل واستدلال کا سہارا لیا۔ اس لیے کہ آدمیت اور بندگی اللہ تعالیٰ کے حکم کو غیر مشروط طور پر تسلیم کرنے اور اس کی تعمیل کا نام ہے۔ بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہر حکم میں خیر ہی خیر ہے، فلاح ہی فلاح ہے، اس میں کسی ناکامی اور نامرادی کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اُس کی حکمت، انسانی عقل ودانش میں آجائے تو یہ اُس کی سعادت ہے اور نہ آئے، تو یہ اس کی نارسائی ہے۔

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو حکم فرمایا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو رد کیا اور سجدہ نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"(اے ابلیس!) تجھ کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے منع کیا جبکہ میں نے تمہیں حکم دیا تھا، اس نے کہا: "میں اس سے بہتر ہوں، (اے اللہ!) تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے"۔ (اللہ نے فرمایا:) "تو یہاں سے اتر جا، تجھے یہاں گھمنڈ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، سو نکل جا، بے شک تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہے"۔ (الاعراف: 13-12)

ابلیس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو رد کیا اور اس پر نادم ہونے اور معافی کا طلب گار ہونے کے بجائے، اپنے مؤقف کو درست جانا اور اس کے لیے دلیل و استدلال کا سہارا لیا، جس کے نتیجے میں وہ ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ اور ملعون قرار پایا۔ سو یہاں سے آدمیت و ابلیسیت کا فرق واضح طور پر معلوم ہوا کہ اپنی خطا کو تسلیم کرنا، اس پر نادم ہونا اور معافی کا طلب گار ہونا شعارِ آدمیت ہے اور غلطی پر ڈٹ جانا اور اس کے لیے جواز تلاش کرنا ابلیسیت و شیطنت ہے۔

اس موضوع کا انتخاب میں نے اس لیے کیا کہ ہم اپنا جائزہ لیں کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کیا ہم شعارِ آدمیت پر عمل پیرا ہوتے ہیں یا ابلیس کی روش کو اختیار کرتے ہیں۔ دیکھنے میں تو یہی آ رہا ہے کہ ہمارے وہ لوگ جو قیادت کے منصب پر فائز رہے، ملک و قوم پر حکمرانی کی اور اس دوران انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں سے کیے گئے پیمانِ وفا کو توڑا، قوم کے اجماعی میثاق دستور کو توڑا، آج بھی اس پر ڈٹے ہوئے ہیں اور ان کے لیے ان کے پاس دلائل کا انبار ہے اور سیاہ کو سفید اور رات کو دن ثابت کرنے والے ماہرین کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ لیکن ہم کسی طور پر بھی شعارِ آدمیت کو قبول کرنے اور اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، یعنی ہم اپنی قومی اور ملی تاریخ کی سمت کو درست کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

کاش کہ ہم بحیثیتِ قوم اپنی ماضی کی غلطیوں کا اعتراف کر کے، ان پر نادم و شرمسار ہو کر اور قوم سے معافی کے طلب گار ہو کر ایک نئے سفر کا آغاز کر سکتے۔ ہماری پوری قومی تاریخ اسی روش کی آئینہ دار ہے، ہم کسی طور پر بھی اپنے قومی مزاج کو بدلنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر پاتے، اپنے پندار، عُجب اور تکبر کے بت کو توڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے لیے خیر اسی میں ہے کہ قومی مجرم اپنی غلطیوں کا اعتراف کریں اور یہ اعتراف قومی تاریخ کے ریکارڈ میں ہمیشہ کے لیے ثبت ہو اور اس کے بعد معافی تلافی کا مرحلہ آنا چاہیے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اقتدار پر فائز یا قابض رہنے والے زُعما اپنی

اِصابتِ فکر (Self Righteousness) کے پندار سے نکلنے کے لیے کبھی بھی تیار نہیں ہوتے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم بنی اسرائیل کی طرح ''وادیِ تیہ'' میں محوِ سفر ہیں، جہاں سے چلتے ہیں، واپس لوٹ کر وہیں آجاتے، بنی اسرائیل پر تو اس کیفیت میں چالیس سال گزر رہے تھے، ہمیں 67 سال گزر چکے ہیں اور نہ جانے یہ سفر کب تک جاری رہے گا۔

ہمارا میڈیا مُعاصرانہ مسابقت کی وجہ سے قوم کو آگہی (Awareness) عطا کرنے کا سبب نہیں بن رہا، ایک چینل کسی بات کو غلط ثابت کر رہا ہوتا ہے، تو دوسرا اسی کو حق اور سچ ثابت کرنے پر تلا رہتا ہے۔ ایسے ماحول میں قوم کی فکری رہنمائی نہیں ہوتی، بس ذہنی اور فکری انتشار میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، ہمیں ریٹنگ سے غرض ہے، قومی مفاد سے نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے ہاں نہ کوئی مسلَّمہ اصول ہے اور نہ ہی کوئی اجماعی میثاق، بس ہر طرف کنفیوژن اور فکری انتشار ہے۔

8اپریل 2014ء

آہ! ہمارے قانون ساز

پاکستان ایک دستوری اور قانونی نظام کے تحت چل رہا ہے۔ وفاقی سطح پر دو ایوانوں (قومی اسمبلی اور سینیٹ) پر مشتمل پارلیمنٹ (مجلس شوریٰ) اور صوبائی سطح پر صوبائی اسمبلیاں ہیں۔ پارلیمنٹ وفاق کی سطح پر قانون ساز (Law Maker) ادارہ ہے، وفاقی قانون سازی کا دائرہ پورے ملک پر محیط ہے اور صوبائی اسمبلیوں کی قانون سازی کا دائرۂ اختیار متعلقہ صوبے تک محدود ہے۔ قانون سازی وفاقی سطح پر ہو یا صوبائی سطح پر، دستورِ پاکستان کے تابع ہے۔ تاہم پارلیمنٹ (یعنی قومی اسمبلی اور سینیٹ آف پاکستان) میں سے ہر ایک ایوان کے کل ارکان کی کم از کم دو تہائی اکثریت کی منظوری سے دستور میں ترمیم کی جاسکتی ہے، حذف و اضافہ کیا جاسکتا ہے، یعنی پارلیمنٹ کو قانون سازی اور دستور سازی دونوں طرح کے اختیارات حاصل ہیں۔

یہ تمہیدی کلمات میں نے اس لیے بیان کیے ہیں کہ ہمارے قانون ساز یعنی منتخب قومی نمائندوں کو ملک کے لیے قانون سازی اور مطلوبہ اکثریت کے ساتھ دستور میں ترمیم کا اختیار بھی حاصل ہے اور منتخب ہونے کے بعد پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے یہ فاضل و معزز ارکان دستور کی بالادستی اور وفاداری کا حلف بھی اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح کا حلف ہمارے وفاقی اور صوبائی وزراء بھی اٹھاتے ہیں۔ لیکن قوم کے یہ معزز اور قابلِ افتخار نمائندگان جس دستور کا حلف اٹھاتے ہیں، چند مستثنیات کے سوا، باقی اس کو پڑھنے اور سمجھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں فرماتے۔ انہیں زیادہ دلچسپی اپنے استحقاق (Privilege)، اس

منصب کی برکت سے حاصل شدہ سماجی حیثیت (Social Status) اور اس کے طفیل ممکنہ طور پر ملنے والی زیادہ سے زیادہ مراعات سے ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات پارلیمنٹ میں پیش کیے جانے والے مسودۂ قانون (Bill) کو پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں فرماتے، اُن کا کام بس قانون سازی کے موقع پر اپنی جماعت کے قائد کے اشارۂ ابرو پر "ہاں" یا "ناں" کہنا ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حال ہی میں ایک پرائیویٹ ٹیلی ویژن چینل کی رپورٹنگ ٹیم نے On Camara قومی اسمبلی کے بعض معزز سینئر ارکان سے پوچھا کہ آپ نے "تحفظِ پاکستان بل" پڑھا ہے، سب نے کسی تردُّد اور احساسِ ندامت کے بغیر جواب دیا: "نہیں"۔

ہمارے قابلِ افتخار ارکانِ سندھ اسمبلی کی اسی دانش کا مَظہرِ اَتَم وہ قرارداد ہے، جس میں انہوں نے "اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان" کو تحلیل کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ ماشاءاللہ یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور ہوئی ہے، لہٰذا اس افتخار واعزاز کا سہرا صوبائی اسمبلی میں نمائندگی رکھنے والی ساری جماعتوں کے تمام معزز ارکان کے سر ہے۔ یہ سعادت وہ اسی لیے حاصل کر پائے کہ انہوں نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کا مطالعہ نہیں فرمایا۔ اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان ایک آئینی ادارہ ہے اور اس کے فاضل ارکان کا دورانیہ تین سال ہے، لہٰذا یہ منصب صرف ان ارکان کے استعفے یا نااہلی یا وفات سے ہی خالی ہوسکتا ہے۔ اس آئینی ادارے کو تحلیل بھی نہیں کیا جاسکتا۔

سونے پر سہاگا یہ کہ اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کے موجودہ اراکین پاکستان پیپلز پارٹی کی گزشتہ حکومت یعنی سابق وفاقی وزیر مذہبی امور جناب سید خورشید احمد شاہ، سابق وزرائے اعظم جناب سید یوسف رضا گیلانی اور راجہ پرویز اشرف اور سابق صدر جناب آصف علی زرداری کا حسنِ انتخاب ہیں۔ ہاں! چیئرمین مولانا محمد خان شیرانی کا تین سالہ دورانیہ ختم ہونے پر دوبارہ یہ سعادت موجودہ وزیر اعظم جناب محمد نواز شریف نے حاصل کی ہے، کیونکہ یہ منصب مولانا فضل الرحمن کے حکومت کے ساتھ جامع معاہدے

(Package Deal) کا حصہ ہے، لہٰذا کسی حکومت کو تسلسل ملے یا نہ ملے، مولانا کے جامع پیکج کو تسلسل ضرور ملتا ہے۔ یہی ڈیل ان کی سابقہ حکومت کے ساتھ تھی اور اسی کا تسلسل موجودہ حکومت کے ساتھ ہے۔ سو، دانا لوگوں کا مقولہ ہے ع: ''مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید، بر کلۂ خود باید زند''، (یعنی وہ گھونسا جو جنگ کے بعد یاد آئے، بہتر ہے کہ اسے اپنے ہی رخسار پر مار دیا جائے)، کیونکہ اس سے جنگ کا نتیجہ تو بدلنے سے رہا۔ پس سندھ اسمبلی کی اس متفقہ قرارداد کو ''خود ملامتی'' کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے۔ مگر جب ہم اپنی کل کی بات بھی بھول جائیں، تو اس قوتِ حافظہ یا شانِ بے اعتنائی کو کیا نام دیا جائے۔ ہاں! اگر سندھ صوبائی اسمبلی نے اپنی قیادت کے حسنِ انتخاب پر کوئی ''قراردادِ تاسُّف'' یا ''قراردادِ مذمت'' پاس کی ہوتی، تو شاید ایک بے نتیجہ سی معنویت ضرور پیدا ہو جاتی۔

پاکستان پیپلز پارٹی اپنے آپ کو 1973ء کے متفقہ دستور کا وارث سمجھتی ہے، لیکن اس کے ارکان کو اُس کا مطالعہ کرنے کی فرصت کہاں، ورنہ انہیں پتا ہوتا کہ اس میں مارشل لا اَدوار کے بہت سے اِضافات بھی ہیں، مگر انہیں تو وہ گلے لگائے ہوئے ہیں اور اٹھارہویں آئینی ترمیم کے ہتھوڑے کی ضرب سے بھی وہ محفوظ رہے ہیں، کیونکہ یہ مفاہمت کی سیاست کا لازمی تقاضا تھا۔

ہمارا ایک عاجزانہ مشورہ ہے کہ آئندہ قومی انتخابات میں پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے امیدواروں پر دستورِ پاکستان کا تحریری ٹیسٹ لازمی قرار دیا جائے اور اس میں انہیں نقل کی بھی رعایت دی جائے، شاید اسی بہانے ہمارے معزز نمائندے دستورِ پاکستان کے دو چار آرٹیکل بھلے یاد نہ کر سکیں، پڑھ تو لیں گے۔ ویسے 2013ء کے انتخابات کے لیے کاغذاتِ نامزدگی جمع کراتے وقت یہ حضرات آرٹیکل 62 اور 63 پر پورا اتر چکے ہیں، یعنی تقوے کا امتحان پاس کر چکے ہیں اور ''صادق'' اور ''امین'' بھی قرار پا چکے ہیں، سوائے سابق وزیرِ اعظم جناب سید یوسف رضا گیلانی کے کہ وہ 2017ء تک صادق و امین نہیں ہیں، مستقبل کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

جنرل (ر) پرویز مشرف صاحب کے عہدِ مبارک کے وزیرِ پارلیمانی امور ڈاکٹر شیر افگن نیازی مرحوم حیات ہوتے، تو ہم یہ تجویز دیتے کہ قومی اسمبلی، سینیٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس کا آغاز دستورِ پاکستان اور اس کی تشریح پر مشتمل اُن کے درس سے کیا جائے، اس طرح اصل دستور سازوں کی روح کو بھی سکون پہنچے گا۔ موصوف کو دستورِ پاکستان کے کم از کم وہ آرٹیکل اَزبر تھے، جو اُن کے ممدوح اور سابق صدرِ پاکستان جناب جنرل (ر) پرویز مشرف کے اقتدار کے تحفظ و دَوام کے لیے ضروری تھے۔

چونکہ قانون کی حکمرانی سے کسی کو غرض نہیں ہے، اس لیے جب سے ہمارے منتخب اداروں میں بالواسطہ انتخاب کے ذریعے بیگمات کا کوٹہ مقرر ہوا ہے، وہ بھی اپنی کارروائی وقتاً فوقتاً ڈالتی رہتی ہیں، مثلاً عورتوں پر مظالم، کاروکاری، غیرت کے نام پر قتل اور بیویوں پر تیزاب پھینکنے سے متعلق قانون سازی وغیرہ۔ اس طرح کے کارہائے نمایاں انجام دے کر وہ اپنی ریٹنگ بڑھاتی رہتی ہیں۔ یہ قوانین کب نافذ ہوں گے اور کیسے نافذ ہوں گے؟، اس سے انہیں غرض نہیں اور ہونی بھی نہیں چاہیے، کیونکہ یہ ان کے طبقے کا مسئلہ نہیں ہے۔

یہ اعزاز بھی ہمیں حاصل ہے کہ ہم نے قانون کی کتاب کا حجم موٹا کرنے کے لیے قتل کی مختلف اقسام کے عنوان سے قانون سازی کا شرف حاصل کیا ہے۔ قرآن کی رو سے قتل، بس قتل ہے اور اس کی سزا قصاص ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور ہم نے ان پر یہ فرض کیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں بھی بدلہ ہے، تو جس نے خوش دلی سے بدلہ دیا، تو وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہے اور جو اللہ کے نازل کیے ہوئے احکام کے موافق فیصلہ نہ کریں، تو وہی لوگ ظالم ہیں''۔ (المائدہ:45)

پس اسلام کا حکم قطعی اور واضح ہے اور وہ ہے: ''قانونِ قصاص''۔ قتل خواہ کسی بھی عنوان سے ہو، وہ قتل ہے اور اس کی ایک ہی سزا ہے۔ البتہ دہشت گردی کو قرآن نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ اور ''فساد فی الارض'' سے تعبیر کیا ہے اور

فقہِ اسلامی میں اس کا اصطلاحی عنوان ''مُحارَبہ'' یا ''حِرابہ'' ہے اور اس کی سزا اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی تمام سزاؤں سے زیادہ سنگین ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، ان کی یہی سزا ہے کہ انہیں چن چن کر قتل کیا جائے یا ان کو سولی دی جائے یا ان کے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹ دیے جائیں یا ان کو زمین سے نکال دیا جائے، یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے''۔ (المائدہ:33)، آج کل ''نَفی مِنَ الاَرض'' کی صورت قید ہے۔

مگر ہمارا کوئی قانون کاروکاری کے نام پر ہے، کوئی غیرت کے نام پر قتل کے لیے، کوئی عورتوں پر تیزاب پھینکے جانے کے حوالے سے اور کوئی کسی اور عنوان سے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ایک جامع حتمی اور قطعی قانونِ قصاص کافی وشافی ہے، اسے لفظاً ومعنیً نافذ کردیا جائے تو کسی اور قانون سازی کی ضرورت نہیں ہے۔

10 اپریل 2014ء

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اوّلین خطبۂ خلافت
ایک مثالی اسلامی مملکت کا مثالی منشور

(قسطِ اوّل)

حضرت ابوبکر صدیق، عبداللہ بن عثمان بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرہ بن کعب بن لوی القرشی التیمی رضی اللہ عنہ، رحمۃ للعالمین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال فرمانے کے بعد ربیع الاوّل 11ھ کو مہاجرین و انصار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اتفاقِ رائے سے خلیفہ منتخب ہوئے، یہ عہدِ رسالت کے بعد اجماعِ امت (Consensus) کی سب سے نمایاں اور اوّلین مثال ہے۔

دوامِ رفاقت:

اعلانِ نبوت کے پہلے لمحے سے لے کر آفتابِ نبوت کے پردہ فرمانے تک تیئس سالہ نبوی زندگی میں ہر آن، ہر پل، ہر لمحے اور ہر موڑ پر صحبت و رفاقت، تائید و حمایت اور جاں نثاری و جاں سپاری کی جو تابندہ روایت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قائم کی، اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ سفر ہو یا حضر، بزم ہو یا رزم، خلوت ہو یا جلوت، الغرض وہ کسی بھی لمحے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جدا نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ روضۂ رسول میں آج بھی آپ کا سرِ نیاز تاجدارِ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں میں ہے، بقول شاعر:

پائے رسولِ پاک پہ سر ہو رکھا ہوا
ایسے میں آ اجل، تو کہاں جا کے مر گئی

یعنی وفات اور بعد الوفات کی جس سعادتِ عظمیٰ کی کوئی صاحبِ ایمان، سچا عاشق رسول تمنا کر سکتا ہے، وہ انہیں بفضلہٖ تعالیٰ نصیب ہے اور:

این سعادت بزور بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

غارِ ثور کے تین دن اور تین راتیں ایسی بھی گزریں کہ آفتاب نبوت کے جلوے تھے اور لذت دیدار سے فیض یاب ہونے والی جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نگاہیں تھیں، اس شرف وسعادت میں کواکب ونجوم، آفتاب وماہتاب حتیٰ کہ چشمِ فلک بھی ان کی شریک وسہیم نہیں تھی، کوئی تیسرا فرد تو تھا ہی نہیں۔

منفرد اعزاز:

یوں تو روایات کے مطابق ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کی تعداد سوا لاکھ سے متجاوز تھی لیکن قرآن مجید نے صراحت کے ساتھ جس ہستی کو "صاحبِ رسول" کے لقب سے نوازا، وہ صرف اور صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اگر تم نے اس رسول کی مدد نہ کی تو یقیناً اللہ نے ان کی مدد فرمائی، جب کافروں نے انہیں بے وطن کیا، اس حال میں کہ وہ دو میں سے دوسرے تھے، جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، جب وہ (رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے "صاحب" سے فرما رہے تھے: غم نہ کرو بلاشبہ اللہ ہمارے ساتھ ہے، تو اللہ نے ان پر اپنی تسکین نازل فرمائی"۔ (توبہ:40)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مختلف پیرائے میں 6 مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق کا ذکر فرمایا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک منفرد اعزاز یہ بھی ہے کہ ان کی چار پشتیں شرف صحابیت سے مشرف ہوئیں۔

خُلقِ رسول کا عکس تمام

جب محبت مرتبۂ کمال کو پہنچ جائے تو مُحِب اپنے آپ کو ذاتِ محبوب میں فنا کر دیتا ہے، طبیعت طبیعت میں اور مزاج مزاج میں ڈھل جاتا ہے، یہی "مقامِ فنا" حضرت ابوبکر صدیق

کا تھا۔ دیکھنے والوں کی نظر میں صورت ان کی تھی لیکن سیرت مصطفیٰ کی تھی، ذہن ان کا تھا لیکن فکر مصطفیٰ کی تھی، الغرض وہ سراپا جمالِ مصطفوی کا عکسِ تمام تھے۔ جب سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غارِ حرا سے پہلی بار ناموسِ وحی لے کر اضطراب کے عالم میں اپنے گھر تشریف لاتے ہیں، منصب نبوت کے بار امانت کے احساس سے آپ متفکر ہیں اور یہ عین تقاضائے فطرت ہے، تو ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ، جو عُسر و یُسر کی ہر گھڑی میں آپ کی مُونس و غمگسار تھیں، آپ کو ان جچے تلے الفاظ میں تسلی دیتی ہیں: ''قسم بخدا، اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی شرمسار نہیں فرمائے گا، کیونکہ آپ رشتۂ قرابت کو جوڑتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، ناداروں کے کام آتے ہیں، مہمان نوازی آپ کا شعار ہے اور آپ حق کی خاطر مصائب میں مبتلا لوگوں کی مدد فرماتے ہیں''۔

یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریکِ حیات اور محرمِ راز حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی زبان سے آپ کی سیرت و کردار کا ایک جامع تعارف تھا۔ اسی طرح ایک مرحلے پر کفارِ مکہ کے مظالم سے تنگ آکر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ترکِ وطن کے ارادے سے نکلتے ہیں کہ اچانک مکہ کے ایک رئیس ''ابن الدغنہ'' کا سامنا ہو جاتا ہے، وہ آپ کے عزائم سے باخبر ہونے کے بعد آپ کا راستہ روک لیتا ہے اور کہتا ہے ''لاریب، آپ جیسے شخص کو اس بستی سے ہرگز نہیں جانا چاہیے اور نہ ہی ہم آپ کو کسی قیمت پر جانے دیں گے، کیونکہ آپ تو اخلاقِ کریمہ کا پیکر ہیں، آپ ناداروں کے کام آتے ہیں، رشتۂ قرابت کو جوڑتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی آپ کا شیوہ ہے اور آپ راہِ حق میں مصیبت اٹھانے والوں کے مُعین و مددگار ہوتے ہیں''۔

سیرتِ صدیق کی الفاظ میں یہ تصویر کشی کسی نظریاتی دوست اور جاں نثار کی نہیں بلکہ نظریاتی مخالف کی ہے اور وہ شہادت جو فریقِ مخالف کی طرف سے آئے، اپنے اور غیر سب پر حجت ہوتی ہے۔ یہ حسنِ اتفاق تھا یا امرِ واقعی کا بیان کہ ام المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے جن کلمات میں سیرت کو بیان فرمایا، کم و بیش انہی الفاظ میں مکہ کے ایک

رئیس ابن الدغنہ نے سیرتِ صدیق کو بیان کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیرتِ صدیق سیرتِ مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ بس یوں سمجھئے کہ وہ سراپا آئینۂ خُلقِ مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ذاتِ رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذکرِ مبارک کے ساتھ متصلاً ذکرِ صدیق بھی آیا ہے۔

ربیع الاول 11 ہجری کو سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا اور ہدایت و نور کے اس آفتاب عالم تاب نے رضائے الٰہی سے پردہ فرمایا، تو صحابۂ کرام میں عجیب کیفیتِ اضطراب تھی، وہ اس صدمے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی اس خبر کو سننے کے لیے کسی طور پر بھی تیار نہیں تھے۔ ایسے عالم میں حضرت ابوبکر صدیق تشریف لائے، کاشانۂ نبوت میں داخل ہوئے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جبینِ اقدس کو بوسہ دیا اور باہر مسجد نبوی میں تشریف لائے اور صحابۂ کرام کے لیے تسکین و طمانیت کے کلمات ارشاد فرمائے کہ:

''تم میں سے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت کرتا تھا تو سنو! وہ وصال فرما گئے ہیں اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اسے یقینِ کامل رکھنا چاہیے کہ اس کا معبود مطلق اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے صفتِ حیات کے ساتھ قائم ہے اور ہمیشہ رہے گا، اس پر فنا و زوال کبھی نہ آیا ہے نہ آئے گا''۔

اور پھر آپ نے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی: ترجمہ:

''محمد (خدا نہیں) صرف رسول ہیں، ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں، تو کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا (قضائے الٰہی سے) شہید ہو جائیں، تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟''۔

(آل عمران:144)

ان پُر اثر کلمات سے صحابۂ کرام کو قلبی اطمینان نصیب ہوا، حضرت عبداللہ فرماتے ہیں ہمیں ایسا لگا جیسے یہ آیت آج ہی نازل ہوئی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا خطبۂ خلافت

اس کے بعد مہاجرین و انصار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے متفقہ طور پر حضرت ابوبکر صدیق کو

خلیفہ منتخب کیا، آپ مسجد نبوی میں تشریف لائے اور منبرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر بیٹھ کر ایک انتہائی اثر انگیز، دل نشیں اور جامع خطبہ ارشاد فرمایا۔ چند جملوں پر مشتمل یہ خطبہ ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کی اوّلین، مستند تاریخی دستاویز ہے اور جسے بلاشبہ ''ایک مثالی اسلامی جمہوری فلاحی مملکت کا مثالی منشور'' قرار دیا جاسکتا ہے۔ معجزۂ ''جوامعُ الکَلِم'' کے براہِ راست فیض یافتہ حضرت ابوبکر صدیق کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ نپا تلا ہے، حکمتوں کا خزینہ اور معانی ومطالب کا گنجینہ ہے۔

اس خطبۂ خلافت میں نظامِ امارت وخلافت کے قیام کی ضرورت وحکمت، اطاعتِ امیر کا دائرۂ کار، مامورین یعنی عوام کی ذمّے داری، انسدادِ فواحش کی اہمیت اور جہاد کی ترغیب وضرورت سب امور کا احاطہ کیا گیا ہے۔

چنانچہ آپ نے فرمایا:

''لوگو! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں، حالانکہ میں تم لوگوں میں سب سے افضل (ہونے کا مدعی) نہیں ہوں، اگر میں ٹھیک کام کروں تو تم میری اعانت کرو، اور اگر میں برائی کی طرف جھکنے لگوں تو تم مجھے سیدھا کردو، سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تم میں سے جو (بظاہر) کمزور ہے، وہی حقیقت میں میرے نزدیک طاقتور ہے تاوقتیکہ میں (ظالم سے) اُس کا حق واپس نہ دلا دوں، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور تم میں جو بظاہر بڑا طاقتور ہے وہی میرے نزدیک (سب سے) کمزور ہے تاوقتیکہ میں اُس سے (مظلوم کا) حق چھین نہ لوں، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جو قوم ''جہاد فی سبیل اللہ'' کو چھوڑ دیتی ہے، اللہ تعالیٰ (اس کے وبال کے طور پر) اُس پر ذلت وخواری مسلّط فرما دیتا ہے، اور جس قوم میں بے حیائی وبدکاری کی وبا پھیل جاتی ہے، اللہ تعالیٰ اس پر مصیبتیں نازل فرما دیتا ہے۔ اور (سنو!) جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے جادۂ مستقیم پر قائم رہوں، تم بھی میری اطاعت کرنا اور اگر کبھی میں (خدانخواستہ) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم کی اطاعت کا بندھن توڑ کر نافرمانی کے رستے پر چل پڑوں، تو پھر تم پر میری اطاعت ہرگز لازم

نہیں ہوگی، اچھا، اب نماز (باجماعت) کے لیے اٹھ کھڑے ہو جاؤ، اللہ تعالیٰ تم پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے“۔(تاریخ الخلفا للسیوطی بحوالہ سیرۃ ابن اسحاق)

اس عظیم الشان خطبۂ خلافت میں اسلامی نظام امارت وخلافت کی حدود، دائرہ کار اور فرائض کا واضح طور پر تعین کردیا ہے، ہم آئندہ قسط میں ان میں سے چند امور کی ضروری وضاحت درج کررہے ہیں۔

17اپریل2014ء

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اوّلین خطبۂ خلافت
ایک مثالی اسلامی مملکت کا مثالی منشور

(آخری قسط)

اطاعت امیر کی حدود

اسلام میں خلیفۂ برحق اور شرعی طور پر مُجاز حاکم وامیر کی اطاعت بلاشبہ لازم ہے اور رعایا میں سے جو بھی فرد خلیفۂ برحق کی اطاعت سے عدول وخروج کرے، وہ باغی کہلاتا ہے۔ لیکن یہ اطاعت غیر محدود اور غیر مشروط (Unconditional) نہیں ہے، بلکہ یہ اطاعت صرف اسی صورت میں اور اس وقت تک لازم ہے جب تک خلیفہ یا امیر یا حاکم اعلیٰ کے احکام، اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول کے دائرے میں ہوں۔ اور اگر امیر خود ہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقررہ حدود کی حرمت کو پامال کرے، تو اس کی اطاعت ہرگز لازم نہیں ہے۔ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ابدی اور دائمی ضابطہ بیان فرمادیا ہے کہ ''کسی ایسے معاملے میں مخلوق (خواہ وہ سربراہ مملکت وحکومت ہی کیوں نہ ہو) کی اطاعت تم پر لازم نہیں ہے، جس سے خالق عزّ وجلّ کی نافرمانی لازم آتی ہو''۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں مقتدر مطلق (Sorereign) نہ سربراہ مملکت وحکومت ہے، نہ قاضی القضاۃ (Cheif Justice)، نہ پارلیمنٹ اور نہ ہی عوام۔ مُقتدرِ مُطلق (Absolute Sovereign) صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اور غیر مشروط

مُطاع، یعنی جس کی اطاعت ہر حال اور ہر صورت میں لازم ہو، صرف اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات ہے، اسی کو قرآن نے ''حاکمیتِ الٰہیہ'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے تمام سلوگن کہ: ''اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں'' یا اقتدارِ اعلیٰ (Sovereighty) پارلیمنٹ کو حاصل ہے''، اسلام میں ہر سطح کا اقتدار و اختیار مشروط ہے اور نیابتِ رسول اور خلافتِ الٰہی کی مقررہ حدود کا پابند ہے۔ اسی اصول کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء آیت: 59 میں بیان فرمایا ہے۔

عوام کی ذمّے داری:

حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا: ''اگر میں غلط رَوِش اختیار کروں تو تم مجھے سیدھا کردو''۔ اس سے معلوم ہوا کہ عامۃ المسلمین بالخصوص اہل الرائے اور اہل فکر و نظر پر یہ شرعی ذمّے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو امورِ مملکت و حکومت سے الگ تھلگ نہ رکھیں۔ حاکمِ وقت پر کڑی نظر رکھیں، اگر وہ شریعت کے جادۂ مستقیم پر رواں دواں ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہدایات و حدود پر سختی سے کاربند ہے تو حمایت حق کے لیے اس کے دست و بازو بن جاؤ۔ اور اگر خدانخواستہ وہ راہ راست پر نہیں ہے، حق کو ٹھکرا رہا ہے، حدود الٰہی کو پامال کررہا ہے، تو اسے اجتماعی قوت سے سیدھا کردو اور اگر اصلاح و ہدایت کی ہر صدا کے لیے وہ اندھا اور بہرا بن گیا ہے تو اسے معزول کردو۔ کچھ لوگ اپنے تقوے اور پارسائی پر ناز کرتے ہیں اور گرد و پیش میں کچھ بھی ہوتا رہے، اس سے الگ تھلگ رہتے ہیں، ایسے لوگوں کی توجہ کے لیے احادیث پیشِ خدمت ہیں:

''حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: قسم اس رب ذوالجلال کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، تم پر لازم ہے کہ نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو، ورنہ (اگر تم نے اس طرزِ عمل کو نہ اپنایا) بعید نہیں کہ اللہ تم پر اپنا عذاب نازل فرمائے، پھر تم ضرور دعائیں بھی کرو گے، لیکن وہ اللہ کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوگی''۔ (سُنن ترمذی: 2169)

حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

اللہ عزوجل نے جبرئیل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ فلاں بستی کو اس کے رہنے والوں سمیت الٹ دو، جبرئیل امین نے عرض کی: اے ربّ جلیل! اس بستی میں تیرا فلاں (نیک اور پارسا) بندہ بھی ہے جس نے کبھی پلک جھپکنے کی مقدار بھی تیری نافرمانی نہیں کی (یعنی اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے)، ربّ ذوالجلال نے فرمایا: ہاں، اس شخص سمیت پوری بستی کو الٹ دو، کیونکہ (اس کے سامنے میری حدود پامال ہوتی رہیں، لیکن اس کی غیرتِ ایمانی کبھی نہ جاگی اور) میری خاطر (حق کو پامال ہوتا دیکھ کر) اس کا چہرہ کبھی غضب آلود نہ ہوا"۔

(مشکوۃ:5152)

اسلامی حکومت کے قیام کا مقصد:

تاریخ کے اکثر ادوار میں یہ دیکھا گیا ہے کہ ظالم طاقت ور ہوتا ہے، وہ طاقت کے نشے میں مخمور ہوتا ہے، اثر ورسوخ کا مالک ہوتا ہے، اس کے سامنے قانون بے اثر ہو جاتا ہے اور نظامِ عدل معطّل ومفلوج ہو جاتا ہے اور رقصِ ابلیس کرتا ہے۔ حکومتِ الٰہیہ، خلافتِ ربّانی اور امارتِ اسلامی کے قیام کا اولین مقصد یہی ہے کہ ظلم کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو روکا جائے، نہ رکے تو اسے کاٹ پھینکا جائے۔ "طاقت" کو معیارِ حق نہ بنایا جائے بلکہ "حق" کی قوت کو تسلیم کیا اور کرایا جائے۔ مظلوم چونکہ حق پر ہوتا ہے اس لیے ریاست اپنی طاقت اس کے پلڑے میں ڈال لے تاکہ ظالم حق کی طاقت کو تسلیم کر کے اس کے آگے سرنگوں ہو جائے اور مظلوم کو اس کا حق دینے پر راضی ہو جائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے اولین خطبۂ خلافت میں اسی فلسفۂ حکمرانی کو عمل کے قالب میں ڈھال کر دکھایا کہ "میری نگاہ میں مظلوم ہی طاقت ور ہے تاوقتیکہ اس کا حق اسے دلا نہ دیا جائے"۔ کیونکہ مظلوم کی فریاد میں اتنی تاثیر ہے کہ عرشِ الٰہی کو ہلا دیتی ہے۔ چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "مظلوم کی فریاد سے ڈرو، کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے"۔

(بخاری:1496)

حدیث مبارک ہے: "قیامت کے دن مقتول مظلوم اپنے قاتل کو پکڑ کر اللہ کی عدالت

میں پیش کرے گا اور عرض کرے گا کہ اے رب کریم! اس سے پوچھئے کہ اس نے کیوں مجھے (ظلماً) قتل کیا؟، قاتل عرض کرے گا: (اے رب!) فلاں بادشاہ یا حکمراں کے دور میں، میں نے یہ قتل کیا"۔ (یعنی وہ دور ہی ظلم کا تھا)، (نسائی:4010)

اور انسانیت اسی نظام عدل کے لیے ترس رہی ہے جس کا نمونہ کامل سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قائم فرمایا اور پھر خلفائے راشدین نے اس "منہاج نبوت" پر نظام خلافت اور نظام عدل کو قائم کر کے دکھایا۔ اسی عدل کی برکات تھیں کہ اس دور کی ساری سپر پاورز، یعنی قیصر و کسریٰ، عظمت اسلام کے آگے سرنگوں ہوگئیں۔ جہاد ہی میں بقا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: "جہاد قیامت تک جاری رہے گا"۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "جو قوم جہاد کو ترک کر دیتی ہے، اللہ اس پر ذلت و رسوائی مسلط فرما دیتا ہے"۔ لہٰذا اہل ایمان کی سربلندی اور عزت و سرفرازی کا راز جہاد ہی میں مضمر ہے۔

فواحش نزولِ بلاء و وبا کا سبب ہیں:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ "جب کسی قوم میں بے حیائی و بدکاری فروغ پاتی ہے تو اس پر ارضی و سماوی مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جب کسی قوم میں اللہ کی نافرمانی کا دور دورہ ہو، معاصی عام ہوں، اور وہ طاقت کے باوجود ان کا سدِ باب نہ کریں تو اللہ ان پر عمومی عذاب نازل فرماتا ہے۔

مسئلۂ تکفیر:

آج کل بہت سے لوگ اس مسئلے کو پوری قوت کے ساتھ اجاگر کرتے ہیں کہ ریاست کے علاوہ کسی شخص کو اس امر کی اجازت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ کفر کا فتویٰ جاری کرے یا کسی فعل کو کفر قرار دے اور اس کے مرتکب کو کافر کہے۔ بلاشبہ کسی کو کافر کہنا یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہمارے فقہائے کرام نے لکھا ہے:

"خلاصہ" وغیرہ میں ہے: جب ایک کلام میں کئی پہلو کفر کا احتمال رکھتے ہوں اور ایک احتمال کفر سے مانع ہو، تو مفتی پر لازم ہے کہ اس مسلمان کے ساتھ حسنِ ظن رکھتے ہوئے،

اُس ایک احتمال کو ترجیح دے اور تکفیر سے احتراز کرے''۔ (عالمگیری، جلد 2، ص:283)،
لیکن اگر کوئی شخص کفریہ معنیٰ کو سمجھ کر اس پر اصرار کرے، تو پھر اس پر کفر کا حکم لگایا جائے گا۔

لیکن اگر حکومت اسلام سے لاتعلق ہو جائے تو اُس عہد کے علمائے حق پر لازم ہے کہ اسلامی عقائد کی حفاظت کریں اور کفرِ صریح کو کفر کہیں۔ لوگ ہمارے پاس ایسے بے شمار سوال لے کر آتے ہیں کہ ایک شخص سرے سے اللہ کی ہستی کا منکر ہے، معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ کو ظالم کہتا ہے، قرآن کا، رسول کا انکار کرتا ہے، تو ہمیں کیا کہنا چاہیے کہ وہ سچا اور پکا مسلم ہے۔ فتویٰ کسی بھی دریافت طلب مسئلہ کے بارے میں فقہی رائے اور شرعی حکم بیان کرنے کا نام ہے۔ فتویٰ قضا نہیں ہے، قضا عدالت کا منصب ہے۔ یہ قاضی اور جج کا منصب ہے کہ وہ کسی دعوے کی صداقت کو پرکھے، اسے درست قرار دے، اس کا حکم بیان کرے اور قانون کے مطابق سزا دے یا دعوے کو باطل قرار دے۔ اگر ریاست اپنی ذمے داری پوری کرے، تو یہ سب سے اَحسن طریقہ ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہی کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرمانے کے بعد انتہائی حساس اور نازک دور تھا، مگر جب زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار اور جھوٹے مدعیانِ نبوت کا فتنہ برپا ہوا، تو خلیفۃ الرسول نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کرنے والوں سے قتال کیا، مرتدین اور خصوصاً مُسَیلمہ کذّاب کے خلاف جہاد کر کے اِن فتنوں کی سرکوبی کی۔ اِسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خارجیوں کے خلاف جہاد کیا اور اس فتنے کا خاتمہ کیا، اُس زمانے کے خوارج کا فتنہ یہ تھا کہ وہ انارکسٹ اور مذہبی انتہاپسند تھے اور اپنے نظریے سے اختلاف رکھنے والے مسلمانوں کو کافر اور واجب القتل سمجھتے تھے۔

18 اپریل 2014ء

خود احتسابی کی ضرورت

معروف صحافی، کالم نگار اور اینکر پرسن جناب حامد میر پر کراچی میں قاتلانہ حملہ ہوا اور میڈیا رپورٹس کے مطابق انہیں چھ گولیاں لگیں۔ ہم اس کی شدید مذمت کرتے ہیں، اس پر انتہائی حزن وملال اور رنج و اَلم کا اظہار کرتے ہیں، اُن کے خاندان کے ساتھ ہمدردی کے ساتھ ساتھ ان کی جلد صحت یابی کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا گو ہیں اور اس پر یک گونہ تشکر بجالاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی زندگی کی حفاظت فرمائی اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ سب کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت فرمائے۔ ظلم اور قتل وغارت کی ہر صورت انتہائی مذموم، اذیت ناک اور قابلِ مذمت ہے، خواہ اس کا نشانہ علماء ہوں، صحافی ہوں، جج یا وکلا ہوں، سیاسی رہنما اور کارکن ہوں یا عام شہری۔

صحافت حامد میر کی شخصی ساخت (Genetic) اور خون میں شامل ہے، یہ انہیں اپنے والد مرحوم سے وراثت میں ملی ہے۔ انہوں نے انتھک محنت اور لگن سے میدانِ صحافت میں اپنا مقام بنایا، قسمت نے بھی ان کی یاوری کی، قدرت بھی ان پر مہربان رہی اور ایک بڑے پرنٹ و الیکٹرونک میڈیا گروپ کا فورم بھی انہیں میسر رہا اور انہوں نے اس کو بہتر پیشہ وارانہ مہارت کے ساتھ استعمال کیا۔ لہٰذا بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ موجودہ دور میں ہمارے صحافتی شعبے کے نمایاں افراد میں سے ایک ہیں۔

کسی کے تمام نظریات سے نہ بلادلیل اختلاف درست ہے اور نہ ہی اندھا اتفاق۔ اختلاف واتفاق دلیل واستدلال اور شواہد کی بنیاد پر ہونا چاہیے اور مثبت وتعمیری اختلاف

اور بحث و مباحثہ اچھی روایت ہے، اس سے خالی الذہن اور غیر جانبدار قارئین و ناظرین کو حقائق جاننے کا موقع ملتا ہے۔ جنابِ حامد میر کو قائد اعظم محمد علی جناح اور شاعرِ ملت علامہ ڈاکٹر محمد اقبال سے بے پناہ محبت ہے، اس کے ساتھ ساتھ ختمِ نبوت سے بھی انہیں عقیدت ہے اور ان کی فکر کے یہ زاویے ہمیں بھی پسند ہیں۔

اپنے کالموں یا کیپٹل ٹاک میں وہ بعض شعبوں پر تسلسل سے توجہ دیتے رہے اور متوجہ کرتے رہے، ظاہر ہے کہ یہ وہ شعبہ ہے جس سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے افراد یا ادارے موجود ہیں۔ لیکن جب کوئی کسی چیز کو اپنا مشن بنا لے، تو وہ ذہنی اور فکری طور پر خطرات کے لیے بھی تیار رہتا ہے اور جیسا کہ بتایا گیا کہ انہوں نے اپنے ادارے، اہلِ خانہ یا بعض احباب کو اپنے خدشات سے آگاہ بھی کر رکھا تھا۔ دراصل اپنے والد مرحوم پر بیتے ہوئے حالات اور ماضی کے اَدوار میں اُن کے ساتھ رَوا رکھے گئے اہلِ اقتدار کے نامناسب رویوں کی ناخوشگوار یادیں بھی ان کے دل و دماغ سے محو نہیں ہو پائیں اور بعض اوقات انسان غمِ جاں کو غمِ دوراں بنالیتا ہے اور یہ بھی انسان کی فطرت ہے کہ جو شخص ایک خاص طرح کے حالات کے جبر سے گزرا ہو اور کسی کے انتقام کا نشانہ بنا ہو تو اُس کو اُن جیسے حالات میں مبتلا دوسرے اشخاص کے دکھ درد کا اِدراک و احساس بہتر طور پر ہوتا ہے اور اُن کو دیکھ کر اُس کے اپنے زخم تازہ ہو جاتے ہیں۔ شاید حامد میر صاحب کی فکری ساخت میں یہ ایک عنصر بھی کارفرما ہے۔

ان پر قاتلانہ حملے کے بعد بلاشبہ ایک جذباتی کیفیت پیدا ہوئی، جس نے ان کے میڈیا کے رفقائے کار اور اہلِ خانہ کو شدید صدمے سے دوچار کر دیا اور ایسے حالات میں جذبات کے اظہار میں انسان سے بے اعتدالی ہو جاتی ہے، ان کے میڈیا گروپ سے بھی ایک حد تک بے اعتدالی ہوئی، جس کا بعد میں اُنہوں نے خود اِدراک کر لیا اور اس کی تلافی کی بھی ممکن حد تک کوشش کی۔ ڈاکٹر عامر لیاقت حسین صاحب اور کامران خان صاحب کے پروگرام اسی تلافیِ مافات (Compensation) کے لیے تھے۔

آئی ایس آئی بہر حال ایک قومی ادارہ ہے، اس کا دائرۂ کار اور تفویض کردہ ذمے داری (Mandate) ایک قومی، ملی اور ملکی ضرورت ہے اور اس طرح کے ادارے دنیا کے ہر ملک میں موجود ہیں۔ کسی بھی ادارے کے ایک فرد یا چند افراد کی بے اعتدالی سے، اگر کہیں سرزد ہو جائے، پورے ادارے کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنانا درست نہیں ہے، کیونکہ اس سے پاکستان کے دشمن فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہمارے حساس اداروں کے خلاف عالمی سطح پر منفی پروپیگنڈے کا ایک طوفان اٹھالیا جاتا ہے، جب کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ادارے ویسے بھی ہندوستان، امریکا، اسرائیل اور بعض دوسرے ممالک کے لیے انتہائی ناقابلِ قبول اور ناپسندیدہ ہیں۔ اور ان دنوں جب کہ ہمارا ملک بین الاقوامی جاسوسی اداروں را، موساد، سی آئی اے، ایم آئی سکس، بعض برادر ہمسایہ ممالک اور دیگر بین الاقوامی اداروں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، آئی ایس آئی کی ضرورت وافادیت اور بڑھ جاتی ہے اور ہمارے قومی مفاد کا تقاضا ہے کہ آئی ایس آئی کو داخلی تنازعات میں نہ الجھایا جائے تاکہ اس کی کامل توجہ اپنی اصل اداراتی (Institutional) ذمے داریوں پر مرکوز رہے۔

لیکن اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اس معاملے کو زیادہ نہ اچھالا جائے، کوئی بھی کارروائی پیمرا کی سطح پر ہو یا عدالتی سطح پر، اس وقت اُس پر عالمی اداروں کی نظر ہوگی اور وہ اِسے Exploit کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے، اس کے لیے الیکٹرونک میڈیا اور آزادیِ صحافت کے اداروں کو عالمی سطح پر بھرپور طریقے سے استعمال کیا جائے گا اور اس کا نقصان ہمارے قومی ادارے آئی ایس آئی اے کو سب سے زیادہ ہوگا۔ اس لیے اَز حد احتیاط کی ضرورت ہے اور بہتر ہے کہ باہمی روابط کے ذریعے اعتذار اور تلافی کا کوئی قابلِ قبول اور باوقار طریقہ اختیار کیا جائے اور اسے حکومت اور حکومتی ادارے بھی قبول کریں اور ملک وقوم کے وسیع تر مفاد میں ''جنگ وجیو'' کا ادارہ بھی اسے فراخ دلی سے تسلیم کرے، ورنہ ہم اس محاورے کا مصداق بن جائیں گے کہ:

''چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر، ہر صورت میں نقصان خربوزے کا ہوگا''۔

اس لیے میری اپیل ہے کہ ہمارے قومی اداروں کو بھی بڑے پن کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور آئندہ کے لیے قومی اداروں کو پہنچنے والے نقصان کے سدِ باب کے لیے بروقت باہمی رابطے کا کوئی قابلِ عمل طریقۂ کار (Mechanism) وضع کرنا چاہیے۔

حامد میر صاحب کے سانحے نے الیکٹرونک میڈیا کی کمزوریوں کو بھی بے نقاب کیا۔ میں ایک عرصے سے کہہ رہا ہوں کہ ہمارے الیکٹرونک میڈیا کے بعض اینکر پرسن ''خبر دینے اور خبر لینے'' کی حدود سے تجاوز کر کے ''مصلحِ اعظم'' کا منصب اختیار کرتے جا رہے ہیں، وہ اپنے آپ کو مذہبی مصلح (Religious Reformer)، سماجی مصلح، سیاست کے معلم اور نہ جانے کیا کیا سمجھ بیٹھے ہیں۔ ہم امریکا اور مغربی دنیا کے میڈیا کو بھی وقتاً فوقتاً دیکھ لیتے ہیں، لیکن ہمارے ہاں جو جارحانہ پن ہے، وہ امریکا اور مغربی دنیا میں بھی نہیں ہے۔

ہمارے میڈیا والے یہ کہتے نہیں تھکتے کہ اہلِ مذہب ایک دوسرے سے لڑتے ہیں، ایک دوسرے کے لیے منافرت کے جذبات رکھتے ہیں، اسی طرح وہ دوسرے شعبہ ہائے زندگی کو بھی اپنی ملامت کا ہدف بناتے رہتے ہیں، لیکن حامد میر صاحب کے سانحے نے یہ اجاگر کیا کہ ہمارے آزاد الیکٹرونک میڈیا میں مقابلے اور مسابقت (Competition) کی وجہ سے منافرت انتہائی درجے پر پہنچ چکی ہے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ یہ تو ہم دیکھتے رہتے تھے کہ ایک چینل دوسرے چینل کا نام لینے کا بھی روادار نہیں ہوتا، اگر کسی ایک چینل کے اینکر پرسن، صحافی، رپورٹر، فوٹو گرافر یا کارکن کو نشانہ بنایا جاتا ہے، تو صرف یہ ٹکر چلتا ہے کہ ''نجی ٹی وی کے رپورٹر یا فوٹو گرافر پر حملہ ہوا''، لیکن اب تو یہ منافرت انتہا کو پہنچ گئی، قرآن مجید نے اس کیفیت کو ان کلماتِ طیبات میں بیان فرمایا:

(۱) ''گویا وہ ابھی شدتِ غضب سے پھٹ جائے گی''۔ (الملک:8)

(۲) ''بغض تو ان کی باتوں سے عیاں ہو چکا اور جو وہ اپنے دلوں میں چھپائے بیٹھے ہیں وہ اس سے بھی بہت بڑھ کر ہے''۔ (آل عمران:119)

اس طرح کے تبصرے کہ ساری گولیاں نچلے دھڑ میں کیوں لگیں، اس کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ براہِ راست دل یا دماغ میں کیوں نہ اتر گئیں، انتہائی سنگ دلانہ ہے۔ غالباً میاں محمد بخش کے شعر کا ایک مصرع ہے کہ:

"دشمن مرے تے خوشی نہ کریے، سجناں وی مر جانا"

الغرض حامد میر صاحب کا حادثہ وسانحہ خاص طور پر الیکٹرونک میڈیا کے لیے ایک کسوٹی بن گیا، بلکہ ایک آئینہ بن گیا، جس سے ایک دوسرے کے لیے جو نفرتیں چھپائے بیٹھے تھے، چھلک کر سامنے آ گئیں۔ اب بہتر ہو گا کہ ہمارے الیکٹرونک میڈیا کے ناخدا دوسروں کو بھی اپنے جیسا انسان سمجھ کر ذرا نرم ہاتھ رکھیں گے اور اب وقت کا تقاضا بھی ہے کہ ہم سب ذمے داری، توازن اور اعتدال کا مظاہرہ کریں اور خود اپنے لیے ریڈ لائن مقرر کریں اور اُسے عبور نہ کرنے کی رضاکارانہ اخلاقی ذمے داری اپنے اوپر عائد کریں۔

24 اپریل 2014ء

استخارہ

''استخارہ'' کے لفظی معنی ہیں: ''خیر طلب کرنا'' اور اس کا شرعی مفہوم یہ ہے: وہ معاملہ جس کے دونوں پہلو شرعاً جائز ہیں، یعنی شرعاً آپ اُسے اختیار بھی کر سکتے ہیں اور ترک بھی کر سکتے ہیں اور انجام کار فائدہ اسے اختیار کرنے میں ہے یا ترک کرنے میں، اس کے بارے میں آپ کو تردد ہے، آپ متذبذب ہیں، اپنی عقل کی روشنی میں آپ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ کروں یا نہ کروں اور آپ کا دل اِس طرف مائل بھی ہو رہا ہے، آپ اُس خیال کو ذہن سے جھٹک کر نکال بھی نہیں سکتے کہ: ''کہیں ایسا نہ ہو جائے، ویسا نہ ہو جائے''، اُس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے خیر کے تعین کے بارے میں رہنمائی حاصل کرنا۔

جس کام کے کرنے کا شریعت میں حکم ہے، اس کے لیے ''استخارہ'' نہیں کیا جاتا، وہ تو ویسے بھی شریعت کا مطلوب ہے، اسی لیے فارسی کا مقولہ ہے: ''در کارِ خیر حاجتِ استخارہ نیست''، یعنی نیک کام میں استخارے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ استخارہ گزشتہ اُمور کے بارے میں بھی نہیں کیا جاتا کہ کوئی آکر آپ کو بتائے کہ: ''آپ پر جادو ہو گیا ہے یا بندش کر دی گئی ہے اور اب اس کا توڑ کیا جائے گا''۔ جو کام شرعاً حرام ہے، اس کے لیے استخارہ کرنا بھی حرام ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بہت بڑی جسارت ہے اور اس کے غیظ و غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ استخارہ مباح اُمور میں ہوتا ہے کہ: فلاں شخص کے ساتھ اپنے بیٹے یا بیٹی کا رشتہ قبول کریں یا نہ کریں، کسی شخص کے ساتھ کاروباری شراکت کریں یا نہ کریں، آپ کو ایک سے زائد مقامات سے ملازمت کی پیشکش آتی ہے، آپ تذبذب میں

پڑ جاتے ہیں کہ کسے قبول کریں اور کسے رَدّ کریں، وغیرہ۔

استخارہ کی تعلیم حدیث پاک میں فرمائی گئی ہے: حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں تمام (جائز اور مباح) اُمور میں ''استخارہ'' کی تعلیم اس اہتمام کے ساتھ فرماتے تھے، جیسے ہمیں قرآن کی کوئی سورت تعلیم فرماتے تھے، (تو استخارہ یہ ہے کہ) جب تم میں سے کوئی کسی کام کا ارادہ کرے، تو اُسے چاہیے کہ دو رکعت نفل پڑھے، پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ دعا کرے:

''اے اللہ! میں تیرے علم سے خیر کو جاننے کے لیے رہنمائی چاہتا ہوں اور خیر کو حاصل کرنے کے لیے تیری ذات سے توفیق کا طلب گار ہوں اور میں تیرے فضل عظیم سے سوال کرتا ہوں، کیونکہ تو قدرت والا ہے اور میں عاجز و بے بس ہوں، تو معاملات (کے اچھے یا برے انجام) کو جانتا ہے اور میں نہیں جانتا، کیونکہ تو غیبی امور کو بہت جاننے والا ہے۔ اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ معاملہ جو مجھے درپیش ہے، میرے دین کے لیے، میرے معاش کے لیے، انجامِ کار کے اعتبار سے، فوری اور دیرپا فائدے کے اعتبار سے میرے لیے بہتر ہے، تو تو اسے (اپنے فضل وکرم سے) میرے لیے مقدر فرما۔ اور (اے اللہ!) اگر تو جانتا ہے کہ یہ معاملہ (جو مجھے درپیش ہے)، میرے دین، میرے معاش، انجامِ کار کے اعتبار سے، فوری اور دیرپا فائدے کے اعتبار سے میرے لیے برا ہے، تو اسے مجھ سے دور کردے اور مجھے اس سے دور کردے، اور (اس کے بدلے میں) جہاں بھی خیر ہے، وہ میرے لیے مقدر فرما، پھر اسے میرے دل میں پسندیدگی عطا فرما (یعنی مجھے قلبی اطمینان اور قرار وسکون نصیب ہوجائے کہ بس یہی میرے لیے خیر ہے)، اور ''هٰذَا الْأَمْرَ'' (یعنی یہ معاملہ) کی بجائے (چاہے تو) اپنی حاجت کا نام لے کر دعا کرے''۔ (صحیح بخاری:6382)،

اس حدیث کو امام مسلم کے سوا محدثین کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں: ''اور ان مستحب نمازوں میں دو رکعت نمازِ استخارہ بھی ہے''۔ اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ''اور ''حلیہ'' میں ہے: اور

اس دعائے استخارہ کی ابتدا اور آخر میں حمد و صلوٰۃ پڑھنا مستحب ہے، اور ''الاذکار'' میں ہے: پہلی رکعت میں سورۃ ''الکافرون'' اور دوسری رکعت میں سورۂ ''اخلاص'' پڑھے۔ اور بعض بزرگوں سے روایت ہے کہ پہلی رکعت میں سورۂ ''الکافرون'' کے بعد سورۂ القصص کی آیات: 69-68 اور دوسری رکعت میں سورۂ اخلاص کے بعد سورۂ احزاب، آیت: 36 کی ''مِنْ اَمْرِهِمْ'' تک پڑھے۔ (اور اگر درپیش مسئلہ کے بارے میں کسی ایک جانب قلبی اطمینان حاصل نہ ہو تو) سات دن تک مسلسل اس طریقۂ کار کے مطابق اللہ تعالیٰ سے استخارے کی مسنون دعا مانگتے رہنا چاہیے جیسا کہ ''ابن السنی'' نے روایت کیا ہے:

''اے انس! جب تم کسی کام کا ارادہ کرو، تو اس کے بارے میں اپنے رب سے سات بار رہنمائی کی دعا کرو،، پھر سمجھو کہ تمہارے دل میں درپیش مسئلے کے کرنے یا نہ کرنے کی بابت جو بات قرار پا گئی ہے، بس خیر اسی میں ہے''۔ اور اگر استخارے کے لیے نفل نماز پڑھنا دشوار محسوس ہو تو صرف دعا پر بھی اکتفا کر سکتے ہو، یہ (''اذکار'' کی عبارت کا) خلاصہ ہے۔

اور ''شرح الشرعۃ'' میں ہے: ہم نے اپنے مشائخ سے سنا ہے کہ مذکورہ دعا پڑھنے کے بعد باوضو ہو کر قبلہ رُو سو جائے، پس اگر وہ خواب میں سفید یا ہرا رنگ دیکھے تو سمجھ لے کہ اس میں خیر ہے اور اگر کالا یا سرخ رنگ دیکھے تو سمجھ لے کہ اس میں شر ہے، پھر اس کام سے اجتناب کرے''۔ (ردالمحتار علی الدر المختار جلد: 2، صفحات: 410-409)

حدیث پاک میں خواب میں کسی چیز کے نظر آنے یا نہ آنے کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہی خواب کا آنا ضروری ہے، یہ بزرگوں اور اہلِ خیر کے اپنے اپنے تجربات ہیں۔ لیکن اگر خواب نظر آ جائے، تو اس سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے، مگر آج کل کے خواب بالعموم افکارِ پریشاں ہوتے ہیں، جنہیں سورۂ یوسف میں ''اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ ایک دن خواب میں ایک رخ دیکھتے اور دوسرے دن اس کے برعکس، چنانچہ وہ کنفیوژ ہو جاتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرنے کے بعد جب دل کو کسی ایک جانب

سکون وقرار نصیب ہوجائے، تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھے اور اُس کی ذات پر توکّل کرتے ہوئے اُس کام کو انجام دے۔ اللہ تعالیٰ سے کامیابی کی دعا کرتے ہوئے یہ امید رکھے کہ وہ اس میں برکت عطا فرمائے گا۔ اگر خدانخواستہ اس پر عمل کرنے کے نتیجے میں کسی ناکامی کا سامنا ہو، تو یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کی منشا کو سمجھنے میں مجھ سے خطا ہوگئی ہے یا یہ گمان کرے کہ اگر اس کے برعکس کیا ہوتا تو ممکن ہے کہ اس سے بڑی ناکامی یا نقصان کا سامنا کرنا پڑتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو تم اپنے حق میں ناپسندیدہ سمجھو، (مگر) وہ (درحقیقت) تمہارے حق میں بہتر ہو اور (یہ بھی) ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو تم اپنے لیے پسندیدہ سمجھو (مگر درحقیقت) وہ تمہارے لیے بری ہو''۔ (البقرۃ:216)

صرف نبی کا خواب یا الہام ''قطعی حجت'' ہوتا ہے، غیر نبی کا خواب یا الہام ایک ظنّی اَمر ہے، لہٰذا اگر کسی نے کسی مسئلے میں استخارہ کیا اور کسی وجہ سے اس پر عمل نہ کیا، تو اس سے گنہگار نہیں ہوگا، نہ ہی اُس پر کوئی وبال آئے گا۔

''استخارہ'' کی روح یہ ہے کہ جس بندے کو کوئی مسئلہ دَرپیش ہے، وہ خود استخارہ کرے، کیونکہ جتنا درد، قلبی وابستگی، حضوریٔ قلب، تضرّع اور عاجزی کسی شخص کو اپنے معاملے میں ہوسکتی ہے، دوسرے شخص کو اس کے معاملے میں نہیں ہوسکتی۔ حدیث میں ہے: رب ذوالجلال فرماتا ہے: ''میں ان کے پاس ہوتا ہوں، جو میری (خشیت ومحبت اور انکسار کی) وجہ سے شکستہ دل رہتے ہیں''۔ (الشفاء، جلد:1 ص:78)

جو شخص اپنے دَرپیش مسئلے میں پانچ/سات بار عاجزی سے اپنے رب کے حضور التجا اور طلبِ خیر ودعا کے لیے ذہنی، فکری اور عملی طور پر آمادہ نہ ہو، وہ استخارے کی روح اور حقیقت کو سمجھا ہی نہیں۔ باقی وہ لوگ جو استخارے کے نام پر ماضی کے اَحوال بتاتے ہیں کہ کسی پر کالا جادو ہوگیا ہے، سفلی عمل کردیا گیا ہے، چند سیکنڈ میں یہ تمام غیبی اُمور ان پر منکشف ہوجاتے ہیں اور ایک ہی لمحے میں اُن کا حل بھی نکل آتا ہے، یہ حدیث میں نہیں ہے۔ اس

سے لوگ توہم پرستی اور تشکیک میں مبتلا ہوتے ہیں، تقدیرِ الٰہی پر رضا، جو مومن کا شعار ہونا چاہیے، اُس میں کمزوری واقع ہوتی ہے۔ پھر لوگ کسی مشکل صورتِ حال میں، جب انہیں کوئی فیصلہ کن راہ سجھائی نہ دے، اللہ تعالیٰ کی ذات سے براہِ راست رجوع کرنے اور اس کے حبیبِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے توسُّل کی روش کو ترک کرکے، طرح طرح کے عاملوں سے رجوع کرتے ہیں۔ استخارہ تو مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی طلب کرنے کا نام ہے۔ آج کل اسے کاروبار بنا دیا گیا ہے اور کئی جگہ بورڈ آویزاں ہوتے ہیں کہ ''استخارہ کرالو''۔ یعنی بندہ اتنا بے نیاز ہوگیا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رجوع کرنے کی بجائے یہ کام بھی نذرانہ اور فیس دے کر دوسروں سے کرانا چاہتا ہے۔

حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ دَرپیش معاملات اور مباح امور میں سے کسی ایک کے انتخاب کے لیے یا کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں استخارہ کرنا افضل اور مستحب ہے، لیکن یہ واجب نہیں ہے، یعنی استخارہ نہ کرنے پر گنہگار نہیں ہوگا۔

25 اپریل 2014ء

DISCLAIMER

آج کل ہمارے الیکٹرونک میڈیا پر بعض پروگراموں کے شروع میں Disclaimer لکھا ہوا آتا ہے اور اس کے مندرجات پلک جھپکتے میں نظروں کے سامنے اسکرین پر گزر جاتے ہیں۔ اردو میں ہم اسے ''اظہارِ لاتعلقی'' یا ''اعلانِ براءت'' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ پروگرام میں پیش کردہ مشمولات (Contents) میزبان کے ذاتی خیالات ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ انہیں حقائق کے طور پر پیش نہ کریں یا یہ کہ اس میں پیش کیے گئے واقعات فرضی ہیں اور کسی سے مشابہت محض ''اتفاق'' ہوگا اور یوں ادارہ ان خیالات و افکار کے لیے اپنا فورم یا پلیٹ فارم بھی فراہم کرتا ہے اور اس کے ممکنہ قانونی اور اخلاقی نتائج سے بری الذمہ بھی ہو جاتا ہے۔

''اتفاق'' سے یاد آیا کہ ہماری سیاست کا ایک مرنجا مرنج کردار اور ایک عرصے سے اپنی جماعت کے معتوب اور ناپسندیدہ حافظ حسین احمد صاحب ہیں۔ 2002ء کے قومی انتخابات کے بعد اُس وقت کے صدر جناب جنرل (ر) پرویز مشرف کو ایک عدد فرماں بردار اور بے ضرر وزیر اعظم کی تلاش تھی اور مختلف شخصیات زیر غور تھیں، اُن میں سے ایک پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے جناب مخدوم محمد امین فہیم بھی تھے۔ ''علیٰ رؤوس الاشہاد'' یعنی آن دی ریکارڈ ملنے میں اپنی پارٹی

کے حوالے سے انہیں مشکلات درپیش تھیں۔

چنانچہ رات کو مری روڈ پر ایک ریسٹوران میں یہ ملاقات ہوگئی۔ اخبارات کے تجسس

اور راز ہائے دروں جاننے کے ماہر اور ہر آن چوکس Investigative Reporters نے تعاقب کر کے اس کا کھوج لگالیا اور یوں یہ راز طشت ازبام ہو گیا، چنانچہ فریقین نے اسے ''اتفاقیہ ملاقات'' قرار دیا۔ اس پر حافظ صاحب نے بامعنی طنزیہ پھبتی کسی کہ ہاں واقعی یہ ''اتفاقیہ ملاقات'' تھی، کیونکہ اس پر پیشگی ''اتفاق'' ہو چکا تھا۔ تاہم بدقسمتی سے ''وزارتِ عظمیٰ'' کا ہما پھر بھی مخدوم صاحب کے سر پر نہ بیٹھا اور یوں یہ سعی لاحاصل بھی رہی اور ''غلام مصطفی جتوئی'' مرحوم کی طرح اس مہم جوئی نے انہیں پارٹی کی نظروں میں ہمیشہ کے لیے مشکوک بنادیا۔ آج کل حافظ صاحب کو جب طنز و مزاح سے لبریز کوئی خیال سوجھتا ہے تو ''اوکاڑا پریس کلب'' ان کی مدد کو آپہنچتا ہے۔ یہ ''اتفاقیہ ملاقات'' اُس دور کی بات تھی جب ابھی خودکش حملوں، ریموٹ کنٹرول بم اور ٹائم ڈیوائس بم اور اس کے طرح کے دیگر سائنٹیفک تباہ کن حملوں کا ہمارے ملک میں رواج نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد پے در پے حادثات وسانحات نے دامن کوہ کے خوشگوار اور پر بہار مقامات پر ان ''اتفاقیہ'' ملاقاتوں کے مواقع کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔

گفتگو کا اصل موضوع ''Disclaimer'' تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن زریں افکار وخیالات کے اَمرِ واقعہ اور نفس الامر کے مطابق ہونے کا خود ادارے کو یقین نہیں ہے، ان کو نشر کرنا اخلاقاً کس حد تک درست ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے:

''اے ایمان والو! جب تمہارے پاس کوئی فاسق (یعنی بے اعتبار شخص) کوئی خبر لے کر آئے، تو (فوری ردِ عمل سے پہلے اُس کی) تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم حقیقت حال کو جانے بغیر کسی قوم کو نقصان پہنچا دو اور پھر تمہیں اپنے کیے پر ندامت ہو''۔ (الحجرات:6)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ثبوت ہی کافی ہے کہ ہر سنی سنائی بات کو (تحقیق کے بغیر ہر ایک سے) بیان کرتا پھرے''۔ (صحیح مسلم:07)

ہمارے الیکٹرونک میڈیا کو اب بلوغت (Maturity) کی منزل میں داخل ہو جانا

چاہیے تھا اور اُس کے انداز میں ٹھہراؤ آجانا چاہیے تھا، لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ مسابقت (Competition) اگر تعمیری اور مثبت ہو تو یہ ایک اچھی رَوِش اور قابلِ تحسین شِعار ہے، محض سنسنی خیزی (Sensation) کے لیے نہ ہو کہ لوگ سکتے میں آجائیں، مبہوت، حیرت زدہ اور دہشت زدہ ہو جائیں اور آپ کی اسکرین سے چپٹے رہیں۔ اسی طرح صرف ایسی خبروں پر زور نہیں ہونا چاہیے جو پاکستان میں مایوسی پھیلائیں اور بیرونِ ملک پاکستان کا منفی چہرہ دکھائیں اور اپنے اور غیر سب کو یہ یقین ہونے لگے کہ پاکستان اب حکمرانی کے قابل (Governable) نہیں رہا یا یہ کہ پاکستان ایک انتہائی خطرناک ملک ہے اور ہر پاکستانی دہشت گرد ہے اور انسانیت کے لیے خطرے کی علامت ہے۔ ایسے میں کون پاکستان میں سرمایہ کاری کے لیے آگے آئے گا اور غیر ملکی ٹیمیں کیسے پاکستان کے میدانوں کا رُخ کریں گی۔

نوبت یہاں تک آگئی کہ اسی Disclaimer کے حربے کو اب پرائیویٹ ٹیلی ویژن چینلز ایک دوسرے کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ تمام حدود وقیود اور اخلاقی بندھنوں سے آزاد بلکہ بہت زیادہ آزاد میڈیا کے لیے باہر سے اور خود ان کے اندر سے بھی آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ: Enough is enough، بہت ہو چکا، اب کسی قانونی اور اخلاقی دائرے میں آجایئے اور قبل اس کے کہ پورے معاشرے میں ایک مزاحمتی تحریک برپا ہو، آپ لوگ خود اپنی بے اعتدالی کا اعتراف وادراک کریں اور اپنے اندر ایک اصلاحی نظم قائم کریں اور توازن واعتدال کی راہ اپنائیں۔

اسی طرح لازم ہے کہ کسی کی تحقیر وتوہین اور طنز ومزاح میں فرق ملحوظ رکھا جائے۔ بقولِ شخصے:

"There is a very thin line between accountability and victimization."

یعنی احتساب اور انتقام میں بہت خفیف سا فرق ہے، اسی طرح میرے نزدیک تحقیر اور طنز میں بھی معمولی فرق ہے۔ اور اسلام کسی کی تحقیر، تضحیک، توہین اور تذلیل کی اجازت نہیں دیتا۔

''سورۃ الحجرات'' میں اس حوالے سے تفصیلی احکام موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

(۱): ''اے ایمان والو! تم میں سے کچھ لوگ دوسرے لوگوں کا مذاق نہ اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ جن کا مذاق اڑایا جارہا ہے، وہ (درحقیقت) مذاق اڑانے والوں سے بہتر ہوں، اسی طرح عورتیں بھی دوسری عورتوں کا مذاق نہ اڑائیں، بہت ممکن ہے کہ جن کا وہ مذاق اڑا رہی ہیں، وہ اُن سے بہتر ہوں اور اپنے (یعنی ایک دوسرے کے) عیب بیان نہ کرو اور ایک دوسرے کو برے ناموں سے نہ پکارو، ایمان لانے کے بعد (اللہ تعالیٰ کی) حکم عدولی بدترین گناہ ہے اور جو اس (یعنی واضح احکام آنے) کے بعد بھی (اپنی اِس رَوِش سے) رجوع نہ کرے، تو یہی لوگ ظالم ہیں''۔ (الحجرات: 11)

(۲) اسی طرح سورۂ ''الھمزہ'' میں دوسروں پر لفظاً یا اشارتاً طعن وتشنیع کرنے اور عیب جوئی کی شدید مذمت فرمائی گئی ہے اور اس پر بڑی وعید آئی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''ہر اس شخص کے لیے ہلاکت ہے جو دوسروں کی عیب جوئی کرتا ہے اور طعن وتشنیع کرتا ہے، یہ وہی ہے جو مال جمع کرتا ہے اور اسے گن گن کر رکھتا ہے، وہ (یہ) گمان کرتا ہے کہ یہ مال اسے (حیاتِ) دوام عطا کرے، ہرگز نہیں! اسے ضرور چور چور کر دینے والی آگ میں جھونک دیا جائے گا اور (اے مخاطب!) تو کیا جانے کہ ریزہ ریزہ کرنے والی آگ کیا ہے، (یہ) اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو سینوں تک چڑھتی ہوگی اور لمبے ستونوں کے اندر ان کا احاطہ کیے ہوگی''۔ (الھمزہ: 1 تا 9)

اسی طرح ہمارے الیکٹرونک میڈیا کے اینکر پرسنز نے مصلحِ اعظم ہونے کے ساتھ عدالت کا منصب بھی ازخود حاصل کرلیا ہے۔ اسلام آباد میں رمشا مسیح کیس سامنے آیا تو ''وائس آف امریکا'' نے مجھے ''راؤنڈ ٹیلیفونک کانفرنس'' میں شرکت کی دعوت دی۔ جب میری باری آئی تو میں نے پروگرام کے اینکر یا میزبان سے گزارش کی کہ مجھے تھوڑی سی تمہیدی گفتگو کی اجازت دیں، انہوں نے ازراہِ کرم اجازت دے دی۔ میں نے کہا: فرض کریں کہ ''قانونِ تحفظِ ناموسِ رسالت'' امریکا کا قانون ہوتا اور وہاں یہ واقعہ رونما ہوتا تو

کیا مقدمے کی تفتیش پولیس کا متعلقہ ادارہ کرتا یا کوئی پرائیویٹ مولانا صاحب یار پورٹر؟،
اگر رمشا مسیح نابالغہ تھی، تو مولانا صاحب فیصلہ صادر کرتے یا عدالت اس معاملہ میں کسی ماہر
طبیب کی رائے لیتی؟، اگر اُس کا دماغی توازن درست نہیں تھا، تو کوئی مولانا صاحب یا
رپورٹر فیصلہ صادر کرتا یا عدالت کسی ماہرِ نفسیات سے باضابطہ رائے مانگتی؟۔ انہوں نے کہا:
یقیناً یہ پولیس اور عدالت کا کام تھا۔ میں نے عرض کی: ہمارے ہاں تو 40 منٹ میں یہ تمام
مراحل کسی بھی چینل کے ٹاک شو میں حل ہو جاتے ہیں اور اس مسئلے میں بھی ایسا ہی ہوا کہ
ایک مولانا صاحب نے بذاتِ خود تحقیق کر کے اُسے مُدعی قاری صاحب کی سازش قرار دیا
اور رمشا مسیح کو بے قصور قرار دیا۔ آخر میں اینکر پرسن نے سوال کیا: مولانا صاحب اُس
مولوی کی سزا کیا ہونی چاہیے؟۔ بس آخر میں ایک ہی مرحلہ باقی رہ جاتا ہے کہ اسے
اسٹوڈیوز میں ٹکٹکی سے باندھ کر اینکر پرسن اسے کوڑے لگائے یا نشانہ باندھ کر فائر کھول
دیں اور فوری انصاف کی مثال قائم ہو جائے۔ کہاں کی تحقیق اور کیسی عدالتیں، اس لمبے
بکھیڑے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟۔ میں نے اُن سے کہا: آپ بتائیں کہ ایک ایسا
مقدمہ جس کی ایف آئی آر کٹ چکی ہے اور جسے عدالت میں جانا ہے، کیا امریکا میں ایسا ممکن
ہے کہ عدالت سے بالا بالا ہی ٹیلی ویژن چینلز پر یہ سارے مراحل طے کر دیئے جائیں۔
انہوں نے کہا: ''ہرگز نہیں! یہ سب تحقیقاتی اداروں، پولیس اور عدالت کا کام ہے''۔ میں
نے عرض کی: ''ہمارے ہاں یہی ہو رہا ہے اور ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اسے میڈیا کی آزادی
کہتے ہیں۔ تو ایسے حالات میں جب میڈیا کسی واقعے کے بارے میں پہلے ہی ایک جذباتی
فضا پیدا کر دے اور کیمرے تعاقب میں ہوں، تو پولیس کی کیا جرأت کہ وہ آزادانہ تحقیقات
کا روگ پالے اور کس میں ہمت ہے کہ میڈیا کے عادلانہ فیصلے کو چیلنج کرے، لہٰذا آپ اہلِ
امریکا کو بتا دیجیے کہ وہاں میڈیا آزادی کے سفر میں بہت پیچھے ہے، پاکستان میڈیا ایک ہی
جست میں آزادی کی معراج حاصل کر چکا ہے''۔

لہٰذا انتہائی مؤدبانہ گزارش ہے کہ مزاج، رَدیوں اور اقدامات میں ٹھہراؤ پیدا کیا

جائے۔ کسی کے پاس کسی واقعے کے بارے میں مصدقہ معلومات ہیں تو متعلقہ ادارے کے سامنے پیش کرے۔ سردست صورتِ حال یہ ہے کہ آگے آگے میڈیا ہے اور پیچھے پیچھے حکومت، وہ بھی ڈری اور سہمی ہوئی۔ بعض میڈیا کے ماہرین عقل و دانش کے امام ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ قوم انہی کو فرائض حکومت تفویض کرتی تا کہ حکومتی نظام کی غلطیاں زیرو لیول پر آجاتیں، لیکن لگتا ہے کہ عوام میں دس بارہ سال سے اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے اور کانوں سے سنتے ہوئے بھی یہ شعور ابھی پیدا نہیں ہوا۔ آج کل ایک اور من پسند موضوع حکومت اور دفاعی اداروں کا اختلاف ہے اور ہمارے میڈیا پرسنز کسی ناگہانی سانحے وحادثے اور افتادِ غیبی کے نزول کے شدت سے منتظر ہیں، اللہ خیر کرے۔

28اپریل2014ء

مئی 2014ء

ON THE SAME PAGE

ماضی میں ہم سنا کرتے تھے کہ تمام اسٹیک ہولڈرز یا متعلقہ ادارے ''آن بورڈ'' ہیں، یعنی تمام اہم اداروں یا اہم مناصب پر فائز لوگوں کو کسی خاص مسئلے میں ہر قسم کے اقدام اور اس کے تدریجی مراحل سے آگاہ رکھا جارہا ہے یا یہ کہ انہیں اعتماد میں لے کر پیش قدمی کی جارہی ہے اور درپیش حالات سے نمٹا جارہا ہے۔

آج کل نئی سیاسی اصطلاح متعارف ہوئی ہے کہ تمام اسٹیک ہولڈرز ایک ہی صفحے پر ہیں، اس کو کہتے ہیں: ''On the same page''۔ اس کا بظاہر مفہوم ہے کہ جو کچھ بھی ہورہا ہے باہمی مشاورت اور مکمل اتفاقِ رائے (Total Consensus) کے ساتھ ہورہا ہے۔ حال ہی میں دو چار ملاقاتیں بھی میڈیا پر دکھائی گئی ہیں، لیکن مصنوعی مسکراہٹوں، لیے دیے اور بجھے بجھے چہروں کے تاثرات اس دعوے کی تائید وتوثیق نہیں کرتے۔

دوسری جانب اچانک غیبی قوتیں حرکت میں آگئی ہیں اور پورے ملک میں ہل چل سی مچ گئی ہے۔ دفاعِ پاکستان کے خودساختہ ٹھیکیدار بھی حرکت میں آگئے ہیں۔ اقتدار کے کھیل میں سائڈ لائن پر اچھے دنوں کے انتظار میں جو مایوس چہرے تھے، وہ اچانک کھل اٹھے ہیں اور سڑکوں پر آرہے ہیں، 60 سال سے متجاوز عمر کے لوگوں کو 1977ء کے ''تحریکِ نظامِ مصطفیٰ'' کے مناظر کی جھلک نظر آرہی ہوگی۔

تب بھی ''کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا'' کے مصداق متضاد عناصر

''ایک ہی صفحے'' پر تھے، قوم پرست، دائیں بازو والے، بائیں بازو والے، سیکولر، منحرفین، حتیٰ کہ مذہب بیزار، سب کے لبوں پر ''نظامِ مصطفیٰ'' کے نعرے تھے۔ ایسے منظر کی تصویر کشی قرآن مجید نے ان کلماتِ طیبات میں کی ہے:

''(اے مخاطب!) تو انہیں بظاہر یک جا (On the Same Page) گمان کرے گا اور (حقیقتِ) حال یہ ہے کہ ان کے دل جدا جدا ہیں (یعنی اندر سے یہ بٹے ہوئے ہیں)''۔ (الحشر: 14)، وہ کسی مشترکہ یا متفقہ ایجنڈے پر یک جا نہیں ہیں بلکہ منفی مقاصد کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ اُن کی یک جائی کا راز ''حُبِّ علی نہیں ہے، بغضِ معاویہ ہے''۔ انسانی تاریخ شاہد ہے کہ نفاق اور دھوکا دہی پر مبنی کوئی بھی اتحاد یا تحریک کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئی بلکہ جب وہ عروج (Climax) پر پہنچتی ہے، تو اسے ہائی جیک کر لیا جاتا ہے اور اُن لوگوں کے حصے میں مایوسیاں، محرومیاں، چاپلوسیاں اور پچھتاوے رہ جاتے ہیں۔

اسی طرح وزیر اعظم نواز شریف کو بھی اپنے اسٹیک ہولڈرز سے دو ٹوک انداز میں بات کرنی چاہیے۔ جن کو وہ ''ایک صفحہ'' پر سمجھ رہے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اُس کا صفحہ نمبر تو ایک ہے، مگر ''کتاب'' اپنی اپنی ہے۔ وزیر اعظم حد سے زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے حالات کا شاید صحیح ادراک نہیں کر پا رہے، اسے عربی میں تعامی (To be Blind) اور تصامّ (To be Deaf) کہتے ہیں، یعنی جان بوجھ کر حقائق سے نگاہیں پھیر لینا اور اندھا اور بہرا بن جانا۔

وزیر اعظم کو اس بات کا بھی صحیح شعور نہیں ہے کہ پاکستان میں صدارتی نظامِ حکومت نہیں ہے، پارلیمانی نظامِ حکومت ہے، جس پارلیمنٹ سے آپ اقتدار کشید کرتے ہیں، اسی سے آپ کٹے ہوئے ہیں، اُن کا سامنا کرنے کے لیے آپ تیار نہیں ہیں۔ آپ پر لازم ہے کہ اپنی پالیسیوں اور اقدامات اور ان کے نتائج کے بارے میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کو اعتماد میں لیں۔ معاملات پر مباحثہ (Debate) کرائیں، خواہ کھلا مباحثہ ہو یا

پس پردہ (In Camera)، ہر صورت میں یہ مباحثہ نہایت ضروری ہے۔

شہبازِ خطابت چوہدری نثار علی خاں نے بھی پارلیمنٹ اور پوری قوم کو ازحد مایوس کیا۔ کسی کو کچھ خبر نہیں کہ ''مذاکرات'' کے نام پر کیا ناٹک رچایا جا رہا ہے، حکومت گونگی بہری ہے اور شاہد اللہ شاہد کے علاوہ مولانا سمیع الحق، مولانا یوسف شاہ اور پروفیسر ابراہیم خان ہمہ وقت ٹیلی ویژن چینلز پر براجمان ہیں۔ میجر (ر) عامر شروع ہی سے اس طریقۂ کار سے اختلاف کرتے رہے ہیں، لیکن وضع داری و رواداری میں وہ کچھ عرصے تک بادلِ نخواستہ چلتے رہے، مگر اب وہ بھی مایوس ہو گئے ہیں اور اخباری و میڈیائی مذاکراتی سلسلے سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا ہے۔ دنیا میں کہیں بھی اس طرح کے حسّاس معاملات و مذاکرات کے احوال روز و شب ٹیلی ویژن چینلز پر موضوعِ بحث نہیں بنتے، سب کچھ پس پردہ ہو رہا ہوتا ہے اور جب کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد ہوتا ہے، تو اس سے قوم کو آگاہ کیا جاتا ہے۔

حکومت پر یہ بھی لازم ہے کہ قومی اور صوبائی سطح پر نمائندگی رکھنے والی بڑی جماعتوں کو بطورِ خاص مرحلہ بہ مرحلہ پیش رفت سے آگاہ کرے اور اُن کے مشورے سے پیش رفت کرے۔ صوبۂ خیبر پختونخوا کی حکمران جماعت ہونے کی وجہ سے تحریکِ انصاف کی اہمیت نسبتاً زیادہ ہے۔ اسی طرح آئی ایس آئی اور دفاعی اداروں کو بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ ہر مرحلے پر شریکِ عمل رکھا جائے۔ اس طرح کامیابی کی صورت میں سب کریڈٹ کے بھی حق دار ہوں گے اور خدانخواستہ ناکامی کی صورت میں سب پر ذمے داری یکساں طور پر عائد ہوگی، ورنہ ناکامی کا سارا ملبہ حکومت پر گرے گا۔ بلکہ اب زیادہ بہتر یہی معلوم ہو رہا ہے کہ حساس ادارے اور دفاعی ادارے مذاکرات کی ڈرائیونگ سیٹ پر آجائیں، تحریکِ طالبانِ پاکستان کا مطالبہ بھی یہی ہے اور اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دونوں فریق حقائق سے باخبر بھی ہوں گے اور انہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہم اپنے مخالف فریق کو کیا مراعات دے سکتے ہیں اور اس کے بدلے میں کیا حاصل کر سکتے ہیں، کیونکہ دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل اپنی سوداکاری کی پوزیشن کا بہتر علم ہے۔

راقم الحروف اُن خوش فہم لوگوں میں سے تھا کہ اب پاکستان میں مارشل لاء قصۂ پارینہ ہے، ہم من حیث القوم ذہنی بلوغت کی منزل میں داخل ہو چکے ہیں، جمہوریت ہمارے قومی مزاج کا حصہ بن چکی ہے، میڈیا آزاد ہے، عدلیہ آزاد ہے اور اب پاکستان میں مارشل لا کی داستانیں ہماری آنے والی نسلیں صرف تاریخ اور نصاب کی کتابوں میں پڑھیں گی۔ لیکن گزشتہ دس دن کے مناظر دیکھ کر یہ غلط فہمی دور ہو چکی ہے اور خوش فہمی کافور ہو چکی ہے۔

ہم بے صبرے اور عُجلت پسند قوم ہیں، سیاست دان، سیاسی جماعتیں اور ٹیلی ویژن چینلز ایک دوسرے کی عداوت میں کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور انسان (اپنے لیے) جس طرح بھلائی کے جلد حصول کی دعا کرتا ہے، اسی طرح (فریقِ مخالف کے لیے) برائی کی دعا کرتا ہے اور انسان بہت جلد باز ہے''۔ (بنی اسرائیل: 11)

یعنی انسان مغلوب الغضب ہو کر اپنے اہل، مال اور اولاد کے خلاف دعا کرتا ہے اور اُس کی جلد قبولیت کی تمنا کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ دعا قبول فرمالے، تو وہ ہلاک ہو جائیں اور بعد میں یہ کفِ افسوس مل کر رہ جائے گا اور اپنے کیے پر پچھتائے گا۔ مگر:

ع: ''اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت''

ہمارے جمہوریت پسند سیاست دانوں کو بھی جمہوریت صرف اُس صورت میں عزیز ہے، جب وہ خود یا ان کی جماعت اقتدار پر فائز ہو اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر کہتے ہیں، بھلے سب بھاڑ میں جائے، بقولِ شاعر:

املی بھی میٹھی لگتی تھی، تھے سجن جب گاؤں میں
تو جو نہیں اب گاؤں میں، آگ لگے سب گاؤں میں

مگر نوشتۂ دیوار یہ ہے کہ پاکستان مسائلستان بنا ہوا ہے۔ افغانستان اور شمالی علاقوں میں فساد کے جو سوتے اور منابِع (Sources) ہیں، ان کی رگیں زیرِ زمین رساؤ اور بہاؤ کے راستے نکالتے ہوئے ہمارے ملک میں تقریباً ہر جگہ قدم جما چکی ہیں اور پورا ملک ان کی

گرفت میں ہے، وہ جہاں چاہیں اور جب چاہیں زمین کے بطن سے سر نکال کر اپنے گردوپیش کو بھسم کر لیتے ہیں۔ان کی جاسوسی اور خفیہ معلومات کے ذرائع ہماری ریاست کی سلامتی اور امن وامان کے اداروں سے زیادہ مؤثر ہیں۔

بلوچستان کی بے چینی کا عالم یہ ہے کہ نہ آپ وہاں معدنی ذخائر تلاش کر سکتے ہیں اور نہ ہی اُن کی رسد کو یقینی بنا سکتے ہیں، آئے دن کے بم بلاسٹ کی وجہ سے ہماری گیس کی ترسیل کے مصارف شاید دنیا میں سب سے زیادہ ہیں، ایسے میں ممکنہ طور پر ایران سے درآمد کردہ گیس کی پائپ لائن کے تحفظ کی کیا ضمانت ہوگی؟۔اس کے لیے زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں ہے،نوشتۂ دیوار پڑھنے کی صلاحیت درکار ہے۔

پس ان حالات میں قومی اور دفاعی ادارے مل کر ہی حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں،کوئی بھی مہم جوئی تباہ کن ہوگی۔نہ ہم قناعت پسند ہیں اور نہ ہی عزیمت واستقامت ہمارا شیوہ ہے۔دوراندیشی اور عاقبت بینی ہمارا قومی شِعار نہیں ہے اور نہ ہم اپنی ماضی سے سبق سیکھتے ہیں۔فوجی حکومت آئے تو اُس سے بھی جلد اُکتا جاتے ہیں اور جمہوریت کی دہائی دینے لگتے ہیں اور بعداز خرابیِ بسیار جمہوریت آجائے،تو وہ بھی ہم سے ہضم نہیں ہوتی۔ہمارا ہر طبقہ خود ہی ایک دوسرے کا دشمن ہے،یعنی اپنے دشمن ہم خود ہیں اور ہمیں کسی بیرونی دشمن کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

2 مئی 2014ء

❁

رجب المرجب

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''بے شک اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ ہے، (یہ تعداد) اللہ کی کتاب (تقدیر) میں آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے دن سے ہے، ان میں سے چار (مہینے) حرمت والے ہیں''۔ (توبہ:36)

حرمت سے مراد یہ ہے کہ ان چار مہینوں کے احترام میں دینِ ابراہیمی سے تواترث کے ساتھ جنگ وجدال کی ممانعت تھی۔ قریشِ مکہ جو دینِ ابراہیمی کی پیروی کے دعویدار تھے، اُصولی طور پر تو اس حُرمت کے قائل تھے، لیکن انہوں نے اسے اپنی خواہشات کے تابع کر دیا تھا اور جب ان محترم مہینوں میں جنگ کرنا چاہتے تو ترتیب کو مصنوعی طریقے سے بدل دیتے تھے اور آگے پیچھے کر دیتے تھے، کفار مکہ کی طرف سے مہینوں کی ترتیب کی اس تبدیلی کو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ''نسیئ'' سے تعبیر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''مہینے کو مؤخر کرنا محض کفر میں اضافہ کرنا ہے، اس سے کافروں کو گمراہ کیا جاتا ہے، وہ کسی مہینے کو ایک سال حلال قرار دیتے ہیں اور اسی مہینے کو دوسرے سال حرام قرار دیتے ہیں تا کہ اللہ کے حرام کیے ہوئے مہینوں کی تعداد پوری کر لیں، تو جس کو اللہ نے حرام کیا اس کو حلال کر لیں''۔ (توبہ:37)

ان چار حرمت والے مہینوں کا بیان حدیثِ پاک میں آیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: ''بے شک زمانہ لوٹ پھر کے اس ترتیب کے مطابق آ گیا ہے جو آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے دن سے چلی آ رہی ہے، سال بارہ مہینوں کا ہے، ان

میں سے چار حرمت والے ہیں: تین (حرمت والے) مہینے متواتر ہیں: ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور (چوتھا) رجبِ مُضَر (یعنی جس کی حرمت قبیلۂ مُضَر کی طرف منسوب) ہے، جو جُمادی الثانیہ اور شعبان کے درمیان آتا ہے"۔(صحیح بخاری:4662)

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قریشِ مکہ کی خود ساختہ تقدیم وتاخیر کی وجہ سے مہینوں کی ترتیب بدل چکی تھی، لیکن 10 ہجری میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ مبارکہ کا پہلا اور آخری "حجۃ الاسلام" ادا فرمایا اور جسے محدثین اور سیرت نگاروں کی اصطلاح میں "حجۃ الوَداع" کہا جاتا ہے، قریشِ مکہ کی تقدیم وتاخیر کے باوجود لوٹ پھر کر مہینے اپنی اسی ترتیب کے مطابق آ گئے جو ابتدائے آفرینش سے چلی آ رہی تھی۔ جب رجب کا مہینہ داخل ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے: "اے اللہ! تو ہمیں رجب اور شعبان میں برکت عطا فرما اور رمضان کا مہینا نصیب فرما"۔(المعجم الاوسط:3951)

رجب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مشہور رِوَایات کے مطابق معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مُحَیِّرُ العُقول معجزہ اس مہینے میں وقوع پذیر ہوا اور وہ ایک مستقل موضوع ہے۔ ان حُرمت والے مہینوں میں ملّتِ ابراہیمی کے تسلسل میں شریعتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی جنگ وجدال کی ممانعت تھی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"(اے رسول!) لوگ آپ سے حرمت والے مہینے میں جنگ کے متعلق پوچھتے ہیں، آپ کہیے کہ اِس ماہ میں جنگ کرنا بڑا گناہ ہے اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجدِ حرام جانے سے روکنا ہے"۔(البقرہ:217)

چونکہ دینِ ابراہیمی سے ان مہینوں کی حرمت مسلّم چلی آ رہی تھی، اسی لیے دور دراز سے لوگ بلاخوف وخطر حج کے لیے آتے تھے اور انہیں مارے جانے یا لُٹ جانے کا کوئی خوف نہیں ہوتا تھا۔ قریشِ مکہ اصولِ حرمت کو ماننے کے باوجود مختلف حیلے اور فریب سے اس کو بے نتیجہ بنا دیتے تھے اور اس کا طریقہ مہینوں کی ترتیب کو بدل دینا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں پر یہ لازم قرار دیا گیا کہ وہ ان کی حرمت کو پامال کرنے اور جنگ میں پہل کرنے سے اجتناب

کریں، لیکن اگر کفار جنگ میں پہل کریں، تو مسلمان ہاتھ باندھ کر بیٹھے نہیں رہیں گے بلکہ انہیں اجازت ہوگی کہ اپنا دفاع کریں اور اس صورت میں حرمت کی پامالی کا وبال مسلمانوں پر نہیں آئے گا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''حرمت والے مہینے کا بدلہ حرمت والا مہینا ہے اور تمام محترم چیزوں کا بدلہ ہے، سو جو شخص تم پر (ماہِ حرمت یا مقامِ حرمت میں) زیادتی کرے تو تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کرو، جتنی اُس نے تم پر کی ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ تقوے والوں کے ساتھ ہے''۔(البقرہ:194)

دوسرے مقام پر فرمایا:''اور برائی کا بدلہ اُس کی مثل برائی ہے''۔(الشوریٰ:40)

ان دو آیات میں مسلمانوں کو یہ اجازت دی گئی کہ اگر ان پر حرمت والے مہینے یا مقام پر دشمن ظلم اور تعدّی کرے تو انہیں تعدّی کے جواب میں تعدّی کا حق حاصل ہے۔ دراصل ظلم و تعدّی کے بدلے کو تعدّی سے تعبیر کرنا اور برائی کے بدلے کو برائی سے تعبیر کرنا یہ ظاہری مشابہت کی وجہ سے ہے، ورنہ در حقیقت ظلم کا بدلہ عدل ہے، تعدّی کا بدلہ حرمت کی حدود کی پاسداری ہے اور برائی کا بدلہ اس کے کیے کی جزا ہے۔

ہمارے اس خطے میں 22 رجب کے ''کونڈوں'' کی روایت معروف ہے کہ امامِ جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے نام پر فاتحہ ہوتی ہے، جس میں لکڑ ہارے کی منظوم داستان پڑھی جاتی ہے اور اس فاتحہ کی میٹھی ٹکیاں یا روٹیاں ایک خاص جگہ پر بٹھا کر کھلائی جاتی ہیں اور اس میں استعمال شدہ برتنوں کو ندی وغیرہ کے پانی میں ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ کسی کے لیے ایصالِ ثواب کسی بھی وقت کیا جا سکتا ہے اور شریعت کی نظر میں یہ ایک پسندیدہ بات ہے، لیکن کسی خاص طرز کے کھانے کو یا خاص جگہ پر کھلانے کو یا خاص تاریخ پر کھلانے کو لازم سمجھنا اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے اور یہ شریعت پر زیادتی ہے، بدعت ہے اور جاہلانہ رَسم ہے۔ بدعت کا مطلب یہ ہے کہ اس تعیُّن کو باعثِ اجر سمجھ لیا جائے۔

22 رجب کو امامِ جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی نہ تاریخ پیدائش ہے اور نہ تاریخ وصال، آپ کی

تاریخِ ولادت کے بارے میں ایک روایت 17 ربیع الاول 80 ہجری ہے، ایک روایت رجب کی بھی ہے، لیکن تاریخ مذکور نہیں ہے، اسی طرح وصال کے بارے میں بھی دو قول ہیں: زیادہ معروف ماہِ شوال 148 ہجری اور ایک قول رجب کا بھی ہے (جلاء العیون، ملا باقر مجلسی، جلد: 2، ص: 3 6)، البتہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی تاریخ وصال 2 2 رجب 60 ہجری ہے، (دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی)۔

- بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاندین اور ان سے بغض رکھنے والوں نے (معاذ اللہ!) اُن کی وفات پر خوشی منانے کے لیے یہ سلسلہ شروع کیا اور چونکہ وہ بنواُمیہ کے اقتدار کا دور تھا، اس لیے اسے پوشیدہ رکھنے کے لیے گھر کے کسی خاص گوشے میں کھلایا جاتا تھا، لیکن ہمیں اس کا کوئی تاریخی حوالہ نہیں ملا۔ اسی طرح رجب میں میٹھی روٹیاں پکا کر سورۂ ملک پڑھی جاتی ہے اور پھر انہیں تقسیم کیا جاتا ہے، ہمیں اس کا بھی کوئی تاریخی حوالہ نہیں ملا، الغرض ایصالِ ثواب مشروع ہے، جائز ہے اور کسی بھی وقت کیا جاسکتا ہے، لیکن خاص طرح کے تعینات کو لازم سمجھنا درست نہیں ہے۔

مولانا مفتی محمد خلیل خان برکاتی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

"ماہِ رجب میں امام جعفر صادق کو ایصالِ ثواب کے لیے کھیر پوری پکا کر کونڈے بھرے جاتے ہیں اور فاتحہ دلا کر لوگوں کو کھلاتے ہیں، یہ جائز ہے۔ اس میں ایک بات بڑی غلط رواج پا گئی ہے کہ جہاں کونڈے بھرے جاتے ہیں، وہیں کھائے جاتے ہیں، یہ ایک غلط حرکت ہے اور یہ غیر شرعی اور جاہلانہ رسم ہے۔ اور یہ ایک کتاب "عجیب داستان" پڑھی جاتی ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں، یہ نہ پڑھی اور نہ ہی سنی جائے، فاتحہ دلا کر ایصالِ ثواب کریں۔ اللہ کے نیک بندوں کی کرامات برحق ہیں"۔ (سنی بہشتی زیور، حصہ سوم، ص: 318)

مفتی وقار الدین رحمۃ اللہ علیہ سے کونڈوں کی شرعی حیثیت کے حوالے سے سوال ہوا، آپ نے جواب میں لکھا:

"اہلسنّت کے نزدیک جیسے ہر فاتحہ جائز ہے، اسی طرح کونڈوں کی فاتحہ بھی جائز ہے،

لکڑہارے کی کہانی من گھڑت ہے۔ کھانے کی ہر چیز کے متعلق ادب سکھایا گیا ہے۔ حدیث میں فرمایا: ''دستر خوان پر جو گر جائے اُسے اٹھا کر کھالو''۔ فاتحہ کے کھانے پر قرآن پڑھا جاتا ہے، اس لیے مسلمان اس کا زیادہ ادب کرتے ہیں، اسی وجہ سے لوگوں نے یہ شرط لگالی کہ وہیں بیٹھ کر کھالیں، باہر نہ لے جائیں اس شرط کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں۔ وہاں بھی کھاسکتے ہیں اور باہر بھی لے جاسکتے ہیں''۔

(وقار الفتاوئی، جلد: اوّل، ص: 202، بزم وقار الدین، کراچی)

کچھ لوگ اسلامی تاریخ کے حوالے سے کسی عظمت والے دن نفلی روزہ رکھنے کو بدعت کہتے ہیں، یہ کہنا بھی شریعت پر زیادتی ہے۔ ہم واضح کر چکے ہیں تعیین کو لازم سمجھنا بدعت ہے اور حصولِ برکت کے لیے کسی بھی دن اجر وثواب کی نیت سے نفلی روزہ رکھنا، نوافل پڑھنا، تلاوت اور دُرود واذکار پڑھنے اور صدقہ وخیرات کرنے کو بدعت سمجھنا، یہ بھی درست نہیں ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور جن چیزوں کے متعلق تمہاری زبانیں جھوٹ بولتی ہیں ان کے بارے میں یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تاکہ تم اللہ پر جھوٹا بہتان باندھو، بے شک جو لوگ اللہ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوں گے''۔ (النحل: 116)

8 مئی 2014ء

خیرِ مستور

انگریزی زبان کا ایک محاورہ ہے: "Blessing in Disguise"، فارسی میں اس سے ملتا جلتا محاورہ ہے: "عدوّ شرّے برانگیزد مرا خیرے دراں باشد"۔ میں اختصار کے ساتھ اِسے "خیرِ مستور" سے تعبیر کرتا ہوں۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ ایسے امر یا واقعے کا ظہور پذیر ہونا جو بادیٔ النظر (Prima Facie) میں شر نظر آتا ہے، لیکن انجام کار اُس میں سے خیر کی صورت نکل آتی ہے۔ حامد میر صاحب پر قاتلانہ حملے کے سانحے اور اُس کے فوری بعد "جیو" کے ردِّعمل سے ایک متنازع صورت پیدا ہوئی۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اِس ردِّعمل میں حدِ اعتدال سے تجاوز ہوا اور پھر اُس کے ردِّعمل میں ہمارے دفاعی اور انٹیلی جنس اداروں کے حق میں ایک لہر چل پڑی اور جنگ/ جیو کے ادارے اور اس کے مالکان پر غداری کے فتوے صادر ہونے لگے۔ ہمارے پاس کوئی ایسا Parameter یعنی پیمانہ یا معیار نہیں ہے، جس کے ذریعے یہ جان سکیں کہ اچانک یہ لہر بے اختیار اور غیر ارادی طور پر چل پڑی اور افراد، اداروں، تنظیموں اور جماعتوں کے دل میں ہمارے دفاعی اور حساس اداروں کے حق میں جذبات کا ایک لاوا پھٹ پڑا یا اس کے پیچھے کوئی غیبی اور نادیدہ قوتوں کی منصوبہ بندی ہے۔ اِس کے بارے میں موقف اور دعوے متضاد ہیں، لیکن یہ امرِ واقعہ ہے کہ اس طرح کی صورتِ حال اس سے پہلے پیدا نہیں ہوئی۔ حافظ محمد سعید صاحب مذہبی رہنما ہیں، جب جنگ/جیو "ذرا سوچیے!" کے عنوان سے حدود قوانین کے خلاف مہم چلا رہے تھے، تو میرے دل میں تمنا تھی کہ مذہبی جماعتیں میدانِ عمل میں آئیں کیونکہ یہ خالص

دینی مسئلہ تھا، لیکن کوئی بھی میدانِ عمل میں نہ آیا، حالانکہ اس وقت متحدہ مجلسِ عمل کے پاس ایک مؤثر پارلیمانی قوت بھی تھی۔ اسی طرح جب ''پڑھنے لکھنے کے سوا پاکستان کا مطلب کیا؟'' والا سلوگن سامنے آیا تو دینی قوتیں مکمل طور پر بے حس اور غیر متعلق رہیں، لیکن اب ماشاءاللہ! یہ متحرک ہوگئی ہیں، تو انہیں مبارک ہو۔

ٹیلی ویژن چینلز میں رقابت، کاروباری و پیشہ وارانہ مسابقت اور کسی نہ کسی درجے میں باہمی مُنافرت کا جذبہ پہلے سے موجود تھا اور لگتا ہے کہیں نہ کہیں یہ چنگاری سُلگ رہی تھی کہ اِس سانحے کے نتیجے میں شعلۂ جوالہ بن کر پھٹ پڑی۔ رَوَاداری، وَضع داری اور حیا کا عنصر پسِ منظر میں چلا گیا اور ایک سلسلہ چل پڑا جو اَب تک جاری ہے۔ کہیں حُبِّ علی کے تحت جذبات بے قابو ہوئے اور کہیں اِس کا سبب بُغضِ معاویہ تھا۔

پاکستان میں پرائیویٹ ٹیلی ویژن چینلز کا سلسلہ اچانک نمودار ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں دسیوں ادارے قائم ہوئے اور میدانِ عمل میں آگئے، اس لیے ارتقاء کی جو فطری رفتار ہوتی ہے کہ غلطیاں ہوتی ہیں، اصلاح ہوتی ہے اور اس طرح تجرباتی دور سے گزرتے گزرتے اداراتی اور پیشہ ورانہ بلوغت (Professional Maturity) کی منزل کو پالیتے ہیں، یہاں ایسا نہیں ہوا، بلکہ ایسا لگا کہ پیدا ہوتے ہی بالغ ہوگئے۔ اپنے شعبے کی پیشہ وارانہ تعلیم وتربیت حاصل کرنے کا تو موقع ہی نہ آیا، خود ہی متعلّم اور خود ہی معلّم بن گئے۔

ہمارے پرنٹ میڈیا یعنی مطبوعاتی صحافت میں قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد کے اَدوار میں کافی رگڑا لگتا تھا، گِھسنا پڑتا تھا، سینئرز کی ڈانٹ سُننی پڑتی تھی، معاشی ریل پیل اور بلیک میلنگ کا تو تصور ہی نہیں تھا۔ درزی کے شاگرد کی طرح ''کاکا'' بن کر پہلے کاج بنانا اور بتدریج سلائی کرنا سیکھنا پڑتا اور آخری مراحل میں کٹنگ کی نوبت آتی اور اس میں برسوں لگتے تھے۔ معاشی تنگی کا تو زندگی بھر کا ساتھ ہوتا، سوائے چند خوش نصیب سینئر اور غیر معمولی قابلیت کے حامل حضرات کے، بالعموم حالت پتلی رہتی، اس لیے صحافت ذریعہ معاش سے

زیادہ مشن کے طور پر اختیار کی جاتی۔ زبان و بیان کا بڑا خیال رکھا جاتا۔ اخبارات اور ریڈیو پاکستان کا دور تہذیب و ثقافت کا دور تھا اور اب لگتا ہے کہ پی ٹی وی کا ابتدائی دور بھی بسا غنیمت تھا، مگر اس کے بعد چل سو چل، نہ ہدف معلوم، نہ منزل کا پتا، نہ سمت کا تعین، بس آنکھیں بند کر کے بگٹٹ دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ اینکر پرسن کے نام پر جو مخلوق مَنصّۂ شہود پر آئی ہے، اپنی مثال آپ ہے۔ کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ اچانک سامنے والے کا گریبان پکڑ کر چانٹے مارنا شروع کر دیں گے۔

اگر اداروں کا قیام اور اِرتقاء فطری رفتار سے ہو تو کسی حد تک توازن بھی قائم رہتا ہے اور Check & Balance کا نظام بھی مربوط اور منضبط ہوتا چلا جاتا ہے، لیکن ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوا۔ عدلیہ کی آزادی کی مثالی تحریک کے نتیجے میں وُکلاء اور میڈیا بے قابو ہوتے چلے گئے اور ایک دہشت کی فضا قائم ہو گئی۔ ''پاکستان الیکٹرونک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی'' کی صورت میں ایک Regulator یعنی قواعد و ضوابط کے بندھن میں باندھے رکھنے والا ادارہ تو وجود میں آیا لیکن ایک بدمست ہاتھی کو ایک رسّی کے ساتھ آپ باندھے رکھنا چاہیں تو ہاتھی آگے آگے ہوگا اور رسی یا تو ہاتھ سے چھوٹ جائے گی یا رسی پکڑنے والے کو ہاتھی کے پیچھے پیچھے گھسٹتے ہوئے چلنا پڑے گا، یعنی ریگولیٹر اتھارٹی پیچھے ہوگی اور Regulated Body آگے آگے، یہاں بھی یہی ہوا۔ غیر محسوس انداز میں میڈیا، وکلاء اور عدلیہ کا ایک دوسرے کے پشت پناہ ہونے کا تاثر بھی پیدا ہوا۔

یہ بھی ہوا کہ کسی ذہنی اور عملی تربیت حاصل کیے بغیر لوگ ٹیلی ویژن اسکرین پر آ گئے، تنقید اور تنقیص و اہانت میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ بہت سے اسٹوری بنانے والے رپورٹر ایسے چڑھائی کرتے ہیں کہ لگتا ہے پاکستان میں سب سے بڑی طاقت اور دہشت کے حامل یہی ہیں۔ یہ طاقت زبان، کیمرا اور اسکرین کی مدد سے حاصل کر لی گئی۔ جو اینکر جتنا اپنے مہمان یا مخاطب پر چڑھائی اور سینہ زوری کرے، وہ اتنا ہی طاقت ور اور مقبول قرار پاتا ہے، اب یہ اُن کی مرضی رہی، کسی کو اپنی صفائی میں بولنے کا

حق دیں یا اسے سلب کرلیں۔ توازن بھی نہ رہا، جانب داری کا تاثر بھی پیدا ہوا، کسی کے آگے دس بیس منٹ تک سرنگوں ہو کر اُن کے پُرجوش خطابات سنے اور سنائے جائیں اور کسی کو ڈیڑھ جملہ بولنے کی بھی اجازت نہ ہو۔ ہمیں آج تک اِس کی کوئی حکمت یا راز سمجھ میں نہیں آیا، ٹی وی مباحثہ اور یکطرفہ خطاب کا فرق بھی ملحوظ نہ رکھا گیا، جو اینکر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہے، سب کچھ اُسی کے دائرۂ اختیار میں ہے۔ یہ بھی زبانِ خلق سے سُننے کو ملتا ہے کہ کون کس کا بندہ ہے اور کون کس کے ایجنڈے پر کارفرما ہے اور یہ کہ اب یہ لوگ کروڑ پتی اور ارب پتی بن گئے ہیں۔ لیکن اب صورتِ حال یہ ہے کہ یہی چینل ایک دوسرے کے بھی بخیے اُدھیڑ رہے ہیں۔

اس تمام صورتِ حال سے جو "خیر مستور" برآمد ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ سب حتیٰ کہ گھر والے (یعنی میڈیا والے) اب خود کہنے لگے ہیں کہ بس بہت ہو چکا، Enough is enough، اب اس سارے نظام کو ضابطے میں لایئے۔ اب اس مسئلے کا حل کسی ایک ادارے کو بند کرنا یا اسے رگڑا لگانا نہیں ہونا چاہیے، اس کی بھی ضرور سرزنش کی جائے، مناسب تادیبی کارروائی بھی عمل میں آنی چاہیے تاکہ احساس ہو کہ کارکردگی پر نظر رکھنے والی کوئی آنکھ اور حدود کی پاس داری کرانے والا کوئی دماغ اور قانونی قوت بھی ہے۔ مگر اصل ہدف پورے نظام کی درستی ہونی چاہیے۔ اسی طرح اپنی دینی، ملّی اور تہذیبی اقدار کی روشنی میں حیا اور شرافت کا بھی کوئی کم از کم معیار لازماً مقرر ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک اداروں کی حرمت سے بھی بڑھ کر اصول و اقدار، دینی و ملّی و تہذیبی روایات کی پاس داری اور ریاست و مملکت اور ملکی و قومی وقار کو ترجیحِ اوّل ملنی چاہیے، کیونکہ اداروں کی حرمت بھی اسلام اور پاکستان کی مرہونِ منت ہے۔

1970ء کے عشرے تک پاکستان کے اخبارات میں "زنا" کا لفظ نہیں چھپتا تھا، رپورٹنگ اتنی محتاط ہوتی تھی کہ لکھا جاتا: "قابلِ اعتراض حالت میں پایا گیا"، اب حال یہ ہے کہ این جی او کی بیگم صاحبہ نیوز چینل پر ایک لڑکی کو بٹھا کر اس سے بیان دلوا رہی ہوتی ہیں

کہ میرا باپ چار سال تک میرے ساتھ بدکاری کرتا رہا۔ وہ پوچھتی ہیں: تم نے کسی کو بتایا نہیں تھا؟، وہ جواب دیتی ہے: میں نے دادی کو بتایا تھا، اس نے بتایا کہ یہ تو بہن کے ساتھ بھی یہی کرتا رہا۔ اور اس داستان کو کامن روم میں ماں باپ، بیٹا بیٹی، بہن بھائی، الغرض پورا خاندان، جن میں نوعمر بھی ہوتے ہیں، دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

اب اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے پورے نظام کی اصلاح نہایت دیانت داری اور حکمت و دانش سے کی جائے اور ضوابط مُبہم (Ambiguous) نہ ہوں بلکہ بالکل واضح اور Self Spoken اور ایسے ہوں کہ اُن کی تطبیق کی جا سکے گی۔

12 مئی 2014ء

معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

(قسطِ اوّل)

معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا سب سے ''مُحَیِّرُ الْعُقُوْل'' یعنی انسانی عقلوں کو حیرت زدہ اور دنگ کرنے والا معجزہ ہے۔ اصطلاحِ شریعت میں ''معجزہ'' سے مراد ''مدعیِ نبوت کی ذات سے کسی ایسے امر کا صادر ہونا ہے، جس کی نظیر پیش کرنے سے انسان عاجز آجائیں''۔ قرآن مجید میں ''معجزے'' کے لیے ''آیۃ''، ''بَیِّنَۃ'' اور ''بُرھان'' کے کلمات آئے ہیں۔ معجزہ کا لفظ ہمارے ''علم الکلام'' کی اصطلاح ہے۔ معجزہ اسے کہتے ہیں، جس کے ذریعے کسی سچے ''مُدّعیِ نبوت'' نے اپنے عہد کے کفار کے ساتھ ''تَحَدِّی'' کی ہو، یعنی منکرین کو مقابلے کا Challenge دیا ہو، جیسے قرآن مجید معجزہ ہے، جب کفارِ مکہ نے اسے ''کلام اللہ'' اور ''وحیِ ربانی'' ماننے سے انکار کیا، تو قرآن نے اُن کے دعوے کو اِن کلمات میں بیان فرمایا:

''اور کافروں نے کہا: یہ قرآن تو صرف من گھڑت بات ہے، جس کو اِس (رسول) نے (اپنی طرف سے) گھڑلیا ہے اور اس پر دوسرے لوگوں نے ان کی مدد کی ہے، سو ان کافروں نے ظلم کیا اور جھوٹ بولا۔ اور انہوں نے کہا: (یہ) گزشتہ لوگوں کے (جھوٹے) قصے ہیں، جن کو اِس (رسول) نے لکھوالیا ہے، جو ان پر صبح وشام پڑھے جاتے ہیں''۔

(الفرقان:5-4)

پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انہیں کئی مراحل میں چیلنج دیا کہ جب تمہارے دعوے

کے مطابق یہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے، بلکہ (معاذ اللہ!) اس نبی کا خود ساختہ کلام ہے، تمہیں تو اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز ہے، سو تم اس کے مقابلے میں ایسا ہی کلام بنا لاؤ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) ''کیا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے (یہ قرآن) تو خود گھڑ لیا ہے؟، آپ کہیے: پھر اس جیسی دس سورتیں گھڑی ہوئی تم (بھی) لے آؤ اور اللہ کے سوا (اپنی مدد کے لیے) جس کو بلا سکتے ہو، بلا لو، اگر تم سچے ہو''۔ (ہود:13)

(۲) ''اور جو کلام ہم نے اپنے خاص بندے پر نازل کیا ہے، اگر تمہیں اس (کے کلام اللہ ہونے) کے بارے میں کچھ شک ہے، تو اس کی مانند کوئی (چھوٹی سی) سورت تم بھی بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے (تمام) مددگاروں کو بھی بلا لو، اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو''۔ (البقرہ:24-23)

پھر قرآن نے فیصلہ کن بات ارشاد فرما دی:

''آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمام انسان اور جن مل کر (بھی) اس قرآن کی مثل لانا چاہیں، تو وہ اس کی مثل نہیں لا سکیں گے، خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں''۔ (الاسراء:88)

اس کے بعد کفارِ مکہ نے کٹ حجتی کا سلسلہ شروع کیا اور فرمائشی معجزات کا مطالبہ کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اور انہوں نے کہا: اس رسول پر فرشتہ کیوں نہیں نازل کیا گیا اور اگر ہم فرشتہ نازل کرتے، تو ان کا کام پورا ہو چکا ہوتا، پھر انہیں مہلت نہ دی جاتی (یعنی اتمامِ حجت کے بعد وہ عذابِ الٰہی کے حق دار قرار پاتے) اور اگر ہم اس رسول کو فرشتہ بنا دیتے، تب بھی اس کو (صورۃً) مرد بناتے، تو ہم ان کو اسی اشتباہ میں ڈال دیتے، جس میں اب مبتلا ہیں''۔

(الانعام:9-8)

یعنی اصل ملکی صورت میں تو فرشتہ ان کو نظر نہ آتا اور بشری صورت میں وہ پھر یہی اعتراض کرتے کہ یہ تو ہم جیسا بشر ہے۔ کبھی ان کفارِ مکہ کا مطالبہ یہ ہوتا کہ ہمارے مردہ

آباء و اجداد آ کر ہمیں برزخ و آخرت کے حالات بتائیں تو ہم تب مانیں گے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اور اگر ہم ان کی طرف فرشتوں کو بھی نازل کرتے اور مردے اُن سے باتیں کرتے اور ہم ہر چیز کو اُن کے سامنے جمع کر دیتے، تب بھی وہ ایمان نہ لاتے''۔ (الانعام:111)

اس کے بعد کفارِ مکہ نے طرح طرح کے فرمائشی معجزات کا مطالبہ شروع کیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور انہوں نے کہا: ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ آپ ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ جاری کر دیں یا آپ کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو، پھر آپ اُن کے درمیان سے بہتے ہوئے دریا جاری کر دیں یا جس طرح آپ ہم سے کہتے ہیں، ہم پر آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دیں یا آپ اللہ کو اور فرشتوں کو ہمارے سامنے (بے حجاب) لے آئیں یا آپ کے لیے سونے کا کوئی گھر ہو یا آپ (ہمارے سامنے) آسمان پر چڑھ جائیں۔ اور ہم (محض) آپ کے (آسمانوں پر) چڑھنے سے (بھی) ہرگز ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ آپ ہم پر کتاب نازل کریں، جس کو ہم پڑھیں، (اے رسول!) آپ کہہ دیجیے! (میں شعبدے باز نہیں ہوں) میرا رب پاک ہے، میں تو صرف ایک بشر ہوں، جس کو رسول بنایا گیا ہے''۔ (بنی اسرائیل:93-90)

الغرض قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں بیان کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں معجزے کے لیے ''آیۃ'' کا کلمہ آیا ہے، جس کے معنی ہیں: ''نشانی اور دلیل'' اور قرآن مجید کے ایک جملے کو بھی ''آیت'' کہتے ہیں، اس معنی کے اعتبار سے قرآن کریم کی 6236 آیاتِ مبارکہ ہیں اور ہر آیت ایک معجزہ ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کی شریعت محدود مدت کے لیے تھی، اس لیے ان کے معجزات بھی آج اپنی اصل شکل میں باقی نہیں ہیں اور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت چونکہ قیامت تک کے لیے ہے، اس لیے قرآن مجید کی صورت میں آپ کا معجزہ بھی

قیامت تک اپنی حقیقی صورت میں کسی تحریف اور تغیر کے بغیر زندہ وتابندہ رہے گا۔ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کی صفت جلیلہ ہے۔

معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن کریم کی اصطلاح میں ''اِسراء (رات کی سیر کرانا)'' کہتے ہیں اور یہ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیتِ مبارکہ کے کلمہ ''اَسریٰ بِعَبْدِہٖ'' سے ماخوذ ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں اسے ''معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کا عنوان دیا گیا ہے اور یہ حدیثِ مبارک کے کلمات ''ثُمَّ عُرِجَ بِیْ'' سے ماخوذ ہے، (یعنی پھر مجھے مسجد اقصیٰ سے بلندی کی طرف لے جایا گیا)''۔ ''معراج'' کے معنی ہیں: بلندی کی طرف جانے کا آلہ یا سیڑھی، جیسے آج کل ''Elevator'' ہے یا چاند تک یا خلائی سفر پر جانے کے لیے طاقت ور ''Rocket'' استعمال ہوتا ہے۔

بعض محدثینِ کرام نے اس بے مثال سفر کو تین مراحل میں تقسیم کیا ہے۔ ''اسراء'' مسجد حرام سے ''براق'' کے ذریعے مسجد اقصیٰ تک کا سفر، ''معراج'' مسجدِ اقصیٰ سے ''سِدْرَۃُ الْمُنْتَہیٰ'' تک کا سفر اور ''اِعراج'' سدرۃ المنتہیٰ سے لامکاں تک یعنی حضوری بارگاہِ ربُ العٰلمین تک کا سفر، جس کے لیے احادیث مبارک میں ''رَفْرَف'' کا نام بھی آیا ہے۔ مجموعی حیثیت سے اہلِ سیرت اور محدثینِ کرام اسے ''معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر قرآن مجید میں نہایت صراحت ووضاحت کے ساتھ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیتِ مبارکہ میں آیا ہے اور یہ مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک کے سفر اور اس کی حکمتوں کا بیان ہے، اس مرحلۂ معراج کا مُطلَق انکار کفر ہے، کیونکہ یہ براہِ راست قرآن کا انکار ہے۔ اور اس کے علاوہ ''سورۃ النجم'' کی ابتدائی اٹھارہ آیاتِ مبارکہ میں اشارات وکنایات کے ساتھ آسمانوں اور اُن سے ماوراء مشاہدۂ قدرت، آیاتِ کُبریٰ، قُربِ باری تعالیٰ اور براہِ راست وحیِ ربانی کا بیان ہے۔

معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واقعہ کتبِ احادیث میں ایک ترتیب کے ساتھ بیان نہیں ہوا

بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سفر کے مختلف مراحل کو مختلف مجالس میں بیان فرمایا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جس طرح سنا اُسے اپنی یادداشت میں محفوظ کرلیا۔ اُس دور میں واقعات کو تاریخی اور واقعاتی ترتیب کے ساتھ مرتب و مدوّن کرنے کا رواج بھی نہ تھا بلکہ اصل مقصد ابلاغ تھا کہ جو بات یا واقعہ رسالت مآب ﷺ کی زبان سے سنا ہے، اُسے لفظ بہ لفظ محفوظ کرلیا جائے اور اس کا ابلاغ ہوجائے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی حکمتِ مبارکہ کے تحت مختلف مواقع پر اسے بیان فرمایا، کیونکہ آپ کا بنیادی مقصد بھی ابلاغ اور ہدایت تھا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول یہ تھا کہ جو بات انہوں نے سنی اور جس طرح سنی اُسے بیان کردیا۔ معراج کی ایک حکمت خود قرآن نے بیان فرمادی:

''اور ہم نے جو مشاہدہ (شبِ معراج) آپ کو دکھایا تھا، وہ لوگوں کے لیے ایک آزمائش تھا (کہ کون کسی تردد کے بغیر تصدیق کرتا ہے اور کون اسے عقل کی میزان پر پرکھ کر رد کردیتا ہے)''۔ (بنی اسرائیل: 60)

واقعۂ معراج تیس سے زائد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور حدِ شہرت کو پہنچا ہوا ہے۔ میں نے تفسیر اور حدیث و سیرت کی کسی کتاب میں اس واقعے کا بیان اتنا مربوط نہیں دیکھا جتنا کہ عظیم مفسر و محدث علامہ غلام رسول سعیدی نے اپنی تفسیر تبیان القرآن، جلد: 6، ص: 615-643 اور شرح صحیح مسلم جلد اوّل صفحات 671 تا 778 میں تمام تر تفصیلات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ پورے واقعے کو انہوں نے تمام کتبِ احادیث کی روایات کو مربوط کرکے واقعاتی اور معنوی ترتیب کے ساتھ شرح صحیح مسلم، جلد: 1 صفحات 716 تا 732 میں بیان کیا ہے اور حدیث کی جس کتاب کا جو حصہ جہاں جہاں واقعاتی مناسبت کے ساتھ بیان کیا ہے، اسی مقام پر اصل ماخذ کے حوالہ جات بھی دے دیے ہیں اور ماشاء اللہ یہ ایک تفرّد و امتیاز ہے، جس کی سعادت سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بہرہ ور فرمایا ہے۔ اس علمی، تاریخی، فکری اور نظریاتی کاوش کی صحیح قدر دانی وہی صاحبانِ علم کرسکتے ہیں، جو تقابلی مطالعے کا ذوق رکھتے ہیں۔ باقی متعلقہ ابحاث ہیں، یعنی:

(۱) معراج کا جسمانی اور بیداری کی حالت میں ہونا اور اس کے دلائل

(۲) شقِ صدر کا واقعہ

(۳) رُویتِ باری تعالیٰ کے بارے میں مختلف موقف اور رُویت کے ترجیحی دلائل

(۴) نمازِ پنج گانہ کی فرضیت اور اس کی تفصیلی بحث

(۵) عہدِ صحابہ میں معراج کے مقام کے آغاز کے بارے میں مختلف اقوال اور ان میں تطبیق

(۶) بیت المقدس میں انبیائے کرام علیہم السلام کی امامت، قبر میں موسیٰ علیہ السلام کی زیارت، آسمانوں پر مختلف انبیائے کرام سے ملاقاتیں اور انبیائے کرام کا متعدد مقامات پر موجود ہونا۔

(۷) نمازوں میں تخفیف اور اس کی حکمت ودیگر مسائل اور بہت سی ایمان افروز مباحث سے جو عظمتِ مصطفیٰ اور محبتِ مصطفیٰ کے جذبات سے معمور ہیں اور ایک نادر شاہکار ہیں۔

(جاری ہے)

16 مئی 2014ء

❁

معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

آخری قسط

معراج کب ہوئی ؟...... اس کے بارے میں میں ایک سے زائد اقوال و روایات ہیں، لیکن روایات کا یہ اختلاف واقعہ کی حقانیت پر اثر انداز نہیں ہوتا، کیونکہ اصل مقصود واقعے کا حق ہونا اور اس کا بیان ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے تاریخ کا بیان ثابت نہیں ہے، کیونکہ یہ واقعیتِ معراج اور مقصدیتِ معراج کے لیے لازمی نہیں تھا، راویانِ حدیث نے اپنی اپنی یاداشت کے مطابق حوالہ دیا ہے، تاہم مشہور روایات کے مطابق یہ عظیم المرتبت اور بے مثال واقعہ ہجرتِ نبوی سے کم و بیش ڈیڑھ سال قبل 27 رجب المرجب کی شب کو وقوع پذیر ہوا۔

غلام احمد پرویز صاحب سرے سے کسی معراجِ جسمانی یا منامی (یعنی خواب کے عالم میں، جسے ''رؤیا'' کہتے ہیں) کے قائل نہیں ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل، آیت: 1 میں رات کے جس سفر یا سیر کا ذکر ہے، ان کے نزدیک اِس سے مراد سفرِ ہجرت ہے، جو رات کے وقت ہوا۔ اور ''مسجدِ اقصیٰ'' سے مراد مدینۂ منورہ ہے، جو اُس وقت ''یثرب'' کہلاتا تھا، حالانکہ اس وقت یثرب میں کوئی مسجد موجود ہی نہیں تھی۔

چنانچہ وہ ''سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ'' کے تحت لکھتے ہیں:

''مکہ کی سرزمین حضور (اور آپ کی جماعت) پر تنگ ہو چکی تھی، اس لیے آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی، جہاں کی فضا آپ کے مشن کے لیے وسیع اور کشادہ تھی۔ لیکن

ہمارا خیال ہے کہ یہ "سَمَا یَسْمَا" سے ہے اور "لَیْلًا" تاکید مزید کے لیے ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حضور ﷺ نے ہجرت رات کے وقت فرمائی تھی"۔ (لغات القرآن، ص: 872)

مزید لکھتے ہیں: "اَلْمَسْجِدِ الْاَقْصَا" بہت دور کی مسجد، عام طور پر اس سے مراد "بیت المقدس" لیا جاتا ہے، لیکن ہمارے نزدیک اس سے مراد مدینہ منورہ ہے، جو مکہ سے قریب تین سو میل دور ہے اور جس کی طرف نبی اکرم ﷺ رات کے وقت ہجرت کر کے تشریف لے گئے تھے اور جسے اب اس جماعت کی سجدہ گاہ بننا تھا، یعنی ان کے نظامِ اطاعت وفرماں پذیری کا مرکزی مقام"۔ (لغات القرآن، ص: 71-1370)

مولانا امین احسن اصلاحی بھی حالتِ بیداری میں معراجِ جسمانی کے قائل نہیں ہیں، بلکہ اسے "رُؤیا" (یعنی خواب) سے تعبیر کرتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے رُؤیا، "رُؤیائے صادقہ" ہوتے ہیں، جو "وحی" کی ایک صورت بھی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"رہا یہ سوال کہ یہ جو کچھ آپ کو دکھایا گیا، "رُؤیا" میں دکھایا گیا یا بیداری میں، تو اس سوال کا جواب اسی سورہ میں آگے قرآن نے خود دے دیا ہے، فرمایا ہے: وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ۔ اور ہم نے اس "رُؤیا" کو جو تمہیں دکھائی، لوگوں کے لیے فتنہ ہی بنادی۔ ظاہر ہے کہ یہاں جس "رُؤیا" کی طرف اشارہ ہے، اُس سے اِس "رُؤیا" کے سوا کوئی اور "رُؤیا" مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، جس کا ذکر آیتِ زیرِ بحث میں "لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا" کے الفاظ سے ہوا ہے۔ لفظ "اِرَاءَتْ" قرآن میں متعدد مقامات میں "رُؤیا" میں دکھانے کے لیے آیا بھی ہے اور مفسرین نے اس سے یہی "رُؤیا" مراد بھی لی ہے۔ اس وجہ سے اس کا "رُؤیا" ہونا تو اپنی جگہ پر واضح بھی ہے اور مُسلَّم بھی، لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ "رُؤیا" کو خواب کے معنی میں لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے، خواب، "خوابِ پریشان" بھی ہوتے ہیں، لیکن حضرات انبیائے علیہم السلام کو جو "رُؤیا" دکھائی جاتی ہے، وہ "رُؤیائے صادقہ" وحی الٰہی کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے

نبیوں اور رسولوں پر جس طرح فرشتے کے ذریعے سے کلام کی صورت میں اپنی وحی نازل فرماتا ہے، اسی طرح کبھی "رُؤیا" کی صورت میں بھی ان کی رہنمائی فرماتا ہے"۔

(تدبر قرآن، جلد:4،ص:475)

مشہور اسکالر جناب سرسید احمد خان بھی دیگر مُتجدِّدین کی طرح معجزات کے قائل نہیں ہیں اور وہ اُن کی ایسی تعبیر وتشریح کرتے ہیں جو عقل کے مطابق ہو یا بقول اُن کے قوانینِ فطرت کے مطابق ہو۔ چنانچہ سرسید احمد خان صاحب "معراج النبی ﷺ" پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ کا جسمانی طور پر رات کو بیت المقدس جانا اور وہاں سے ایک سیڑھی کے ذریعے آسمانوں پر جانا قانونِ فطرت کے خلاف ہے اور عقلاً محال ہے۔ اگر معراج النبی ﷺ کے راویوں کو ثقہ بھی مان لیا جائے، تو بھی کہا جائے گا کہ اُنہیں سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ یہ کہہ دینا کہ اللہ اِس پر قادر ہے، یہ جاہلوں اور مرفوع القلم لوگوں کا کام ہے، یعنی ایسے لوگ مجنون کے حکم میں ہیں، سچے مومن ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔ قانونِ فطرت کے مقابل کوئی دلیل قابلِ قبول نہیں ہے۔ ایسی تمام دلیلوں کو اُنہوں نے راوی کے سہو اور خطا، دوراز کار تاویلات، فرضی اور رکیک دلائل سے تعبیر کیا"۔

(تفسیر القرآن، جلد2،ص:123-122)

یہ سرسید احمد خان کی طویل عبارت کا خلاصہ ہے۔ اس سے آپ پر واضح ہوگیا کہ جناب سرسید احمد خاں کے نزدیک قانونِ فطرت اور عقل کے منافی مشہور روایات اور صحیح احادیث بھی قابلِ قبول نہیں، لہٰذا ایسی تمام روایات واحادیث رَدّ کردی جائیں گی۔ اِس کے برعکس ہر مسلمان کے نزدیک معیارِ حق وحی ربانی اور فرمانِ رسول ہے، نہ کہ قوانینِ فطرت اور عقلی اصول، ہم وحیِ ربانی کو ماورائے عقل کہہ سکتے ہیں، نہ کہ ضدِ عقل، وحی کو رَد کرنے کے مقابلے میں عقل کی نارسائی کا اعتراف بہتر شعار ہے۔ آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت ایسے اُمور وجود میں آرہے ہیں، جن کو آج سے چند سو سال پہلے کا انسان اِسی طرح

قوانینِ فطرت کے خلاف اور عقلی اعتبار سے محال تصور کرتا۔ آج ہم اپنی جسمانی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ انسانی علم اور ٹیکنالوجی کی طاقت سے ہوائی جہاز فضاؤں میں محوِ پرواز ہیں، ہزاروں سیٹلائٹ خلا میں مُعلق ہیں، انسانی ساختہ راکٹ کی طاقت سے خلائی شٹل چاند پر پہنچی اور واپس صحیح سالم اُتر آئی اور ابھی انسانیت کا یہ سفرِ ارتقا جاری ہے۔ اگر آج سے پانچ سو سال پہلے کے انسان کے سامنے کوئی اِس طرح کا دعویٰ کرتا، تو کیا اِسی طرح محالِ عقلی اور قانونِ فطرت کے خلاف قرار دے کر اُسے رَدنہ کر دیا جاتا، اسی لیے تو علامہ اقبال نے کہا تھا:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

یعنی واقعہ معراج نے انسان کے لیے بالائی فضاؤں اور خلاؤں میں کمندیں ڈالنے کے امکانات روشن کیے۔ اللہ تعالیٰ کی طاقت بلاشبہ انسان کی پیدا کردہ مادّی طاقت اور عقل کی رسائی سے لامحدود ہے، اِسی لیے تو غالب نے معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفعتوں کے بارے میں کہا تھا:

ہر کس بقدر خویش بجائے رسیدہ است
آں جا کہ جائے نیست، تو آنجا رسیدہ ای

امام احمد رضا قادری نے کہا تھا:

وہی لامکاں کے مکیں ہوئے، سرِ عرش تخت نشیں ہوئے
وہ نبی ہیں جن کے ہیں یہ مکاں، وہ خدا ہے جس کا مکاں نہیں

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''سدرۃ المنتہیٰ کیا ہے؟، انسانی فہم و ادراک کی سرحد کے اخیر پر ایک درخت۔ کیا اس کو شؤن وصفاتِ الٰہی کی نیرنگی نے ڈھانپ لیا؟، کیا انسانی فہم و ادراک کی اخیر سرحد کا درخت صرف شؤن وصفات کی نیرنگی کا مظہر ہے؟، کیا یہاں پہنچ کر کون و مکان اور وجوب

وامکان کا عقدۂ مشکل حل ہوگیا؟، کیا دل بھی دیکھتا ہے؟، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دل کی آنکھوں سے کیا دیکھا؟، دیدۂ چشم سے کیا نظر آیا؟، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سفر میں آیاتِ ربانی دکھائی گئیں، مگر یہ مشاہدۂ قلب تھا یا معائنۂ چشم؟، ع: رازِ این پردہ نہاں است و نہاں خواہد بود"۔ (سیرۃ النبی، جلد سوم، ص:268)

اِسی لیے تو بعض اہلِ نظر کہتے ہیں کہ معراج کے موقع پر زمان ومکان کی نبضیں رُک گئیں اور وجوب امکان کے فاصلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ کی قدرت سے سمٹ گئے۔ علامہ شبلی نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد یقیناً ملاحظہ فرمایا ہوگا:

"نگاہِ (مصطفیٰ) نے جو دیکھا، قلب (مصطفیٰ) نے اُس کی تکذیب نہیں کی (یعنی تصدیق کی)، کیا تم اُن سے اُس پر جھگڑ رہے ہو، جو اُنہوں نے دیکھا"۔ (النجم:12-11)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس دعویٔ معراج کے پہلے مخاطبین اہلِ مکہ تھے، وہ اہلِ زبان بھی تھے اور اُنہوں نے دعوے کی حقیقت کو جان بھی لیا تھا۔ اگر محض خواب میں کوئی مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ یا آسمانوں کی سیر کا دعویٰ کرے، تو اِس پر اتنی بحث وتمحیص کی نوبت ہی نہ آتی، آج بھی کوئی شخص عالمِ خواب میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب کی سیر کا دعویٰ کرسکتا ہے، اعتراض کا تو سبب ہی یہی تھا کہ اُنہوں نے اِس دعوے کو خواب پر محمول نہیں کیا، بلکہ عالمِ بیداری میں بظاہر ایک ناقابلِ یقین سفر کا دعویٰ سمجھا۔ اِسی لیے تو قرآن نے اِسے فتنہ قرار دیا، اِسے مومنینِ صادقین اور معاندین اور منکرین کو چھانٹ کر جدا کرنے کی کسوٹی بنادیا۔ کفارِ مکہ نے اِسے قوانینِ فطرت کے خلاف اور عقل کی ضد جانا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کسی تردُّد کے بغیر کہا:

"اگر یہ دعویٰ محمد رسول اللہ نے کیا ہے، تو میں اِس کی تصدیق کرتا ہوں، تم اِس ایک دعوے کے بارے میں مترددّ ہو، اُن کے پاس تو آئے دن جبریلِ امین وحیٔ ربانی لے کر آتے ہیں اور ہم اُس کی تصدیق کرتے ہیں"۔

17 مئی 2014ء

وقت کی ناقدری

آج غیر مسلم اقوام وممالک میں بعض اَقدار کی پاس داری ہے،ان میں سے ایک وقت کی پابندی ہے،لیکن مسلمان بد قسمتی سے اپنی اَقدار کو بھلا بیٹھے ہیں۔ ہمارا معاشرتی المیہ بن چکا ہے کہ تقریبات خواہ کسی نوعیت کی ہوں، نہ تو وقت پر شروع ہوتی ہیں اور نہ ہی وقت پر اختتام پذیر ہوتی ہیں۔نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگلے روز کی مصروفیات بھی متاثر ہوتی ہیں اور ذہنی واعصابی تھکاوٹ کے سبب صحت بھی رُو بہ زوال رہتی ہے۔وقت کی ہمارے ہاں کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ پوری قوم کے پاس صرف وقت ہی ایک ایسی ارزاں شے ہے، جسے ہم فراخ دلی سے ضائع کرتے ہیں۔

حدیث پاک میں ہے:رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو،جوانی کو بڑھاپے سے پہلے،تندرستی کو بیماری سے پہلے،مال داری کو محتاجی سے پہلے،فرصت کے لمحات کو مصروفیت سے پہلے اور اپنی زندگی کو موت سے پہلے (غنیمت جانو)''۔

(جامع الصغیر:1210،مستدرک:306/4)

ذرا غور کریں کہ اس قسم کی تقریبات میں جب بھی مدعو کیا جاتا ہے،تو داعی (Host) کی جانب سے مدعوئین (Guests) سے تحریری صورت میں یہ وعدہ ہوتا ہے کہ آپ فلاں وقت تشریف لائیں،انگریزی میں Sharp کا لفظ بھی تحریر ہوتا ہے،جس کے معنی ہیں:ٹھیک مقررہ وقت پر اور طے شدہ پروگرام کے مطابق یہ تقریب منعقد ہوگی،مہمانوں

کے استقبال اور طعام کا وقت بھی تحریر ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ دعوت نامہ ایک ایسا وعدہ ہوتا ہے، جو تقریب کا داعی بیک وقت درجنوں یا سینکڑوں مہمانوں سے کرتا ہے۔ پس تاخیر کی صورت میں یہ ایک وعدہ خلافی نہیں ہوتی بلکہ چونکہ ہر مہمان سے الگ الگ وعدہ ہوتا ہے، اس لیے ان کی مجموعی تعداد کے برابر یہ وعدہ خلافی ہوتی ہے اور اِسی اعتبار سے اس کی خلاف ورزی کا وبال بھی ہوگا۔

جبکہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام میں ایفائے عہد کی بہت تاکید کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ''اور وعدہ پورا کرو، بے شک وعدے کی بابت (آخرت میں ہر ایک سے) پوچھا جائے گا''۔(بنی اسرائیل:34)

اور فلاح یافتہ اہلِ ایمان کی صفاتِ حمیدہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

(۲) ''اور وہ جو اپنی امانتوں اور عہد کی (مکمل) پاسداری کرتے ہیں''۔(المؤمنون:8)

اسی طرح نیکی کے مرتبۂ کمال پر فائز اہلِ ایمان کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

(۳) ''اور (یہ) وہ لوگ ہیں جب وعدہ کرلیں تو (پھر) اپنے عہد کی پاس داری کرتے ہیں''۔(البقرۃ:177)

اسلام میں قول وفعل کا تضاد انتہائی معیوب بات ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(۱) ''اے ایمان والو! تم ایسی باتیں کیوں کہتے ہو، جن پر تم خود عمل نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ اس پر غضب ناک ہوتا ہے کہ تم ایسی بات کہو، جس پر تم خود عمل نہیں کرتے''۔(الصف:3-2)

یعنی قول وفعل کا تضاد اور دوغلا پن اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ علمائے یہود کی اسی روش کو ناپسند فرماتے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

(۲) ''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب (یعنی تورات) کی تلاوت کرتے ہو، تو کیا تم عقل نہیں رکھتے''۔(البقرۃ:44)

یعنی کتابِ الٰہی میں قول وفعل، کردار وگفتار کے تضاد اور دوغلے پن کی مذمت فرمائی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منافق کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا:

(۱) ''منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے، تو خیانت کرے''۔ (صحیح بخاری:33)

(۲) ''جس میں چار باتیں ہوں وہ خالص منافق ہے اور جس کے اندر ان میں سے کوئی ایک بات ہو تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے، یہاں تک کہ اسے چھوڑ دے:

(۱) جب اسے امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔

(۲) جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

(۳) جب معاہدہ کرے تو دھوکا دے۔

(۴) اور جب جھگڑے تو حد سے تجاوز کرے''۔ (صحیح بخاری:34)

اسی بے عملی، دروغ گوئی، تضاد بیانی اور قول وفعل کے تضاد کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ تقریبات میں وقت پر نہیں آتے اور وقت پر آنے والے کو سادہ لوح اور بے وقوف سمجھا جاتا ہے اور وقت کی پابندی نہ کرنے والے سمجھ دار قرار پاتے ہیں۔ ہمارا یہی طرزِ عمل مذہبی تقریبات میں بھی ہوتا ہے اور شاید ہی کوئی تقریب وقت پر شروع ہو پاتی ہو، الغرض وقت کی ناقدری ہمارا قومی شعار بن چکا ہے۔ بعض صورتوں میں رات گئے دیر تک بلکہ پچھلے پہر تک محافلِ نعت، میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سیرت النبی کے جلسے ہوتے ہیں اور اکثر لوگوں کی فجر کی نماز قضا ہو جاتی ہے۔ مستحبات پر عمل قابلِ تحسین، لیکن اگر اس کے سبب فرائض ترک ہو جائیں، تو کسی بھی صورت میں اس کی تحسین نہیں کی جاسکتی بلکہ یہ قابلِ ملامت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال ہوا کہ کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نماز کو اپنے مقررہ وقت پر ادا کرنا''۔ (صحیح بخاری:527)

ترکِ نماز پر تو قرآن وحدیث میں بڑی وعیدیں ہیں۔ نماز میں تساہل کو بھی منافقوں کا

شعار قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) ''بے شک منافق (اپنے زعم میں) اللہ کو دھوکا دے رہے ہیں، دراں حالیکہ اللہ ان کو ان کے دھوکے کی سزا دینے والا ہے اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، تو سستی سے کھڑے ہوتے ہیں، (محض) لوگوں کو دکھانے کے لیے اور اللہ کا ذکر بہت ہی کم کرتے ہیں''۔ (النساء:142)

(۲) ''سو ان نمازیوں کے لیے افسوس ہے، جو اپنی نمازوں سے غفلت کرتے ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں''۔ (الماعون:6-5)

یہی صورتِ حال ہمارے تعلیمی اداروں، دفاتر اور دیگر شعبوں کی ہے۔ ہماری پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس، جن پر قومی خزانے سے کروڑوں روپے خرچ ہوتے ہیں، اکثر وقت پر شروع نہیں ہو پاتے اور ارکان کی حاضری کا تناسب بھی شرم ناک حد تک کم ہوتا ہے۔ سنجیدہ قانون سازی کی بجائے اکثر بے مقصد بحثوں، واک آؤٹ اور شور شرابے پر اجلاس برخاست ہو جاتے ہیں۔

خاص طور پر بڑے شہروں میں وقت کے ضیاع کی ایک صورت ٹریفک کا بے ہنگم انداز میں چلنا ہے۔ اپنی طرف سے تو ہر ایک دوسروں کا حق مار کر پہلے نکلنا چاہتا ہے، اس تگ ودَو میں ٹریفک کی لائنیں ٹوٹ جاتی ہیں، ٹریفک پھنس جاتی ہے اور روانی موقوف ہو جاتی ہے، جس کے نتیجے میں سینکڑوں لوگوں کے وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ ٹریفک کو کنٹرول کرنے کا عملہ بعض بااثر لوگوں کی وجہ سے خوفزدہ رہتا ہے اور کسی کو روکنے ٹوکنے کی جرأت وہ نہیں کر پاتے۔ اس کا حل یہی ہے کہ ہم میں خود حقوقِ انسانی کی پاس داری کا جذبہ پیدا ہو اور ایثار سے کام لیں۔

ہمارے ہاں بجلی کا شدید بحران ہے، مگر ہم کسی سنجیدہ مصروفیت کے بغیر راتوں کو دیر تک جاگتے ہیں اور صبح دیر سے اٹھتے ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(۱) ''ہم نے رات کو لباس (ستر پوشی) کے لیے اور دن کو (کسبِ) معاش کے لیے بنایا

ہے''۔(النبا:۱۱۔۱۰)

(۲)''وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تا کہ تم اس میں سکون پاؤ اور دن کو روشن بنایا(تا کہ تم اس میں کسب معاش کرو)''۔(یونس:۶۷)

ترقی یافتہ ممالک میں بازار اور مارکیٹیں سرِشام بند ہوجاتی ہیں اور صبح معمول کے مطابق کھل جاتی ہیں، سوائے 7/11 یا 24/7 والی مخصوص دکانوں اور مارکیٹوں کے، جن کے پاس 24 گھنٹے کاروبار جاری رکھنے کا اجازت نامہ ہوتا ہے۔ ہماری کئی حکومتوں نے چاہا کہ آٹھ یا 9 بجے شب تک بازار اور مارکیٹیں بند ہوجائیں، لیکن تاجر حضرات کسی بھی طور پر اپنے معمولات بدلنے پر تیار نہیں ہیں۔ یہی صورتِ حال ہمارے خدمات فراہم کرنے والے اداروں ریلوے اور پی آئی اے وغیرہ کی ہے۔ اگرچہ ہمارے پورے نظام کو سسٹم میں لانے اور اُوور ہالنگ کی اَشد ضرورت ہے، لیکن ہمارے زمینی حقائق اور قومی مزاج قومی مفاد سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ دنیا کی تمام ترقی یافتہ قوموں کے عروج کا راز وقت کی قدردانی اور بہترین استعمال کے سبب ہے۔

اہلِ دین اور علمائے کرام سے لوگ بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ رول ماڈل بنیں۔ اس لیے آئے دن اخباری کالم نگار بھی علماء کو کوستے رہتے ہیں کہ انہیں عوام کے مسائل کا کوئی اِدراک نہیں ہے اور زمینی حقائق سے نابلد ہیں۔ وہ یہ بھی شکایت کرتے ہیں کہ علما اپنے خطبات میں سماجی برائیاں اور استحصالی طبقات کے خلاف نہیں بولتے، کیونکہ ان کے خیال میں یہ ان کے زیرِ بارِ احسان اور نمک خوار ہیں۔ ان کا علماء سے ایک شکوہ یا علماء پر طعن یہ ہوتا ہے کہ انہیں ''مائیک فوبیا'' ہے، یہ لاؤڈ اسپیکر کی جان نہیں چھوڑتے۔ خاص طور جمعہ یا عیدین کی نماز بروقت کھڑی نہیں کی جاتی، یہ شکوے اور شکایتیں کافی حد تک بجا ہیں۔ کسی انتہائی ناگزیر صورتِ حال کے سوا ہر صورت میں جماعت مقررہ وقت پر کھڑی ہونی چاہیے۔

حدیثِ پاک کی رو سے جس فرض نماز کے بعد سنتیں ادا کرنی ہوتی ہیں، اس کی دعا

مختصر ہونی چاہیے۔ اسی طرح بعض اوقات ہماری مذہبی تقریبات یا جلسے ہو رہے ہوتے ہیں، تو جلسے کی کارروائی کا تسلسل برقرار رکھنے کے لیے فرض نماز کی جماعت کو مقررہ وقت سے مؤخر کر دیا جاتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ مشروع وقت میں اس کی گنجائش ہوتی ہے، لیکن عوام پر اس کا اثر منفی مرتب ہوتا ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ جلسے میں اذان کے وقت وقفہ کر دیا جائے اور نمازِ باجماعت کے بعد جلسے کی کارروائی کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا ہو، وہیں سے شروع کر دیا جائے۔ الغرض وقت کی پابندی، دعوتِ دین کی حکمت کا تقاضا ہے اور اس سے صَرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے۔

20 مئی 2014ء

قانونِ فطرت

قانونِ فطرت سے مراد سبب اور مُسَبَّب، علّت اور معلول کا وہ مربوط نظام ہے، جس کے تحت اشیاء پیدا ہوتی ہیں، ارتقاء پاتی ہیں اور فنا ہوتی ہیں، انگریزی میں اسے Cause & Effect سے تعبیر کرتے ہیں، بعض اوقات قدرت کو بھی فطرت کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، حالانکہ قدرت کا حقیقی معنی فطرت سے مختلف ہے۔ "قانونِ فطرت" کو ہم قدرت کا "تکوینی نظام" بھی کہہ سکتے ہیں۔

معروف اسکالر جناب سر سید احمد خان "قانونِ فطرت" کو حاکم، فائق، غیر مُتَبَدِّل (Unchangeable) قرار دیتے ہیں، یعنی قوانینِ فطرت میں تبدیلی ممکن نہیں ہے اور اسی اصول کے تحت وہ انبیائے کرام علیہم السلام کے ان تمام معجزات کی، جو "قوانینِ فطرت" کے مطابق نہیں ہیں، دور از کار تاویلات کرتے ہیں اور اُمّت میں توارث و تواتر کے ساتھ ان کا جو مفہوم یا تعبیر چلی آرہی ہے اس کو یکسر رد کر دیتے ہیں، یعنی قوانینِ فطرت تو بدل نہیں سکتے، لہٰذا جو عقیدہ، نظریہ اور اصول، خواہ وہ قرآن و سنت کے دلائلِ قطعیہ صحیحہ سے بھی ثابت ہو، اگر وہ قوانینِ فطرت کے خلاف ہے، تو اُسے رَدّ کر دیا جائے گا، اسی بنا پر انہوں نے "معراجِ جسمانی" کا انکار کیا اور لکھا:

"معراج کے متعلق جس قدر حدیثیں ہیں، اُن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا بجسدہٖ جبریل کا ہاتھ پکڑ کر خواہ براق پر سوار ہو کر یا پرند جانور کے گھونسلے میں بیٹھ کر جو درخت میں لٹکا ہوا تھا، بیت المقدس تک جانا اور وہاں سے بجسدہٖ آسمانوں پر تشریف لے جانا یا بذریعہ ایک

سیڑھی کے، جو آسمانوں تک لگی ہوئی تھی، چڑھ جانا، خلافِ قانونِ فطرت ہے اور اس لیے مُمتنعاتِ عقلی (محالِ عقلی) میں داخل ہے۔ اگر ہم اُن کے راویوں کو ثقہ اور معتبر تصور کر لیں تو بھی یہ قرار پائے گا کہ اُن کو اصل مطلب کے سمجھنے اور بیان کرنے میں غلطی ہوئی، مگر اُس واقعہ کی صحت تسلیم نہیں ہو سکنے کی، اس لیے کہ ایسا ہونا ممتنعاتِ عقلی میں سے ہے۔ اور یہ کہہ دینا کہ خدا میں سب قدرت ہے، اُس نے ایسا ہی کر دیا ہوگا، جُہّال اور نا سمجھ بلکہ مرفوع القلم (یعنی دیوانے) لوگوں کا کام ہے، نہ ان کا، جو دل سے اسلام پر یقین کرتے ہیں اور دوسروں کو اِس مقام پر یقین دلانا اور ''اعلائے کلمۃ اللہ'' چاہتے ہیں۔

واقعات خلافِ قانونِ فطرت کے وقوع کا ثبوت اگر گواہانِ رُؤیت بھی گواہی دیں تو مُحالات سے ہے، اس لیے کہ اُس وقت دو دلیلیں جو ایک ہی حیثیت پر مبنی ہیں، سامنے ہوتی ہیں: ایک قانونِ فطرت، جو ہزاروں لاکھوں تجربوں سے جِیْلًا بعدَ جیلٍ (یعنی نسل در نسل) وزمانًا بعدَ زمانٍ (یعنی ہر زمانے میں) ثابت ہے اور ایک گواہانِ رُؤیت، جن کا عادل ہونا بھی تجربہ سے ثابت ہوا ہے۔ پس اس کا تصفیہ کرنا ہوتا ہے کہ دونوں تجربوں میں کون سا تجربہ ترجیح کے قابل ہے: قانونِ فطرت کو غلط سمجھنا یا راوی کی سمجھ اور بیان میں سہو و غلطی کا ہونا۔ کوئی ذی عقل تو قانونِ فطرت پر راوی کے بیان کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ قولِ پیغمبر بلا حجت قابلِ تسلیم ہے، مگر کلام تو اسی میں ہے کہ قولِ پیغمبر ہے یا نہیں۔

اب ہم غور کرتے ہیں احادیثِ معراج پر، جن میں صاف پایا جاتا ہے کہ وہ ایک واقعہ ہے جو سوتے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تھا اور دلالت النّص سے بھی پایا جاتا ہے اور صحاح کی کسی حدیث سے نہیں پایا جاتا کہ حالتِ بیداری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا اور بجسدہٖ آپ بیت المقدس اور آسمانوں پر تشریف لے گئے، بلکہ برخلاف اس کے چند حدیثوں میں سونے کی حالت پائی جاتی ہے، تو ہمارا اور ہر ذی عقل کا بلکہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اُس کو ایک واقعہ خواب کا تسلیم کرے اور ابن رُشد کے قول کو صحیح سمجھے کہ اگر نقل میں کوئی بات خلافِ عقل معلوم ہوتی ہے، تو خود نقل اور اُس کے مَاسَبَقَ وَمَالَحِقَ (یعنی سیاق و سباق،

Context) پر غور کرنے سے وہ مخالفت دور ہو جاتی ہے نہ یہ کہ تاویل بعیدہ اور رکیکہ (یعنی ناقابلِ یقین اور کمزور تاویلات) اور دلائل فرضی دوراز کار سے اُس کو ایسا واقعہ بنا دے، جو حقیقت کے بھی ایسا ہی مخالف ہو جیسا کہ عقل، کے اور مذہب اسلام کی مستحکم بنیاد کو توڑ کر ریت پر بلکہ پانی پر اُس کی بنیاد رکھے''۔ (تفسیر القرآن، جلد:2، ص:123-122)

اپنے اسی اصول کے تحت جناب سر سید احمد خان نے قرآن کریم میں بیان کردہ ''کلمات اللہ'' اور ''سنت اللہ'' کے کلمات کو قانونِ فطرت قرار دیا ہے، حالانکہ قرآن مجید میں یونس: 64، الاحزاب: 62 اور بنی اسرائیل: 77 میں ان کا سیاق و سباق بالکل مختلف ہے۔ اپنے اسی اصول کے تحت وہ معجزاتِ انبیاء کا انکار کرتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ان تمام سندوں سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح کے زمانہ کے سب لوگ اور خود حواری بھی جانتے تھے اور یقین کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے باپ یوسف کے تخم سے پیدا ہوئے ہیں نہ کہ بغیر باپ کے، مگر وہ حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا روحانی اعتبار سے کہتے تھے اسی خیال سے جس سے کہ یونانی اپنے ہاں کے بزرگوں کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، وہ مزید لکھتے ہیں: قرآن میں کہیں نہیں بیان ہوا کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے''۔

(تفسیر القرآن جلد:2، ص:25-24)

ان کا حوصلہ اس قدر بڑھا کہ اللہ کی قدرت کو بھی ''قانونِ فطرت'' کے تابع قرار دے دیا، چنانچہ انہوں نے لکھا: ''لفظ ''كُنْ فَيَكُوْنُ'' جو سورۂ آل عمران میں ہے، وہ کسی امر کے ہونے پر بلا اسباب قدرتی و فطرتی کے دلالت نہیں کرتا، کیونکہ ہر شئے کے ہونے کو خدا اسی طرح فرماتا ہے ''اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ'' پس ہر شئے ''کُنْ'' کے حکم سے ہمیشہ قانون قدرت اور قاعدہ فطرت کے مطابق ہوتی ہے، پس یہ الفاظ کسی طرح اس بات پر کہ حضرت مسیح کی ولادت فی الفور بلا قاعدہ فطرت اور بغیر باپ کے ہوئی تھی دلالت نہیں کرتے''۔ (تفسیر القرآن، جلد:2، ص:28)

اس کے واضح معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ بھی قانونِ قدرت کے تابع

ہے۔وہ قرآن کو بھی ''انسانی کلام'' کے مثل تصور کرتے ہیں،وہ لکھتے ہیں:

''قرآن مجید بلاشبہ کلام اللہ ہے،مگر انسانوں کی زبان اور انسانوں کے کلام کے طرز پر،پس اس کلام کو مثل ایک انسان کے کلام کے تصور کرنا چاہیے اور اس سے معانی ومطالب واحکام ومقاصد اخذ کرنے اور اس سے دلیلیں قائم کرنے میں اس کو انسان کے کلام سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں دینا چاہیے''۔(تفسیر القرآن،جلد:1،ص:122)

ہم قدرت کے تکوینی نظام میں قانونِ قدرت کو موثر مانتے ہیں،لیکن جمہورِ اُمت کا اجماعی عقیدہ یہ ہے کہ قادرِ مطلق قانونِ قدرت کا اور فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا) قانونِ فطرت کا پابند نہیں ہے۔وہ جب چاہتا ہے قوانینِ فطرت کے برخلاف اور اس سے ماوراء اپنی قدرت کا ظہور فرما دیتا ہے اور اپنے ارادے اور مشیت کو نافذ کر دیتا ہے اور معجزاتِ انبیائے کرام علیہم السلام اسی کا مظہر ہیں،مثلاً: عامِ قانونِ قدرت یہ ہے کہ ماں باپ یا مرد وزن کے اختلاط سے نسل انسانی کے توالد وتناسل کی سنتِ الٰہیہ جاری وساری ہے،لیکن اس نے حضرت حوا کو کسی عورت کے واسطے کے بغیر،حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو کسی مرد کے واسطے کے بغیر اور حضرت آدم علیہ السلام کو دونوں واسطوں کے بغیر پیدا کر کے یہ بتادیا اس کی قدرت اسباب وعلل اور قوانینِ فطرت کی محتاج نہیں ہے،بلکہ قوانینِ فطرت اس کی مشیت کے تابع ہیں،وہ قوانینِ فطرت کا خالق ہے مگر قوانینِ فطرت کا پابند نہیں ہے،ورنہ اس کا مجبور ہونا لازم آئے گا اور جو مجبور ہو وہ خدا نہیں ہوسکتا،چنانچہ ارشاد فرمایا:''بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی طرح ہے،اس کو مٹی سے بنایا،پھر اس سے فرمایا ہو جا،سو وہ ہوگیا''۔(آل عمران:59)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ وہ زمانہ ہے جب سرسید مرحوم مغربی نظریات سے مرعوبیت کے سبب قرآنِ مجید کی من مانی تاویلات کر رہے تھے اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جو انگریزوں اور انگریزوں کے لائے افکار ونظریات سے مرعوب تھا،بُری طرح ان من مانی تاویلات کا شکار ہو رہا تھا''۔

نیز وہ لکھتے ہیں:

''غالباً اسی زمانہ میں سرسید مرحوم کی تفسیرِ قرآن کا عربی زبان میں ترجمہ کرانے کا خیال پیدا ہوا اور اس کام کے لیے لوگوں کی نظرِ انتخاب مولانا حمید الدین فراہی پر پڑی، لیکن جب مولانا کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی، تو مولانا نے فرمایا: ''میں اس اشاعتِ معصیت میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہتا''۔ (مجموعۂ تفاسیرِ فراہی، ص: 11 اور 13)

''معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' کے موضوع پر کالم لکھتے ہوئے جب میں نے جناب سرسید احمد خان کے مذہبی افکار کا مطالعہ کیا تو پتا چلا کہ وہ نہ صرف یہ کہ معجزات کے منکر ہیں، بلکہ امت کے مسلّمہ عقائد ونظریات سے کافی حد تک منحرف ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام اور اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں میں انگریزی اور جدید علوم کے فروغ کے حوالے سے انہوں نے جو کام کیا، وہ قابلِ تحسین ہے اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں میں ایسی افرادی قوت تیار ہوئی جو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق نظام کو چلانے کے قابل بنی، لیکن ہر شخص کا حسن وقبح اور خوبی وخامی اپنی اپنی جگہ ہوتی ہے، نہ کوئی خیرِ کل ہوتا ہے اور نہ شرِ محض، وقت کی میزان سب کا مقام خود متعین کر دیتی ہے۔

22 مئی 2014ء

ضیاء الرحمٰن کا سانحۂ ارتحال

(قسطِ اوّل)

میرے اکلوتے فرزند ضیاء الرحمٰن کا منگل :20 مئی 2014ء کو 36 سال کی عمر میں تقریباً نو بجے شب قضائے الٰہی سے وصال ہو گیا۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ)۔ وہ سرطان (Cancer) کے عارضے میں مبتلا تھے۔ کینسر ایک خطرناک اور مُہلک بیماری ہے۔ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ سب کو اس بیماری سے اپنی عافیت، سلامتی اور حفظ و امان عطا فرمائے۔ طبی زبان میں کینسر کو Tumour (وَرَم یا رَسولی) کہتے ہیں۔ اس میں گوشت گٹھلی کی شکل اختیار کرتا ہے اور پھر بڑھتا جاتا ہے، اسے کاٹ کر پھینک بھی دیں، تو پھر نشو و نما پالیتا ہے اور بتدریج پھیلتے پھیلتے جان لے لیتا ہے، تاوقتیکہ اس کو جڑ سے کاٹ کر پھینک دیا جائے۔ مرض کے پہلے یا دوسرے مرحلے میں اِس سے نجات ممکن ہے، تیسرے درجے میں مشکل ترین اور چوتھے درجے میں عملاً ناممکن۔

جب یہ Tumour انسانی وجود کے کسی داخلی حصے یا خُلیے (Cell) میں تشکیل پانا شروع ہوتا ہے، تو بروقت اس کی تشخیص نہیں ہو پاتی، تاوقتیکہ انسانی وجود کے داخلی نظام کے کسی حصے کو وہ بلاک کردے یا مفلوج کردے یا ناقابلِ کار اور ناقابلِ اصلاح بنادے، وہیں سے مشکلات کا آغاز ہوتا ہے۔ میرے بیٹے کا ٹیومر بڑی آنت میں تشکیل پایا اور بتدریج بڑھتے بڑھتے پانچ سینٹی میٹر تک پھیل گیا اور چھوٹی آنت کے راستے کو بلاک کر دیا۔ یہ تشخیص مارچ 2012ء میں ممکن ہو سکی۔

اس کے بعد آغا خان ہاسپٹل میں معروف سرجن ڈاکٹر انعام پال صاحب نے ان کا بڑا آپریشن کیا، پھر سینئر انکالوجسٹ ڈاکٹر نہال مسعود صاحب نے کیموتھراپی کے 12 دورانیے (Cycle) مکمل کیے۔ اس مرحلے پر ڈاکٹر صاحبان نے کہا کہ ہم اسے ساٹھ فیصد کامیاب قرار دے سکتے ہیں، مگر بیماری کے لوٹ آنے کے چالیس فیصد امکانات اب بھی موجود ہیں۔ کیموتھراپی کے بارے میں عرض کرتا چلوں کہ اسے آپ Antibiotic کی Highest Potency یا زہر بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ رگوں (Vein) میں انجکٹ ہوتی ہے اور اس کے Side Effects یعنی ضمنی اثرات بھی ہوتے ہیں۔ یہ خون کے White Cells کو ختم کرتی ہے، جو امراض کے مقابلے کے لیے انسانی جسم کے اندر قدرتی مدافعتی نظام ہے۔ اسی لیے کیموتھراپی لگانے سے پہلے مریض یا اس کے وارث سے تحریر لی جاتی ہے کہ اس کے ضمنی وذیلی اثرات مرتب ہوسکتے ہیں اور خدانخواستہ موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔ اگر یہ خوش قسمتی سے جاکر اصل نشانے پر لگے، مرض کو جڑ سے ختم کرکے مطلوبہ نتیجہ دے دے، تو اسے اللہ تعالیٰ کا کرمِ خاص اور انعام سمجھنا چاہیے، سو یہ بھی ایک امکانی حیلہ وتدبیر اور سبب ہے، مگر سو فیصد اور قطعی طور پر نتیجہ خیز ہونے کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ چنانچہ ہم مسلسل ماہ بہ ماہ ٹیسٹ کراتے رہے، ڈاکٹر صاحبان کے ساتھ رابطے میں رہے، مختصر وقفوں سے سی ٹی اسکین بھی کراتے رہے، آخرِ کار اکتوبر 2013ء میں سی ٹی اسکین کے ذریعے یہ رپورٹ ملی کہ مرض دوبارہ لوٹ آیا ہے۔

اس تجربے سے گزر کر ہمیں پتا چلا کہ ہمارے وطنِ عزیز میں ایسی پیچیدہ امراض کا علاج نہایت مشکل ہے اور اتنا مہنگا ہے کہ مڈل کلاس کی پہنچ سے بہت دور ہے اور لوگ اذیتیں برداشت کرتے کرتے اور ایڑھیاں رگڑتے رگڑتے جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ مہنگی دوائیں، ہاسپٹل کے چارجز، ڈاکٹر صاحبان کی فیس اور مختلف طرح کے میڈیکل ٹیسٹ، ایکسریز اور سی ٹی اسکین وغیرہ سب بے انتہا مہنگے اور عام آدمی کی قوتِ خرید سے ماورا ہوتے ہیں۔ یہاں آکر وہ مرحلہ آتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت،

نعمت حیات کو بار سمجھنے لگتا ہے اور اُس سے نجات پانے کی دعا مانگتا ہے، حالانکہ حدیثِ مبارک میں اس کی ممانعت ہے۔ دوسروں پر بوجھ بننے کا احساس بھی دل میں اجاگر ہوتا ہے اور ایک طرح کی مایوسی اور پژمردگی (Depression) مستقل طور پر چھا جاتی ہے۔ جبکہ مہلک اَمراض، حادثات وسانحات اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے انسان کو حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن جب وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ جائے، تو ایک طرح سے زندگی ہار جاتا ہے، باقی سب اللہ تعالیٰ کی حکمتیں، تقدیر اور قضا ہے، جس پر راضی رہنا ہر مومن کا شِعار ہونا چاہیے۔

اس کے بعد ہم نے ایس آئی یو ٹی میں انکالوجسٹ جناب ڈاکٹر نجیب نعمت اللہ صاحب سے رابطہ کیا۔ ڈاکٹر ادیب رضوی صاحب اور ان کی پوری ٹیم نے بے انتہا محبتوں اور ہمدردی سے نوازا۔ سنگاپور سے ایک Biopsy کرائی، بیاپسی سے مراد جسم کے متاثرہ حصے کے بافتوں (Tissues) کا تجزیہ کرنا ہے۔ بافتے سے مراد انسانی گوشت کے لوتھڑوں کی بُنت، تانے بانے یا ساخت کے باریک اجزا ہیں، جسے عربی میں نسیج کہتے ہیں۔ اس بیاپسی کے نتیجے میں کیموتھراپی کی Aflebercept نامی دوا تجویز ہوئی، جو پاکستان میں ممنوع ہے۔ چنانچہ ایک میڈیکل بورڈ نے اپنی سفارش کے ذریعے اسے مریض کے لیے ضروری قرار دیا، پھر نیشنل ڈرگ کنٹرول اتھارٹی پاکستان کی جانب سے اسے درآمد کرنے کا خصوصی اجازت نامہ فارماسیوٹیکل کمپنی Aventis کے لیے جاری ہوا اور اس کمپنی کے جناب عبدالسمیع نے اسے سعیِ بسیار کے بعد امریکا سے درآمد کرکے دیا۔ اس کے دو دورانیے ہی ہوسکے۔ اس کے بعد مزید پیچیدگیوں کی وجہ سے اس کے مزید دورانیے مکمل نہ کیے جاسکے۔

آنتوں کے جکڑاؤ کے سبب انتقال سے پہلے چار ماہ تک ضیاء الرحمٰن کو منہ سے کوئی ٹھوس یا مائع غذا نہ دی جاسکی۔ صرف ڈرپ کے ذریعے رگوں (Vein) میں تحلیل شدہ سیّال (Liquid) غذا ہی داخل کی جاسکی۔ اِن تکلیف دہ مراحل سے گزرنے والوں کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نمونہ بھی ہے اور آپ کی بشارت تسکین کا سامان بنتی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ''میں نے (مرضِ وفات) میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے بڑھ کر کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھا''۔(صحیح بخاری:5646)'

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''جب اللہ تعالیٰ اپنی تقدیر میں اپنے کسی بندے کے لیے ایک بلند مرتبہ مقدر فرمادیتا ہے، پھر وہ اپنے اعمالِ خیر کے ذریعے اس کا حق دار قرار نہیں پاتا، تو اللہ تعالیٰ اُسے کسی جسمانی یا مالی یا اولاد کی آزمائش میں مبتلا فرمادیتا ہے، پھر وہ اس پر صبر کرتا ہے یہاں تک کہ (اس صبر پر اجر کا حق دار بن کر) اللہ تعالیٰ کے مقدر کیے ہوئے مرتبے کو پالیتا ہے''۔

(مسند احمد:22338)'

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ''ایک خاتون رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی: مجھے مرگی کی بیماری ہے، آپ دعا فرمایئے کہ مجھے اس سے شفا مل جائے۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اگر تم چاہو تو صبر کرلو اور (اس صبر پر اجر کے طور پر) تمہارے لیے جنت ہے اور اگر چاہو تو میں اللہ سے دعا کروں کہ وہ تمہیں شفا عطا فرمائے۔ پس اُس (صاحبِ عزیمت صحابیہ) نے عرض کی: میں (آپ کی جانب سے جنت کی بشارت پانے پر) صبر کروں گی، (البتہ) اس نے عرض کی: (مرگی کے دورے کے دوران) میرا ستر کھل جاتا ہے، آپ دعا فرمایئے کہ میرا ستر قائم رہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کے لیے ستر قائم رہنے کی دعا فرمائی۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباس فرمایا کرتے تھے کوئی کسی جنتی کو دیکھنا چاہے تو اس عورت کو دیکھے، (صحیح بخاری:5652)''۔

حضرت اُمِ سَلَمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''مسلمان کو جب بھی کوئی مصیبت پہنچتی ہے، تو وہ اللہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کہتا ہے: ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ''، (پھر دعا کرتا ہے) اے اللہ میری اس مصیبت پر اجر عطا فرما اور اس کے بدلے میں بہتر نعمت عطا فرما، تو اللہ تعالیٰ اسے بہتر بدل عطا فرماتا ہے۔ لیکن پھر جب ان کے شوہر ابوسلمہ کا انتقال ہوا، تو ان کے دل میں یہ خیال آرہا تھا کہ ابوسلمہ سے بہتر مسلمان

کون ہوگا؟۔ یہ تو پہلا گھرانا ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کی۔ اُمِ سلمہ بیان کرتی ہیں کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کے مطابق یہ دعا پڑھ لی، بعدازاں اللہ تعالیٰ نے مجھے رسول اللہ ﷺ کی زوجیت کے شرف سے نوازا''۔ (مسلم:2091)

رسول اللہ ﷺ کے ایک نواسے کا انتقال ہوا تو ان کی صاحبزادی نے آپ ﷺ کو اپنے ہاں آنے کی التجا کی تو حضور ﷺ تشریف لائے اور ان کو یہ کلمات ارشاد فرمائے:

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ، لِلّٰہِ مَا اَخَذَ وَلَہٗ مَا اَعۡطٰی، وَکُلُّ شَیۡءٍ عِنۡدَہٗ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی، فَلۡتَصۡبِرۡ وَالۡتَحۡتَسِبۡ۔

(یعنی بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور یقیناً ہمیں (آخرِ کار) اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، اللہ نے جو لے لیا وہ (درحقیقت) اسی کی عطا تھی اور ہر چیز کے لیے اس کے پاس ایک وقت مقرر ہے، پس صبر کرو اور اللہ سے اجر کی امید رکھو''۔ (ابن ماجہ:1588)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کے رضاعی باپ ابوسیف علی القین کے گھر داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے انہیں اپنے ہاتھوں میں اٹھایا، انہیں بوسہ دیا اور سونگھا۔ اس کے بعد ہم پھر ان کے پاس گئے، تو اس وقت حضرت ابراہیم کی روح پرواز کر رہی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آپ ﷺ سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! آپ بھی رو رہے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابن عوف! یہ آنسو رحمت ہیں، پھر آپ کے (اور) آنسو بہے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک آنکھ روتی ہے اور دل غمگین ہوتا ہے اور ہم صرف وہی بات کہتے ہیں کہ جس سے ہمارا رب راضی ہو، اے ابراہیم! ہم تمہاری جدائی پر غمگین ہیں''۔ (صحیح بخاری:1303)

حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں:

(۱): ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو وصال کے لمحات میں دیکھا۔ آپ ﷺ کے پاس

چمڑے یا لکڑی کے ایک برتن میں پانی تھا، آپ اس برتن میں ہاتھ ڈالتے اور پھر اپنا تر ہاتھ اپنے چہرۂ مبارک پر ملتے اور یہ دعا فرماتے:

اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی سَکَرَاتِ الْمَوْتِ

ترجمہ: اے اللہ! سکراتِ موت کی سختیوں کو آسان کرنے میں میری مدد فرما۔

فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی

(یعنی رفیقِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے حضور)۔ پھر آپ کی روح قبض کر لی گئی اور آپ کا ہاتھ نیچے گر گیا''۔ (صحیح بخاری: 6510، ابن ماجہ: 1623)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور موت کی سختی حق کے ساتھ آ پہنچی، یہی وہ چیز ہے جس سے تو کنارہ کشی کرتا تھا، (قٓ: 19)''۔ (جاری ہے)

30 مئی 2014ء

ضیاء الرحمٰن کا سانحۂ ارتحال

(آخری قسط)

میرے فرزند ضیاء الرحمٰن نے ڈھائی سال تکلیف میں گزارے اور ہمارا سارا خاندان اس دوران کرب کے لمحات سے گزرتا رہا۔ زندگی کے آخری مراحل پر ڈاکٹر ادیب رضوی صاحب کی قیادت میں SIUT کی ٹیم نے بہت خیال رکھا، میں نے اُن کے پورے عملے کو جذبۂ خدمت سے سرشار پایا، ان کے سارے عملے کو اوقاتِ کار کے دوران کبھی آرام کرتے اور Relax ہوتے نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر الطاف ہاشمی صاحب، ڈاکٹر نجیب نعمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر بابر ملک صاحب اور ان کے پیرا میڈیکل اسٹاف کو ہمدردی میں ڈھلا ہوا پایا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کے انسانی خدمت کے اس بے لوث جذبے کو قبول فرمائے اور دوسروں کو اس کی تقلید کی سعادت نصیب فرمائے۔

ایک دن میں سہ پہر ڈاکٹر نجیب نعمت اللہ صاحب سے ملنے گیا، تو وہاں ڈاکٹر ادیب رضوی صاحب تھے اور کھڑے کھڑے بر گر کھا رہے تھے، شاید ان کو اتنی ہی فرصت مل پائی ہوگی۔ ڈاکٹر ادیب رضوی صاحب نے ڈاکٹر نجیب نعمت اللہ صاحب کے بارے میں بتایا کہ یہ فرشتہ خصلت یعنی بے لوث انسان ہیں، یہ چاہیں تو روزانہ نوٹوں سے بوریاں بھر کر گھر لے جائیں۔ ظاہر ہے یہی کیفیت ڈاکٹر ادیب رضوی صاحب کی اپنی اور ان کے دیگر رفقا کی ہے۔ ہم ملک میں ایک طرف لوٹ مار، اغوا برائے تاوان، بھتا خوری اور سرکاری عمّال کی کرپشن کی ہوش رُبا داستانیں سنتے ہیں اور دوسری جانب معاشرے میں انسانی خدمت سے سرشار اس طرح کے لوگ بھی ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے قناعت اور

سیر چشمی کی دولت سے نوازا ہے۔ یہ مظاہر دیکھ کر امید قائم ہوتی ہے کہ:

"ایسی چنگاری بھی یا رب میری خاکستر میں تھی"

اسلام کی تعلیمات کو دو لفظوں میں سمیٹا جائے، تو وہ ہیں: "صبر اور شکر"۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے:

(۱): "مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے، اُن کے ہر معاملے میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اور یہ سعادت اللہ تعالیٰ نے صرف مومن کے حصے میں رکھی ہے۔ اگر اسے راحت وشادمانی ملے اور اس پر شکر کرے، تو اس کے لیے خیر ہے اور اگر اُسے تکلیف پہنچے اور وہ اس پر صبر کرے تو بھی اس کے لیے سراسر خیر ہے"۔ (مسلم:2999)

(۲) "جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ دنیا میں مصائب پر صابر وشاکر رہنے والوں کو بے پایاں اجر وانعام سے نوازے گا، تو دنیا میں عافیت وراحت میں رہنے والے یہ تمنا کریں گے: کاش! دنیا میں ان کے گوشت کو قینچیوں سے کاٹا گیا ہوتا"۔ (سنن ترمذی:2402)

جب ہم دکھی لوگوں کو اس طرح کی بشارتیں سناتے ہیں تو ہمارے آزاد خیال دوست طنز کرتے ہیں کہ یہ محض بہلاوے اور پھسلاوے ہیں، غالب نے کہا تھا: "دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"۔ بعض کے نزدیک ہم لوگوں کو یہ بشارتیں سنا سنا کر بے عملی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں، موہوم امیدوں پر زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن جنہیں وحی اور صاحبِ وحی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صدقِ قطعی پر ایمان وایقان ہے، اُن کے لیے یہ بشارتیں بڑا سہارا ہیں، ایک آس بندھتی ہے اور انسان دکھوں کو بھلا کر قدم آگے بڑھا لیتا ہے۔

ضیاء الرحمٰن سادہ اور بے ضرر سا انسان تھا، ہم نے بچپن سے لے کر وفات تک اسے کسی سے الجھتے نہیں دیکھا، کسی سے تُو تُو، میں میں کرتے نہیں دیکھا، کسی پر غیظ وغضب کے عالم میں نہیں دیکھا، اس سے آگے کے کسی مرحلے کا تو اس کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے میں نے اس کے سوئم کے پروگرام میں کہا: اس نے کسی کو دکھ نہیں پہنچایا، لہٰذا مجھے کامل یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اسے برزخ وآخرت کے تمام مراحل میں دکھوں سے

امان عطا فرمائے گا اور اپنی آغوشِ رحمت میں جگہ دے گا۔

ضیاء الرحمٰن نے پوری زندگی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کی، کبھی کوئی معمولی سی خواہش بھی ہوتی تو اپنی والدہ کے ذریعے اس کا اظہار کرتا۔ وہ اپنے آپ میں سمٹا ہوا انسان تھا، Reserve رہتا تھا، وفات سے ایک دن پہلے جب وہ بے چین تھا، وہ اشارہ کرتا تو ہم اسے سہارا دے کر بٹھاتے، لیکن پھر بیٹھنے کی ہمت نہ کر پاتا تو اسے لٹاتے۔ اس کے درد وکرب کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کہا: ''آپ رو رہے ہیں، آپ تو بہت بہادر ہیں، جس بات کو درست سمجھتے ہیں، اس پر ڈٹ جاتے ہیں''۔ اس نے میرے آنسو پونچھے، مجھے گلے لگایا، میرے سر، پیشانی اور رخسار کو بوسے دیے اور اپنے آپ پر ضبط کیا اور آنسو بھی نہ ٹپکائے، حالانکہ اندر سے اس کے وجود میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، شاعر نے کہا تھا:

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہور ترتیب موت کیا ہے، اِن اجزا کا پریشاں ہونا

جب وجود کے داخلی اعضا ایک ایک کر کے کام کرنا چھوڑ رہے ہوں، وجودِ انسانی کا طبعی نظام آہستہ آہستہ مفلوج و مُعطّل ہو رہا ہو تو اُس کرب کا ادراک وہی کر سکتا ہے، جو اس میں مبتلا ہوتا ہے، ہم اندازہ ہی کر سکتے ہیں۔ کبھی آنسو بہائے، مگر فریادیں نہیں کیں، ہر دکھ اور درد کو اپنے وجود ہی میں جذب کرتا رہا۔ آخری دنوں میں اپنی بیوی سے صرف اتنا کہا: ''محمد انیس الرحمٰن کو مارنا نہیں، نور العین کا خیال رکھنا''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد انسان کی کتنی بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ اسی لیے رحمۃ للعالمین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔

میں نے ضیاء الرحمٰن کی فاتحہ سوئم میں عرض کی کہ دُعا، دَوا، طبیب سب اسباب ہیں اور بیماری کے علاج کے لیے اسباب کو اختیار کرنا سنّتِ سید المرسلین ﷺ ہے۔ لیکن یہ اسباب، حیلے اور تدبیریں اسی وقت مؤثر ہوتی ہیں، جب ذاتِ مُسبّبُ الاسباب کی مشیت ہوتی ہے، اَمرِ ربّی ہوتا ہے، اس کا حکم ہر صورت میں نافذ ہو کر رہتا ہے، اس کی تقدیر اٹل ہے، اس کی قضا مُبرَم (Irrevocable, Final) ہے۔ البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ

مادّی اسباب غیر مؤثر ہوئیں تو ان پر جو مصارف آئے یا محنت صرف ہوئی، اکارت ہو جاتی ہے۔ البتہ دعا اللہ تعالیٰ کے پاس امانت رہتی ہے اور آخرت میں اجر کا باعث بنتی ہے۔

مجھے بیٹے کی وفات پر پورے ملک سے، قومی زندگی کے تمام طبقات سے، جن میں سیاسی رہنما، عمائدینِ حکومت، زعمائے ملت، بلاامتیاز تمام مکاتبِ فکر کے علمائے کرام، ملک بھر سے اہلِ مدارس، عوام، بیرونِ ملک ہندوستان، جاپان، کوریا، برطانیہ ویورپ، کینیڈا، امریکا، مشرق وسطیٰ الغرض بے شمار مقامات سے لاتعداد ہمدردی وتعزیت کے پیغامات، بیٹے کے لیے مغفرت اور بلندی درجات اور ہمارے لیے صبر وثبات کی جتنی دعائیں ملیں، خدا شاہد ہے کہ اس کے عُشرِ عشیر تک کا بھی میں تصور نہیں کر سکتا تھا۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ دینِ اسلام کی نسبت ہے، اُس کے حبیبِ مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وسیلۂ رحمت ہے، ورنہ: من آنم کہ من دانم، نہ کوئی علمی کمال اور نہ عمل کا کوئی قابلِ افتخار سرمایہ، وَرَع اور تقویٰ تو دور کی بات ہے۔ غالب نے کہا تھا:

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

غالب نے اپنا تجربہ بیان کیا کہ حاسدین کے حسد اور دشمنوں کی بدخواہی کا نشانہ بنے۔ لیکن الحمدللہ علیٰ احسانہ اللہ تعالیٰ کے دین کی برکت سے ہمارا تجربہ اس کے برعکس ثابت ہوا۔ دوستوں بلکہ ہر طبقے کے لوگوں نے ہمارے استحقاق سے حد درجے زائد محبت، ہمدردی اور مخلصانہ دعاؤں سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ سب مخلصین کو اپنے بے پایاں اجر وجزا سے نوازے۔

دین کے حاملین، علمائے دین اور دین کے طلبہ کی خدمت میں میری گزارش ہے کہ دین سے وفا کریں، دین آپ سے وفا کرے گا، دین کو مشن بنائیں، معاش نہ بنائیں، اللہ تعالیٰ آپ کو معاش سے بے نیاز کر دے گا۔ عزت ووقار کی تلاش میں اور شعبوں کا رخ نہ کریں، بس دین سے وابستہ رہیں، دین سے بڑھ کر کوئی منصب عزت افزا نہیں ہے، یہ مجھ بے مایہ اور گنہگار کا ذاتی تجربہ ہے۔

آخر میں اپنے تمام قارئین سے التجا ہے کہ وہ ضیاء الرحمٰن کی مغفرت اور آخرت میں

سرخ رو ہونے کے لیے دعا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شفاعتِ مقبولہ اور جنت الفردوس میں مقام عطا فرمائے۔ اس کا سات سالہ بیٹا محمد انیس الرحمٰن اور تین سالہ بیٹی نور العین ہے، دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ انہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے اور ان کی بہترین تعلیم وتربیت اور نگہداشت وپرداخت کے لیے غیب سے اسباب مقدر فرمائے۔ اس کی تین سالہ بیٹی نور العین اب بھی کہتی ہے: ''میرے بابا ہاسپیٹل میں ہیں''، پھر موبائل فون کان سے لگا کر کہتی ہے: ''ہیلو بابا! آپ کیسے ہیں؟''، دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔ آخر:

''دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں''

ایک بار اور عرض کرتا چلوں کہ ضیاء الرحمٰن کی سانس رک کر آرہی تھی، اسے آکسیجن لگائی گئی، ڈاکٹر ادیب رضوی صاحب اپنی ٹیم کے ہمراہ تشریف لائے اور کہا کہ ہم سب خدمت کے لیے موجود ہیں۔ میں نے عرض کی: اگر قضائے الٰہی سے اس کی سانسیں ختم ہیں، تو میں اللہ کی قضا پر راضی ہوں۔ میں نے بہت سے لوگوں کو شدید کرب میں Ventilator پر دیکھا ہے، میں اِسے اِس منظر میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس مرحلے پر، میں نے ہاسپیٹل میں اپنے ایک دو دوستوں کے ساتھ باجماعت نمازِ عشاء پڑھی اور فرض کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا کی:

''اے اللہ! اگر ضیاء الرحمٰن کی موت مقدر ہے، تو اُسے اِس کے لیے آسان کردے اور تیری عطا سے اس کی حیات مقدر ہے تو اسے صحت نصیب فرما''۔

پھر سنتیں اور وتر کی نماز پڑھی تو سلام پھیرتے ہی میرے ایک بھتیجے محمد جواد نے بتایا کہ بھائی جان چلے گئے۔ اس نے میرے چھوٹے بھائی سیف الرحمٰن کی گود میں جاں، جان آفریں کے سپرد کی، وہ سورۂ یٰسین پڑھتے رہے۔ انہوں نے ایک ماہ تک ضیاء الرحمٰن کی بہت خدمت کی، اللہ تعالیٰ انہیں ماجور فرمائے، آمین

یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ میرے برادرِ اکبر انجینئر قاضی جمیل الرحمٰن، برادرانِ خورد ڈاکٹر قاضی محبوب الرحمٰن اور قاضی سیف الرحمٰن اور خاندان کے تمام افراد نے حوصلہ عطا کیا اور ہر ممکن مدد کی۔ اللہ تعالیٰ سب کو اجرِ کثیر عطا فرمائے اور اپنی اپنی اولاد کی علمی اور عملی، دینی اور دنیوی ترقیاں، شادمانیاں اور کامرانیاں نصیب فرمائے۔ آمین 30 مئی 2014ء